زندگی کے ساتھی ساتھ

ماہنامہ

چہارسو

راولپنڈی

''ستاروں پہ کمند''

ابوالحسن نغمی صاحب کے نامِ نامی سے پاکستان کی نوجوان نسل اُس طور واقف نہ ہے جس طور نغمی صاحب کی علمی' ادبی اور قومی خدمات کا حق بنتا ہے۔ نغمی صاحب کی شخصیت کئی جہات کو محیط ہے۔ اوّل پُر جوش نوجوان کے طور پر تحریک پاکستان کے کارکن' دوئم صاحبِ ذوق' صاحبِ نظر' صاحبِ علم اور صاحبِ مطالعہ قلم کار' صدا کار محقق' ادیب' شاعر' کالم اور ڈرامہ نگار۔

ابوالحسن نغمی صاحب 1972 میں وائس آف امریکہ میں بطور براڈ کاسٹر ملازمت کے سلسلے میں امریکہ تشریف لائے تو یہاں پاکستانی سفارت خانہ کے عملے' ورلڈ بنک کے تعاون سے تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کے علاوہ اردو زبان سے آشنا لوگ دور دور تک دستیاب نہ تھے۔ نغمی صاحب اور اُن کی اہلیہ محترمہ کو اس حوالے سے بڑی تشویش تھی۔ جُوں جُوں پاکستانیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا وُوں وُوں نغمی صاحب اور اُن کی رفقا کی کوششوں سے اردو مشاعرہ رواج پاتا گیا۔ 1974 میں اِن مشاعروں کی باقاعدہ بنیاد علی گڑھ علمنائی ایسوسی ایشن کے ڈاکٹر عبداللہ صاحب نے باقاعدہ طور پر رکھی۔

پاکستانی تارکینِ وطن کی تعداد بڑھنے کے ساتھ مشاعروں کی تعداد اور رونق میں بھی اضافہ ہونے لگا جس سے پاکستانیوں کی دوسری' تیسری نسل اردو زبان میں دلچسپی لینے لگی۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ وُڈبرج جیسے دور اُفتادہ شہر میں اردو سے دلچسپی کے حامل نوجوانوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ گئی۔ دقت مگر یہ تھی کہ یہ نوجوان مشاعروں سے بدکتے تھے کیونکہ شاعری معیاری اور بامقصد نہیں ہو رہی تھی۔ دوسرے یہ کہ اردو زبان سے تمام تر دلچسپی کے باوجود یہ نوجوان اردو لکھنے' پڑھنے پر قادر نہ تھے۔

29 مارچ 2008 کو نغمی صاحب اور اُن کی بیگم یاسمین نغمی صاحبہ نے نوجوانوں کی اردو زبان سے دلچسپی کو باقاعدہ سمت دینے کی غرض سے ''انجمن ادبِ اردو'' وڈبرج کی بنیاد رکھی۔ اور اُن تمام نوجوانوں کو جو اردو لکھنے پڑھنے پر دسترس نہ رکھتے ہوئے اپنی زبان میں دلچسپی و اشتیاق رکھتے تھے کا حل یہ نکالا کہ تمام نوجوانوں کو یہ ترغیب دی کہ وہ اپنے مزاج اور طبع کے مطابق رومن حروف میں اردو سے متعلق کسی بھی موضوع مثلاً پاکستان کا سفر نامہ' آپ بیتی' وطن کے حالات اور جنریشن گیپ وغیرہ پر مضامین لکھیں اور ''انجمن ادبِ اردو'' کے ماہانہ اجلاس میں اُن پر بحث و مباحثہ کریں۔ چنانچہ ''انجمن ادبِ اردو'' کا اجلاس ہر ماہ کے آخری اتوار کو باقاعدگی کے ساتھ ہوتا ہے جس میں آٹھ برس کے بچّے سے لے کر اسّی برس کے بزرگ ایک ساتھ شریک ہوتے اور باہمی احترام کے ساتھ صحت مندانہ علمی' ادبی روایات کو فروغ دیتے ہیں۔

''انجمن ادبِ اردو'' کی صحت مند روایات کی حوصلہ افزائی کے لئے امریکہ کے دور دراز شہروں سے نامور ادیب' شاعر اور سکالر مثلاً ڈاکٹر معظم صدیقی' ڈاکٹر ستیہ پال آنند' ڈاکٹر سید تقی عابدی' محترمہ شکیلہ رفیق اور ڈاکٹر فیروز عالم جیسے نامور اہلِ قلم انجمن کے اجلاسوں میں شرکت کر لئے ذاتی خرچ پر تشریف لاتے اور نوجوانوں کی حوصلہ افزائی فرماتے ہیں۔ اگر آپ امریکہ یا امریکہ سے باہر رہتے ہوئے کسی طور ''انجمن ادبِ اردو'' کی رہنمائی فرمانے کے آرزومند ہیں تو جناب ابوالحسن نغمی صاحب سے ذیل کے پتہ پر رابطہ ممکن ہے:

MR: ABUL HASSAN NAGHMI, 2804, WHITE BIRCH COURT, WOOD BRIDGE V.A.

22192- U.S.A. Ph: 001-703-494-4293

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۱۹، شمارہ: نومبر، دسمبر ۲۰۱۰ء

چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو

مجلسِ مشاورت

قارئین چہارسُو

زرِسالانہ

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

بانی مدیرِاعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیر مسؤل

گلزار جاوید

معاون مدیران

بینا جاوید

فاری شا

محمد انعام الحق

"میرے مولا"

یہ حادثہ ہے یا
اتّفاق ہے
ظلمتوں میں گھری
ارضِ پاک ہے
کہنے کو دے رہے ہیں
الزام اوروں کے سر
قصور اپنا
یہ اپنوں کی گھات ہے

یہ اپنے بظاہر
رُوپ دھارے ہوئے ہیں
نقاب چہروں پہ کب سے
چڑھائے ہوئے ہیں
رنگ اِن کا ہے کُچھ
کُچھ چُرایا ہوا ہے
سرِ دار ہم کو
چڑھایا ہوا ہے

اِن اپنوں سے
ہم کو
بچا میرے مولا
اِن اپنوں کا
تختہ
دھڑن کردے مولا!!!

۔ بیدل بیوطنی ۔

چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو چہارسُو

رابطہ: 537، ویسٹریج-III، راولپنڈی۔ فون: 92-51-5462495 فیکس: 5490181 ای۔میل: chaharsu@gmail.com

پرنٹر: فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازار راولپنڈی

متاعِ چہارسو

سرِ ورق، پسِ ورق--------شعیب حیدر زیدی
تزئین--------عظمیٰ رشید
کمپوزنگ--------تنویر الحق
قرطاسِ اعزاز--------رخشندہ فاطمہ ۳
آرتی--------رتن سنگھ ۴
بابا فرید گنج شکر--------رتن سنگھ ۵
لافانی کہانی--------رتن سنگھ ۷
براہِ راست--------گلزار جاوید ۹
اپنے دور کی تاریخ--------عصمت چغتائی ۱۴
اعتقاد بھی اعتماد بھی--------محمد حسن ۱۵
گیان دھیان کا مسافر--------قمر رئیس ۱۶
سنگ کے سینے میں پھول--------شارب ردولوی ۲۰
زمانہ کی نئی کروٹ--------محمد علی صدیقی ۲۴
افسانے کا خلیل جبران--------رحمان اختر ۲۶
حقیقت پسند افسانہ نگار--------صبا اکرام ۲۸
زندگی کے حسین اتفاقات--------رینو بہل ۳۰
سیالکوٹ کا لاڈلا--------رتن سنگھ ۳۲
سنگھاسن بتیسی--------رتن سنگھ ۳۶
انگاں دے بوٹے--------رتن سنگھ ۳۷

افسانے

تعبیر خوابوں کی--------نند کشور وکرم ۴۱
بلیک ہول--------عذرا اصغر ۴۳
بالغ عورت--------شکیلہ رفیق ۴۵
عجیب حادثہ ہے یہ--------یوگیندر بہل ۴۶
الٹ بلٹ--------طاہرہ اقبال ۴۸

وردِ زباں

صابر عظیم آبادی، خورشید انور رضوی ۵۵

چاند سا چہرہ

مشکور حسین یاد، قمر بھوپالی، امین راحت چغتائی، جمیل یوسف، ملک زادہ منظور، سرور انبالوی، شباب للت، آصف ثاقب، خالد حمید، صابر آفاقی، غلام مرتضیٰ، غالب عرفان، مہندر پرتاپ، تشنہ بریلوی، صفوت علی، پروین کمار، نیاز جیراجپوری، ضیا شبنمی، سریواستو رند، سعید نقوی۔ ۵۶

افسانے

قسمت کا فیصلہ--------کرشن نندہ ۶۶
دوسرا ہار--------حمید قیصر ۶۸
بارودی جیکٹ--------فرخندہ شمیم ۷۰
جھوٹن--------عمران مشتاق ۷۲
عید ملن پارٹی--------گلزار جاوید ۷۳

خوشبو سے رشتہ

ملک زادہ جاوید، عظمیٰ صدیقی، عارف شفیق، سہیل اختر، کرشن پرویز، شگفتہ نازلی، ندیم ہاشمی، اسد بیگ، عدیل زیدی، جواز جعفری، مسکین احمد منصور، رؤف خیر، احسان احمد شیخ، تصور اقبال، عرش صہبائی۔ ۷۹

داستانِ حیات

ہوا کے دوش پر--------فیروز عالم ۸۴

نشانِ راہ

معنی اور تناظر--------ڈاکٹر وزیر آغا ۹۰

آئینۂ فن

دوامِ ابد--------انور سدید ۹۳

لہو کی بُو

شہریار، امجد اسلام امجد، مامون ایمن، حفیظ انجم، احمد علی، یونس صابر، حسن عسکری، مسکین احمد منصور، آصف رضا، غالب عرفان، شگفتہ نازلی، فیصل عظیم، علی کمیل قزلباش، جہانگیر اشرف، احمد ظہور، آنند بخشی، ایم۔ ایل شرما۔ ۹۴

ڈرامہ

گلنار--------کوثر بھوپالی ۱۰۵

ایک صدی کا قصہ

دادا صاحب پھالکے--------دیپک کنول ۱۱۱

ورثہ

درۂ خیبر--------حفیظ جالندھری ۱۱۵

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین--------وقار جاوید ۱۱۶

☆

○○○

قرطاسِ اعزاز

رتن سنگھ

کے نام

نام: رتن سنگھ

والد: سردار پرتاپ سنگھ

والدہ: کرتارکور

پیدائش: ۱۵نومبر۱۹۲۷قصبہ'داؤد'تحصیل نارووال' ضلع سیالکوٹ۔

تعلیم: مڈل اسکول' داؤد تحصیل نارووال۔میٹرک گورنمنٹ ہائی اسکول ڈیرہ بابانانک ضلع گورداس پور۱۹۴۵ء
انٹر۔پنجاب ایجوکیشن بورڈ۱۹۵۸ء۔بی اے۔لکھنؤ یونیورسٹی ۱۹۶۰ء

ملازمت: ریلوے میں بحیثیت کلرک ۱۹۴۶ء تا۱۹۶۲ء
آل انڈیا ریڈیو۱۹۶۲ء تا۱۹۸۵ء۔ریٹائرڈ اسٹیشن ڈائریکٹر سری نگر' کشمیر

اولاد: سنیتارانی کنچن کور
پرم جیت سنگھ(چائلد ویلفیر آفیسر'لندن)۔راجندر سنگھ(ڈائریکٹر اسپورٹس اتھارٹی آف انڈیا)

تصانیف: ۱۔پہلی آواز ۲۔پنجرے کا آدمی ۳۔دربدری(سوانحی ناول) ۴۔مانک موتی ۵۔صبح کی پری
(بچوں کے لیے) ناولٹ ۶۔سفید خون(نانک سنگھ کے پنجابی ناول کا ترجمہ) ۷۔''شلوک شیخ
فرید' بابا فرید گنج شکر کے شلوکوں کا ترجمہ ۸۔روپ انوپ(دوہے)زیرطبع ۹۔کاٹھ کا گھوڑا
(کہانیوں کا مجموعہ) ۱۰۔کہانی کاروں کی کہانیاں ۱۱۔احمد جمال پاشا ۱۲۔گورو گرنتھ کا اردو ترجمہ
۱۳۔سنگھاسن بتیسی(ڈرامے)روسی زبان میں اور امریکہ میں کہانیاں ترجمہ ہو کر چھپی ہیں۔ہندوستان کی
پنجابی' مراٹھی' گجراتی' ہندی' تیلگو زبانوں میں کہانیاں ترجمہ ہوئی ہیں۔
گجرات ایجوکیشن بورڈ کے انٹرمیڈیٹ کے کورس میں کہانی ''ہزاروں سال لمبی رات'' شامل ہے۔
بی اے اور بی اے آنرز کے کورس میں کہانی شامل رہی ہے۔
جبلپور یونیورسٹی میں پی ایچ ڈی کے لیے ایک ریسرچ اسکالر نے اپنا مقالہ ''رتن سنگھ فن اور شخصیت'' پیش کیا ہے۔

ایڈریس: A-402 Beta I Greater Noida U.P. India

○○○

روحی فاطمہ(دہلی' بھارت)

آرتی

(دھناسری محلہ پہلا)

بابا گرونانک

اِک اونکار۔ستگور پرساد:۔گگن مَے تھال، روِ چنہ دیپک بنے، تارِکا منڈل جنک موتی دُھوپ کلیان لَو، پوَن چوَرو کرے، سگل بن روئے پُھولنت جوتی۔(۱) کیسی آرتی ہوئے بھوَ کنڈنا تیری آرتی۔انہتا سبد واجنت بھیدی (۱) رہاؤ:۔ سہس توَ نین، نن نین ہے توہے، گو سہس مُورت ننا ایک تو ہی سہس پد، بمل نن، ایک پد گندھ بن سہس توَ گندھ اِوچلت موہی۔(۲) سبھ مَہہ جوت، جوت ہے سوئے، تِس کے چانن سبھ کہ چانن ہوئے۔گور ساکھی جوت پرگٹ ہوئے۔جوتِس بھاوے سو آرتی ہوئے۔(۳) ہر چرن کمل مکرنہ لوبھت منوان دِنوں موہے آہی پیاسا۔ کِرپا جل دیہہ نانک سارنگ کو ہوئے جاتے تیرے نام ورسا۔

۴۔۱۔۷۔۹............صفحہ ۶۶۳

ترجمہ: رتن سنگھ

سارا آسمان ایک تھال ہے، جس میں سورج اور چاند، دِیئوں کی طرح رکھے ہیں۔اس تھال میں ستاروں کی کہکشاں جیسے موتیوں کی طرح رکھی ہے۔پہاڑ کی طرف سے آنے والی ہوا دھوپ کی طرح مہکتی ہوئی چنور کر رہی ہے۔تمام بنپتِ پھُول بن کر اس آرتی کی تھالی میں سجی ہے(۱) اے موت کا ڈر دُور کرنے والے پرماتما، دیکھ تمہاری کیسی آرتی اُتاری جارہی ہے۔کائنات کی تمام آوازیں اس آرتی میں نگارے کی طرح بج رہی ہیں۔(۱) اے پرماتما تمہارا کوئی جسم نہیں ہے، اس لئے آنکھیں بھی نہیں ہیں، لیکن پھر بھی تم ہزاروں آنکھوں سے دیکھ رہے ہو۔تمہاری کوئی شکل نہیں ہے، مگر پھر بھی تمہارے ہزاروں روپ ہیں۔تمہارے کوئی پیر نہ ہوتے ہوئے بھی تمہارے ہزاروں پیر ہیں۔تمہاری کوئی ناک نہیں، پھر بھی ہزاروں ناک ہیں تمہارے۔تمہارے اِنہی عجوبوں نے مجھے حیران کر رکھا ہے۔(۲) اے پرماتما سب جانداروں کے اندر ایک تمہاری ہی موت کا رونا ہے۔اُس کی روشنی کی وجہ سے ہی سب کے اندر یہ روشنی ہے۔لیکن اس روشنی کا احساس گورو کی مدد سے ہی ہو سکتا ہے۔اے پرماتما تیری راہ میں چلنا ہی سچی آرتی ہے۔(۳) اے پرماتما میرے من میں تمہارے کنول سے چرنوں کا رس پانے کی طلب ہے۔ہر روز مجھے اسی رس کی پیاس لگی رہتی ہے۔اے پرماتما نانک پپیہے کی طرح بے کل ہے۔تو مہربانی کر۔یہ امرت بخش۔تیرا نام سدا میرے دل میں بسا رہے۔

بابا فرید شکر گنج

رتن سنگھ

بابا فرید شکر گنج کا پورا نام شیخ فرید الدین مسعود ہے۔ان کی پیدائش ۱۱۷۳ء میں رمضان المبارک کے مہینے کی پہلی تاریخ کو ضلع ملتان (پاکستان) کے ایک گاؤں کھوتوال میں ہوئی۔آپ کے والد کا نام جناب جمال الدین سلیمان تھا اور آپ کے دادا تھے جناب شیخ شعیب جو کابل کے بادشاہ فرخ شاہ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ۱۱۲۵ء میں پنجاب میں آکر بس گئے تھے،

بابا شیخ فرید کی زندگی پر ان کی والدہ محترمہ بیگم کلثوم کا کافی اثر تھا جو ایک خدا پرست اور خدا ترس خاتون تھیں۔والدہ کی نگرانی میں انھوں نے بچپن میں ہی قرآن شریف حفظ کرلیا تھا اور پانچوں وقت باقاعدگی سے نماز ادا کرتے تھے۔

بابا فرید اپنے گاؤں میں ہی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے ملتان تشریف لے گئے۔وہیں آپ خواجہ قطب الدین بختیار کا کی کے مرید ہوئے۔

اس طرح ایک طرف تو روحانی اعتبار سے خواجہ قطب الدین بختیار کا کی کے مرید ہونے کی حیثیت سے آپ کا شجرہ حضرت محمدﷺ سے جاملتا ہے تو دوسری طرف دنیاوی اعتبار سے کابل کے بادشاہوں سے جڑا ہوا ان کے خاندان کا سلسلہ حضرت عمرؓ تک جا پہنچتا ہے۔

حج سے واپسی پر اپنے پیرو مرشد حضرت بختیار کا کی کی ہدایت پر تقریباً بیس سال تک ہانسی ضلع حصار میں مقیم رہ کر زہد وفکر اور خدا کی عبادت میں محو رہے اور ان کے علم کے نور سے ایک عالم فیضیاب ہوتا رہا۔

اپنے پیرو مرشد کے انتقال کے بعد جب چشتی سلسلے کی صوفیانہ روشنی کو دنیا تک پھیلانے کی خدمت بابا فرید کے سپرد ہوئی تو آپ ہانسی سے منتقل ہو کر اپنے گاؤں کھوتوال تشریف لے آئے جہاں کچھ دیر قیام کرنے کے بعد آپ مستقل طور پر قریب ہی اجودھن نام گاؤں میں چلے گئے جہاں وہ آخر تک مقیم رہے۔

بابا فرید کے ان شلوکوں میں کچھ ایسے شلوک بھی شامل ہیں جو سکھ گوروصاحبان نے بابا فرید کے شلوکوں کی مزید وضاحت کرتے ہوئے بابا فرید کے ہی رنگ میں کہے ہیں۔

گوروگرنتھ میں درج بابا فرید کے کلام کا ترجمہ کرنے کی خدمت میں نے بڑی عاجزی سے کی ہے۔ان کے شلوکوں میں سمندر کی سی گہرائی بھی ہے اور آسمان کی سی بلندی بھی سمندر کی گہرائی۔ جہاں غوطہ لگانے سے سچے موتی وجواہرات ملتے ہیں اور آسمان کی بلندی جہاں ان کے افکار ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں۔

میں اس قابل نہیں ہوں کہ اس گہرائی اور اس بلندی کو چھو سکتا۔میری فکر تو اس کی ایک ہلکی سی جھلک ہی پیش کرسکی ہے۔

خدا کرے بابا فرید کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ کو ان کے افکار کے سچے موتی اور چمکتے ہوئے ستارے مل جائیں۔

جِت دِہاڑے دھن وری ساہے لیکھ لکھائے
ملک جے کنّی سُنی دامُنہہ دیکھالے آئے
جند نمانی کدیئے ہڈّاں کو کڑکائے
ساہے لکھے نہ چلنی جندو کو سمجھائے
جند ووہٹی مرن ورَلے جاسی پرنائے
آپن ہتھی جو لگے ، کے گل لگے دھائے
والوںکی پُر سلات کنی نہ سُنی آئے
فریدا کڑی پوندیئے کھڑا نہ آپ مہائے

جس دن موت اس زندگی کو بیاہنے کے لئے آئے گی، وہ دن پہلے ہی طے ہو چکا ہے، ملک الموت جس کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے وہ آنکھوں کے سامنے نمودار ہوگا، اور جسم کے پنجر کو توڑ کر معصوم روح کو نکال کرلے جائے گا، اے انسان تو یہ اچھی طرح ذہن نشین کرلے کہ موت کا وہ دن ٹالنے سے ٹالا نہیں جا سکتا۔موت اُس دن ہر صورت زندگی کو بیاہ کرلے جائے گی، روح کے چلے جانے کے بعد یہ خاکی جسم کس کے گلے لگ کر روئے گا؟ دوزخ میں بنے ہوئے خطرناک اور تنگ صراط کے پُل پر جو چیخ پکار ہو رہی ہے'اے فرید یہ تجھے تنبیہہ کر رہی ہے کہ اس زندگی کو ضائع نہ کرو۔

فریدا درویسی گاکھڑی چلاں دنیا بھت
نبھ اٹھائی پوٹلی کتھے ونجاں گھت

اے فرید۔خدا کے گھر کا فقیر ہونا بڑا مشکل کام ہے۔ایک میں ہوں کہ فقیر ہونے کے باوجود اس دنیا سے رشتہ نہیں توڑ پایا۔اب اللہ کا فقیر بنا ہوں تو فقیری کے ذمے داریوں کے بوجھ کو کہاں پھینک سکتا ہوں۔جب اللہ کے نام کی فقیری کا بھار اپنے سر اُٹھایا ہے تو اس کی لاج رکھنی ہی ہوگی۔

کچھ نہ بجھے ، کچھ نہ سجھے، دنیا گجھی بھا ہے
سائیں میرے چنگا کیتا ناہی تا ہنجھی وجھاں آئے

یہ دنیا اک ایسی پوشیدہ آگ ہے جس میں دنیا سے لَو لگانے والوں کو یہ احساس ہی نہیں ہو پاتا کہ وہ ہر لمحے آگ میں جل رہے ہیں، میں اپنے خدا کا مشکور ہوں کہ مجھے اپنی بندگی میں محو کردیا اور اس طرح میں اس آگ میں جلنے سے بچ گیا۔

فریدا جے جاناں تل تھوڑے سنبھل بک بھری
جے جاناں سوہہ نڈھڑا تاں تھوڑا مان کری

اے فرید اگر میں یہ جانتا کہ تل تھوڑے ہیں تو سنبھل کر اپنے ہاتھوں میں بھرتا، تاکہ گرنے نہ پائیں۔یعنی اگر یہ پتہ ہوتا کہ سانس تھوڑے ہیں گنتی کے

ہیں تو انھیں ضائع نہ کردیتا، اسی طرح اگر یہ جانتا کہ شوہر (اللہ) بے پرواہ ہے تو میں اپنی جوانی پر زیادہ فخر نہ کرنا، یعنی اللہ کی پرستش کرتے ہوئے اپنی عبادت پر فخر نہ کرتا۔

جے جان لڑ چھجناں پیڈھی پائیں گنڈھ
تے جیوڈ میں نا ہے کہ سب جگ ڈِھا ہنڈ

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ اللہ سے شادی رچائے ہوئے اس کے پلّو سے جو گانٹھ باندھی تھی وہ دنیاوی کمزوریوں کی وجہ سے ڈھیلی پڑسکتی ہے تو میں اُس وقت بڑی مضبوط گانٹھ باندھتا میں نے ساری دنیا گھوم کر دیکھ لی ہے میرا مالک ہی سب سے اچھا ہے۔

فریدا جے تُوں عقل لطیف تاں کالے لکھ نہ لیکھ
آپنڑے گِروان میں سرنیواں کر دیکھ

اے فرید اگر تم عقلِ لطیف رکھتے ہو تو برے کام نہ کرو۔ اور سر نیچا کر کے اپنے گریبان میں جھانکو اور اپنے اعمال کو دیکھو۔

فریدا جو تیں مارن مُکیاں تِناں نہ ماریں گُھم
آپنڑے گھر جائیے پیر تِناں دے چُم

اے فرید جو لوگ تمہیں مکے ماریں تم پلٹ کر اُنھیں مکہ نہ مارو بلکہ اپنے یعنی خدا کے گھر جانے کی تمنا دل میں رکھتے ہو تو مارنے والوں سے بھی محبت کرو۔ ان کے پاؤں چُومو۔

فریدا جاں تو کھٹن ویل' تاں تو رتا دُنی سیو
مرگ سوائی نیہہ جاں بھریا تاں لدّیا

اے فرید۔ جب خدا کا نام لینے کا وقت تھا۔ جب نیک اعمال کرنے کا وقت تھا، اس وقت تو تُو دنیا کے جھوٹے رنگوں میں رنگ کر رنگ رلیاں مناتا رہا۔ بڑھاپے تک پہنچتے پہنچتے روح گناہوں سے لبریز ہوگئی تو موت کے سفر پر چلنا پڑ گیا اور نیک عمل کرنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔

دیکھ فریدا جو تھیا داڑھی ہوئی بھُور
اگونیڑا آیا پچھار ہیا دُور

اے فرید غور سے دیکھ کہ کیا ہوگیا ہے، داڑھی سفید ہوگئی ہے زندگی بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ حشر کا دن نزدیک آرہا ہے۔ اس لئے نیک کام کر۔

دیکھ فریدا جے تھیا سکر ہوئی وِس
سائیں باجھو آپنے ویدن کہیے کِس

اے فرید۔ دیکھو یہ کیسا سانحہ ہوگیا۔ زندگی کی جھوٹی مسرتیں تمہارے جسم میں زہر کی طرح تحلیل ہوگئی ہیں۔ اب اپنے درد کی کہانی اپنے اللہ کے سوا اور کس سے کہو گے۔

فریدا اکھی دیکھ پتینیاں سُن سُن رینے کن
ساکھ پکندیاں آیاں ہور کریندی ون

اے فرید۔ دنیا کے جھوٹے نظارے دیکھتے دیکھتے تمہاری آنکھیں کمزور پڑ گئیں، کان بہرے ہوگئے، چہرے پر جھریوں کا جال بچھ گیا، اور تمہاری شکل اور کی اور ہوگئی۔

فریدا کالی جنی نہ راویا دھولی راوے کوئے
کرسائیں سیوں پریڑی رنگ نویلا ہوئے

اے فرید۔ جو آدمی کالے بالوں کے رہتے ہوئے اللہ کو یاد نہیں کرتا وہ سفید بال ہوجانے پر کیا کرے گا؟ اس لئے تو ابھی سے اللہ سے پیار کرتا کہ تم اس کے انوکھے رنگ میں رنگ جاؤ۔

فریدا کالی دھولی سدا ہے جیکو چت کرے
آپنا لایا پرم نہ لگئی جے لوچے سب کوے
ایہہ پرم پیالہ خصم کا جھے بھاوے تے دے

اس سے پہلے والے شلوک کو سُن کو گورو امرداس نے فرمایا............
کہ اے فرید اگر کوئی دل سے چاہے تو جوانی میں بھی وہ اپنے مالک کو پاسکتا ہے۔ لیکن اگر ہر آدمی چاہے کہ وہ اپنے دل میں اس کی یاد کا بُوٹا لگالے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ سچی محبت کا پیالہ اسی کو مل سکتا ہے جس پر مالک مہربان ہو۔

فریدا جن لوئین جگ موہیا سے لوئین میں ڈِٹھ
کجل ریکھ نہ سہندیاں سے پنکھی سوئے بہٹھ

اے فرید۔ جن خوبصورت آنکھوں نے کبھی ساری دنیا کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا، میں نے ان آنکھوں کو دیکھا ہے۔ جن آنکھوں کو کبھی کاجل کی لکیر بھی بھاری لگتی تھی۔ اب ان میں پنچھی بچے دے رہے ہیں۔

فریدا کوکیندیاں چانگیدیاں متّی دیندیا نت
جو شیطان و نجھایا سے کِت پھیرے چت

اے فرید۔ تو تو اونچی آواز میں کوک کر عقل کی بات بتا رہا ہے لیکن جسے شیطان نے غلط راستے پر ڈال دیا ہے وہ دل صحیح راستے پر کب آتا ہے۔

فریدا تھِیو پواہی دبھ
جے سائیں لوڑے سب
اِک چھجے بیا لڑایئے
تاں سائیں دَے در واڑیئے

اے فرید۔ اگر تم ہر جگہ موجود اللہ کو حاصل کرنا چاہتے ہو تو اس کے راستے پر اس گھاس کی طرح بچھ جاؤ۔ جسے سب لوگ اپنے پاؤں تلے روندتے چلتے ہیں۔ اپنی ہستی کو مٹانے کے بعد ہی اس مالک کے گھر کے دروازے کے اندر داخل ہوا جاسکتا ہے۔

فریدا خاک نہ نِندیئے خاکو جیڈ نہ کوئے
جیو دیا پیراں تلے مویا اوپر ہوئے

اے فرید۔ خاک کو بُرا نہ کہو۔ خاک سے بڑی کوئی چیز نہیں ہوسکتی جو زندگی میں پاؤں کے نیچے ہوتی ہے۔ لیکن مرنے کے بعد وجود کے اوپر آجاتی ہے۔

''ایک لافانی کہانی''

رتن سنگھ

مان لیا راجہ جی ہم نے آپ کے اونچے ٹھاٹ
آپ کی پرجا کے در پہ کیوں لٹکے ہیں ٹاٹ

اس راجہ کی آنکھیں تو اپنے ٹھاٹ باٹھ کی چکاچوند میں چندھیا گئی تھیں۔ اس لئے اسے اپنی پرجا کے گھروں کے دروازوں پر لٹکے ہوئے ٹاٹ دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اور جب ٹاٹ ہی نہ دکھائی دیتے ہوں تو ان کے پیچھے بھوکی ننگی زندگی کے چہرے کو وہ کیسے دیکھ سکتا تھا۔

لیکن مسعود مفتی صاحب کا معاملہ دوسرا ہے۔ وہ کہانی کار ہیں۔ سچے کہانی کار کے سینے میں ایک دردمند دل دھڑکتا ہے۔ اس لئے زندگی نے جب انہیں اونچی مسند پر بٹھایا تو.....

یہاں مجھے حضرت عمر کے خلیفہ بننے کے بعد کی حکایت یاد آرہی ہے۔

اُن کے وزیر نے پوچھا۔ حضور۔ خلیفہ کی حیثیت سے جلوہ افروز ہونے کے بعد آپ کی تنخواہ کیا مقرر کی جائے۔

حضور نے فرمایا ''پہلے یہ بتاؤ کہ میری حکومت میں سب سے غریب آدمی کی آمدن کیا ہے؟''

وزیر نے جواب دیا ''جی چار دینار فی ماہ''۔

''تو میری تنخواہ بھی چار دینار مقرر کردی جائے''۔

''حضور آپ بادشاہ وقت ہیں۔ اتنے میں آپ کا گزارا کیسے ہوگا؟''

''وہ تو مجھے معلوم ہے کہ نہیں ہوگا۔ لیکن اس طرح مجھے غریبوں کی تکلیفوں کا پورا پورا احساس ہوگا' انہیں دور کرنا کسی بھی خلیفہ کا فرض اولیں ہونا چاہیے''

مسعود مفتی بھی اونچی مسند پر بیٹھ کر اپنے ملک کے غریب عوام کی تنگ دستیوں کو نہیں بھولے انہیں ان کے دکھ درد کا پورا پورا احساس رہا۔

اُن کی کہانی سالگرہ اسی احساس کی شدت کو بیان کررہی ہے۔

سالگرہ کا موقعہ بڑے آدمی کے لیے خوشی کا دن ہے۔ کیک' مٹھائیاں کھانے کا دن ہے' مبارکباد بدھائیاں دینے دلانے کا دن ہے۔ غریب کو تو پتہ بھی نہیں چلا کہ اس کی عمر کا یہ دن کب آتا ہے اور کب گزر جاتا ہے۔ اول تو اسے یاد بھی نہیں ہوتا۔ یاد بھی ہو تو اس کے لئے یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔

مسعود مفتی بھی شعوری طور پر اس دن کو اہمیت نہیں دینا چاہتے۔ اسے وہ بڑی خاموشی سے گزارنا چاہتے ہیں۔ اس طرح کہ ہر دن صرف ان کا نجی دن ہو۔ صرف وہ ہوں اور اُن کی ذات۔

لیکن ایک کہانی کار جب اپنی ذات میں گم ہوتا ہے۔

تو وہ اپنے آپ میں گم نہیں ہوجاتا۔

ایسے میں اُن کے اندر تخلیق کے سوتے جاگتے ہیں اور اس کے ارد گرد ایک کائنات تخلیق ہوجاتی ہے۔

کہانی کار محور بن جاتا ہے۔

اور اُس کے گرد تمام کائنات متوّر ہورہی ہوتی ہے۔

ایسے میں وہ دوسروں کے دُکھوں کو اپنے اوپر اوڑھتا ہے۔

یہیں سے کہانی کا سفر شروع ہوتا ہے۔

مسعود مفتی اس کہانی کا آغاز نہایت خوشنما ماحول سے کرتے ہیں۔ قاری کے سامنے وہ دو مناظر پیش کرتے ہیں۔ پہلے کا تعلق ترقی یافتہ ملک جاپان کے ماحول سے ہے۔ دوسرے میں انڈونیشیا کے جزیرہ مالی کے ایک پانچ ستارہ ہوٹل کے گرد گھومتی اُن لوگوں کی زندگی ہے جو وہاں سیلانی کے طور پر آتے ہیں اور ہر لمحے کو خوبصورت بنانے کے فراق میں ہیں۔

کہانی کے پہلے حصے میں ہم نشی سوٹو نام کے ایک پنسٹھ سالہ آدمی سے ملتے ہیں جو اکیلے دم پر ''ادارہ خدمتِ خلق'' چلا رہا ہے۔ اس ادارے کی کل کائنات گھر کے باہری حصے میں ایک چھوٹا سا کمرا ہے جس میں چٹائیوں پر چند گدیاں رکھی ہیں' آلتی پالتی مار کر بیٹھنے کے لیے اس شخص نے پچھلے بیس سالوں میں سات ہزار پانچ سو چالیس لوگوں کی مدد کی ہے۔ وہ خود بتاتا ہے:

''طبی امداد' قانونی امداد' تعلیمی امداد' شادیاں بھی کرائی ہیں' شادیاں ٹوٹنے سے بچائی ہیں' اور اس کے لیے کوئی زیادہ خرچ نہیں کرنا پڑا۔ وہ بتاتا ہے:

''جو تھوڑا بہت خرچہ کاغذ' فائلوں' خط و کتابت اور فون وغیرہ پر ہوتا ہے وہ میں اپنی جیب سے ادا کردیتا ہوں''۔

یہ سب کام وہ مختلف انجمنوں کے تعاون سے کرتا چلا آرہا ہے۔ صرف ایک آدمی کی دیانتدارانہ کوشش نے ہزاروں لوگوں کی زندگی میں کہیں علم کی روشنی بھردی' کہیں مالی حالت سنور گئی' کہیں بیمار کو صحت مل گئی اور زندگی کا چہرہ نکھرتا چلا گیا۔

یہاں یہ بات خاص طور پر ذہن نشین کرنے والی ہے کہ یہ نشی سوٹو خدا کی پرستش کے لئے مندر یا گرجا میں نہیں جاتا۔ وہ ایک طرح سے ضرورت مند انسانوں کی عبادت کررہا ہے۔ وہ کہتا ہے ''مجھے پتہ نہیں کہ خدا خوش ہوا کہ نہیں..... مگر چند ضرورت مند انسان خوش ہیں..... ان کی خوشی میں میں خوش ہوں''۔

کہانی کے دوسرے حصے میں مالی میں ایک بیرونی ملک سیلانی کا صرف اس لئے قتل ہوجاتا ہے کیونکہ وہ موج مستی کے عالم میں ایک ایسی دھن پر ناچ رہا تھا جو مالی کے کسی مذہبی بھجن پر مبنی تھی۔

ذرا سی ٹھیس لگی اور مذہب کا شیشہ چکنا چُور

مذہب تو خدا کے نور کا ایسا عکس ہے جو انسانی زندگی کی راہوں کو روشن کرتا چلا جاتا ہے۔لیکن خدا کی طرف جانے والی روشن راہیں تنگ نظری کے اندھیروں میں کہیں کھوگئی ہیں۔اسی لئے انسان کی خدا تک رسائی نہیں ہو پاتی۔

تبھی تو مسعود مفتی کے اندر کا مصنف اس نتیجے پر پہنچتا ہے:

''اتنی خوبصورت سرزمین۔۔۔اتنی زرخیز مٹی۔۔۔اور اس پر اتنی غربت۔۔۔اتنا افلاس۔۔۔اگر خدا ان سے خوش ہوتا تو ان کا یہ حال نہ ہوتا''

مسعود مفتی آگے لکھتے ہیں۔

''یہ لوگ دو تین ہزار سال سے بھجن گا رہے ہیں۔مگر خدا کو خوش نہیں کر سکے۔خاک اور دریاؤں کی آغوش میں بے جان منا جاتوں اور مالا کے منکوں کی گنتی سے خدا خوش نہیں ہوتا.....وہ تو عمل کی عبادت مانگتا ہے''

''سچی عبادت ہے۔خدمت خلق''

خدمت خلق جو نشی سوٹو کر رہا ہے۔

اس مقام تک پہنچتے پہنچتے کہانی کے دونوں واقعات جوہر لحاظ سے ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتے۔ایک ہی نقطے پر ضَم ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔جس کا اصل حاصل یہ ہے کہ خدا کے بندوں کی خدمت ہی خدا تک پہنچنے کا سچا راستہ ہے۔

محض مذہبی رسُومات کی اندھی ''نقل'' مالا کے منکوں کی گنتی جیسے سبھی چلن چاہے وہ کسی بھی مذہب میں رائج ہوں اُن سے انسان نیک یا پاکباز ہونے کی خوش فہمی کا شکار تو ہو سکتا ہے مگر اس سے خدا کو خوش نہیں کر سکتا۔

اسی لئے اپنے نقطہ عروج پر پہنچتے پہنچتے ایک ترقی یافتہ ملک کا باسی کہہ رہا ہے۔

''ہم نے دریاؤں کو گناہ دھونے کے لیے استعمال نہیں کیا۔

بجلی بنانے کے لیے استعمال کیا ہے''۔

مسعود مفتی کا' رواروی میں کہا گیا سادہ سا یہ جملہ برصغیر کی صدیوں کی روایت کی طرف اس طرح اشارہ کر رہا ہے کہ اگر اب بھی نہ سمجھو تو کب سمجھو گے۔

اب اس کہانی کا تجزیہ کرتا ہوں تو پنجابی کا محاورہ.....

''روندی یاراں نوں' ناں لے لے کے بھراواں دے'' میری زبان پر آ رہا ہے یہاں ذکر غیروں کا ہے درد اپنوں کا۔

بات تو مسعود مفتی جاپان اور مالی میں ہونے والے واقعات کی کر رہے ہیں۔لیکن دراصل اُن کے سینے میں اُن غریب لوگوں کے لیے درد ہے' جن کی زندگی' نسل در نسل مصیبتیں سہتے' روتے بلکتے' گڑگڑاتے ہوئے گزر جاتی ہے' وہ بھی وہاں' جہاں انسانی ضروریات کی تمام چیزیں قدرت نے افراط سے بخش رکھی ہیں۔جہاں مذہب کا بول بالا ہوتے ہوئے بھی ان اقدار کا فقدان ہے جو زندگی کو خوشحالی کی دولت سے مالا مال کر سکتی ہیں۔

اسی لیے یوم پیدائش کو روایتی ڈھنگ سے منانے کے بجائے' اپنے کمرے کی چار دیواری میں بند ہو کر یہ کہانی تحریر کر رہے ہیں تا کہ لاعلمی اور لامذہبی نے اندھیرے کی جو دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں اُن کو ڈھا کر زندگی کی بہتر سہولتیں اُن لوگوں تک پہنچ سکیں جو نسل در نسل ان سے محروم ہیں۔

اُن کی یہ کہانی ترغیب دے رہی ہے کہ کوئی نشی سوٹو بن کر برصغیر میں پورے خلوص سے خدمت خلق کے جذبے سرشار ہو کر سامنے آئے اور غریبوں کی زندگی کو بدل کر رکھ دے۔ان کی کہانی کہہ رہی ہے کہ مذہب کو صحیح معنوں میں سمجھا جائے تا کہ سیدھے سادے عوام کے زندگی میں خدا کے نور کی روشنی بھر سکے۔جب لوگ مذہب کو صحیح معنوں میں سمجھ سکیں گے تو مذہب کے نام پر قتل وخون کا سلسلہ خود بہ خود بند ہو جائے گا۔

فنی اعتبار سے بھی یہ کہانی دعوت فکر دیتی ہے۔

یہ کہانی بیرونی ممالک مستعار لے کر اُن بندھے ٹکے خانوں میں سمٹتی ہے جن کے مطابق ہمارے نقاد حضرات کہانی کو پرکھا کرتے ہیں۔

نہ شروع میں کوئی اشارہ نہ بیچ میں کوئی استعارہ نہ اختتام میں کوئی شرارہ۔

نہ زبان کی گھن گرج' نہ کسی فلسفے کی دھمک' سیدھی سادی بات ایسے کہہ دی ہے جیسے.....

یہاں مجھے یاد آ رہا ہے۔ہمارے گاؤں داؤد ضلع سیالکوٹ میں میرے والد کے دوست چاچا شیر' جھنڈے شاہ کے ڈیرے میں جب کوئی بات کرتے تھے تو سارے گاؤں والے عش عش کرتے ہوئے کہتے ہیں تھے۔''واہ بھئی واہ۔یہ ہوئی نہ پتے کی بات''۔

مسعود مفتی کی یہ کہانی ایسی ہے جسے پڑھ کر ہر قاری عش عش کرتا کہہ اُٹھتا ہے

''واہ یہ ہوئی نہ کہانی''

اور یہی بات اس کہانی کو لافانی بناتی ہے۔

ادب کا بوکر انعام

اس سال ادب کا بوکر انعام THE FINKLER QUESTION نامی ناول کو ملا ہے۔اس مزاحیہ ناول کے مصنف کا نام ہاورڈ جیکسن ہے۔بوکر انعام کی تاریخ میں پہلی بار کسی مزاحیہ ناول کو انعام کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔جیوری ممبران اس کی وضاحت کئی طرح سے کر رہے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ ناول خالصتاً مزاحیہ ناول ہے۔نامور مصنفین اور ناقدین بھی اسے مزاحیہ ناول ہی گردان رہے ہیں۔عالمی سطح پر مزاح کی قدر و منزلت نے مزاح لکھنے والوں کو حیرت کے ساتھ خوش اُمیدی میں بھی مبتلا کر دیا ہے۔

براہ راست

جناب رتن سنگھ کا تعلق پنجاب کی اُس سرزمین سے ہے جو اُن کے پاؤں کے نیچے سے نکل چکی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی' کرشن چندر' بلونت سنگھ' پریم پال اشک' دیوندر اسّر اور جوگندر پال جیسے نامور افسانہ نگاروں کی طرح رتن صاحب نے بھی ہجرت کے کرب کو جس شدّت سے محسوس کیا اُسی محبت اور وارفتگی سے افسانوں میں ڈھال کر اپنے قاری کو پیش کر دیا۔ مٹی کی محبت کے مارے یہ تخلیق کار قلم کو سیاہی کے بجائے شہد میں ڈبو کر کہانیاں لکھتے اور مسلکِ محبت عام کرتے ہیں۔ اِنہی عظیم فنکاروں کے دم قدم سے تقسیم کی نفرتوں کے باوجود اُردو زبان وادب کسی طرح کی آندھی اور طوفان کو خاطر میں لائے بغیر وقت کے دھارے کے ساتھ آگے اور آگے کی جانب رواں دواں ہیں۔ رتن سنگھ جیسے عاشق اردو کے قلم کی جولانیاں اس روانی کو جس قدر طاقت' تازگی اور توانائی بخش رہی ہے اُس کی گواہی زیرِ نظر صفحات بحسن وخوبی دے رہے ہیں۔۔۔۔!!!

گلزار جاوید

☆ گفتگو کا سِرا قصبہ داؤد' تحصیل نارووال ضلع سیالکوٹ کی یادوں سے پکڑا جائے تو آپ' ہم اور ہمارے قاری کے لیے پُر لطف رہے گا؟

☆☆ ہیر کہتی ہے: حاجی لوک حج نُوں جاندے' میرا کعبہ تخت ہزارہ۔ تو حضور میرا کعبہ داؤد ہی ہے جہاں میں پیدا ہوا' جہاں زندگی جینے کا سلیقہ سیکھا۔ مجھے محبت' ایثار' احترام کی دولت سے مالا مال کر دیا' اس کا ذکر میری نظم ہڈ بیتی میں ان الفاظ میں ہوا ہے۔

ایک عمر بھر روزے رکھے
اور مانگی لاکھ ' دعائیں
داؤد کا چاند نظر جو آئے
تو ہم بھی عید منائیں
چاند چڑھا نہ کوئی عرش پر
نہ عید ہی ہوئی کوئی
میرے لیے تو ساری عمر ہی
محرم جیسی ہوئی

☆ ''داؤد سے ہجرت کے وقت جو کچھ آپ پر بیتی اُن احساسات میں ہمارے قارئین کو شریک کیجیے بیان میں اُس کمرے کا ذکر ضرور ہونا چاہیے جس میں آپ پورے گاؤں کو بسانے کے خواب دیکھا کرتے تھے؟

☆☆ نمبردار مُراد علی گھر کے آنگن میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ کہنے لگا ابھی چلو۔ سب ہندو بازار میں اکٹھے ہو رہے ہیں۔ سارا گھر اس پل کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ میں پہلی منزل والے پسار کے پیچھے والے کمرے میں گیا۔ اس کی در و دیوار کو حسرت سے دیکھا' اُس کی بو باس کو سانسوں میں بسایا اور نیچے اُتر آیا۔ گاؤں سے لے کر راوی کے پاٹ تک ڈیڑھ میل کے فاصلے میں کچھ لوگوں کو لاٹھیاں ماری گئیں لیکن ہمارے گھر کے کسی فرد کو کچھ نہیں کہا۔ ہم اس مستری نہال کے پڑپوتے تھے' جس کی نیکی گاؤں والوں کے دلوں میں زندہ تھی۔ وہی ہمارے کام آئی۔ ہمیں پہلے' پور میں ناؤ میں بٹھا کر اُس پار یعنی ہندوستان پہنچا دیا۔

☆ ہجرت کے بعد ڈیرہ کہاں لگا اور روز و شب کس طرح بسر ہوئے؟

☆☆ ہجرت کے بعد سرحد پر ہی اپنے ننھیال ڈیرا بابا نانک آ گئے۔ گاؤں کے دو ایک پریوار اور بھی ساتھ تھے۔ 1945ء میں میٹرک وہیں سے کیا تھا۔ اس لئے ہم جماعت لڑکوں کے ساتھ پاکستان سے آنے والے شرنارتھیوں کی مدد کرتا رہا۔ ایک دن سول ہسپتال میں بہت سے زخمی آ گئے۔ ڈاکٹر کسی کے پیٹ کا زخم سی رہا تھا اور میرے ہاتھ میں دوائیوں کی ٹرے تھی۔ زخمی کو تڑپتا دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے تو ڈاکٹر نے طاقت کا انجکشن لگا کر مجھے گھر بھیج دیا۔ کہا یہ کام تمہارے بس کا نہیں ہے۔ پھر میرے دو چچا زاد کہیں بچھڑ گئے تھے گردونواح میں دس پندرہ دن بھٹک کر اُن کو ڈھونڈ کر لایا۔

☆ آپ نے میٹرک بہت تاخیر یعنی اٹھارہ برس کی عمر میں اپنے آبائی قصبے ''داؤد'' کی بجائے گورداسپور سے کیوں کیا؟

☆☆ گاؤں کے مڈل سکول میں انگریزی نہیں پڑھائی جاتی تھی۔ اس لئے چھٹی پاس کرنے کے بعد ایک سال جونیر میں انگریزی پڑھ کر ساتویں میں داخلہ ملتا تھا۔ نارووال کے خالصہ کالج کے ہیڈ ماسٹر سردار بہادر اقبال سنگھ نے کہا کہ اگر اپنے باپ جیسا طالب علم ثابت کر سکو تو میرے سکول میں ساتویں میں داخلہ لینا ورنہ نہیں۔ مجھے تو معلوم تھا کہ میرے والد غیر منقسم پنجاب کے بورڈ کے امتحان میں میرٹ لسٹ میں تھے۔ میرے لئے یہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے وہاں سے جونیر گیا اور پٹیالہ میں جا کر ساتویں میں داخلہ لے لیا' وہیں چار سال پڑھ کر دسویں پاس کی' رہی عمر کی بات تو ایک سال تو یوں ضائع ہوا۔ ویسے مولوی امام دین مجھے گود میں اٹھا کر لے گئے تھے داخل کرنے کے لیے۔ عمر سال ڈیڑھ

سال زیادہ لکھ دی تھی' پانچ سال کا دکھانے کے لئے۔

☆ ''جس سرزمین پر میں پیدا ہوا وہ میری آنکھوں سے چھین لی گئی'' یہاں تک بات سمجھ آتی ہے ''جس سرزمین پر میں رہتا ہوں اُس کی مٹھی بھر مٹی مجھے نہیں ملی'' یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے؟

☆☆ ساری عمر کرائے کے مکانوں میں کاٹ دی۔ گاؤں میں سو بیگھہ زمین' مکان' بیٹھک' حویلی کا وراث بننے والا رتن سنگھ ساری عمر اپنا مکان بنانے کے لیے ترسا کیا۔ وہ تو بھلا ہو مولوی برکت علی کا جنہوں نے میرے نہ نہ کرتے مجھے ریلوے میں کلرکی کے امتحان میں بٹھا دیا اپنے ساتھ' والد کی بیماری کی وجہ سے یہ کی تو چند مہینے لیکن اُس کی بنا پر ہندوستان میں روزی روٹی کا سہارا ہو گیا۔ مکان تو بھائی جان اب بنا ہے' ریٹائیر ہونے کے پندرہ سال بعد۔ اب کہہ سکتا ہوں کہ ہاں مٹھی بھر مٹی مل گئی۔ اس سلسلے کا لطیفہ سن لیجیے۔ ریٹائیر ہونے پر سٹاف نے پوچھا۔ تو میں نے کہا' مکان تو نہیں ہاں پلاٹ ہیں بہت سے'' کس کس شہر میں انہوں نے پوچھا۔ ''مکان کے لیے پلاٹ نہیں ہیں' کہانیوں کے پلاٹ ہیں بہت سے'' میرا جواب تھا۔

☆ کشف و کرامات پر یقین نہ رکھنے والا شخص خواب کیونکر دیکھا کرتا ہے وہ بھی دن میں؟

☆☆ بچپن میں بڑے کنوئیں سے گلاب توڑنے جایا کرتا تھا۔ اب بھی صبح صبح سیر کرنے نکلتا ہوں اور خواب بنتا ہوں۔ وہیں سپنے کہانیوں میں ڈھل جاتے ہیں۔

☆ پہلی کہانی ''ممی تم ایک دیوار ہو'' کس تحریک اور رہنمائی کے بل پر لکھی اور اس قدر تاخیر یعنی چھبیس برس کی عمر میں کیوں لکھی؟

☆☆ ملک کی تقسیم کے بعد ذمے داریوں کے بوجھ تلے ایسا دبا کہ ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ ایک مرتبہ خلیج کچھ کے کنارے گھومتے کچھ گنگنانے کو جی چاہا تو جس شخص نے وارث شاہ' قادر یار' پیلو' دمودر کو پڑھ رکھا تھا اُسے اُن کا ایک بھی شعر یاد نہ آیا تو مجھے پریشان ہوتے دیکھ کر ان شعرا نے غیب سے اُکسایا یہاں خود کچھ اور مین نے پنجابی میں ایک دعائیہ نظم کہہ ڈالی۔ کچھ نظمیں پنجابی رسائل میں چھپ چکی تھیں کہ رام لعل صاحب نے ایک نظم سن کر کہا۔ یہ تو کہانی ہے تم اردو میں کہانیاں کیوں نہیں لکھتے۔ میں نے کہا میری اردو کی تعلیم تو آٹھویں دسویں درجے تک ہے۔ وہ بولے کہانی تو بول چال کی زبان میں لکھی جاتی ہے۔ وہی مجھے ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں لے گئے اور مجھے لگا کہ میری زندگی کو راستہ مل گیا ہے۔ اور میں اس راہ پر چل پڑا۔ جب جاگے تبھی سویرا۔

☆ کچھ تفصیل ادبی تربیت اور صحبتوں کی بیان کیجیے؟

☆☆ جناب آل احمد سرور کا نرم لہجہ' احتشام صاحب کے نپے تلے الفاظ' حیات اللہ انصاری اور علی عباس حسینی کے کچھ نہ کہتے ہوئے لب' ڈاکٹر محمد حسن کے ناقدانہ مشورے' ہندی ادیب یشپال کی شفقت' امرت لعل ناگر کا ہتنگ بنانے کا نیوتہ' ڈاکٹر قمر رئیس' شارب ردولوی' شمیم نکہت' قاضی عبدالستار' قیصر تمکین' عابد سہیل' اقبال مجید' حسن عابد' سبط اختر' نجم الحسن' بشیشر پردیپ' رضوان احمد کے سنگ ساتھ نے قدم قدم پر میری تربیت کی۔ منظر سلیم' حسن شبیر کس کس کا ذکر کروں بھائی۔ رضیہ آپا اور جناب سجاد ظہیر کے کرم کو کیسے بھولوں۔ رضیہ آپا میرے ننھے سے بیٹے کے لیے گلی ڈنڈا لے کر آئی تھیں دِلی سے اور سجاد ظہیر ایک دن دفتر سے اٹھا کر لے گئے۔ چلو تمہیں تلک راج آئند سے ملواؤں۔ رام لعل برسوں میرے پڑوسی رہے۔ ان سب نے مل کر داؤد کے دیہاتی کو کہانی کار بنا دیا۔

☆ سنا ہے! آپ سرکاری ملازم ہوتے ہوئے انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس میں باقاعدگی سے شرکت کیا کرتے تھے۔ آپ کی شخصیت اور فن پر اس نظریے یا فلسفے کے کیا اثرات رہے؟

☆☆ زندگی کو خوبصورت بنانے کا عمل ہی سب سے اچھا فن ہے۔ یہی ترقی پسندی کے اصل معنی ہیں۔ ہزاروں سال پہلے لکھی گئی کتھا سرِت ساگر اس خیال کی تائید کرتی ہے۔ میرے لئے یہی روشنی کا منبع ہے۔

☆ آپ کے خیال میں اشتراکی نظریے کی موت واقع ہو چکی یا اس کے تنِ مردہ میں ابھی جان باقی ہے؟

☆☆ اشتراک تو کائنات کے نظام کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ سورج' چاند ستاروں کی بقا ایک دوسرے کے اشتراک پر نربھر کرتی ہے۔ اشتراک ایک نظریہ ہے' اس پر عمل کرنے والے ناکام بھی ہوں' تب بھی نظریہ زندہ رہتا ہے۔ رہا آپ کا سوال۔ وہ سیاسی ہے' میری رائے چہ معنی۔

☆ ہجرت کے باوجود آپ کے ہاں انتظار حسین کی طرز کا Nostalgia نظر نہیں آتا جبکہ پنجاب سے ہجرت کرنے والے اہلِ قلم نے بڑی شدومد سے ہجرت کے موضوع کو اپنی تخلیقات کا عنوان بنایا ہے؟

☆☆ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں چند سال پہلے ایک ایم فِل کا موضوع تھا۔ رتن سنگھ کے ہاں ناسٹلجیا عناصر پناہ گاہ کے آئینے میں۔ پناہ گاہ میں اکاون کہانیاں ہیں۔

☆ آپ کی کہانیوں میں موجود عدم تحفظ کا احساس اس قدر نمایاں کیوں ہے؟

☆☆ یہ ہمارے دور کا سانحہ ہے۔ میری کہانی ''ناف کا درد'' کا پہلا جملہ ہے ''جب ناف کاٹ کر مجھے ماں سے الگ کیا گیا تو مجھے بہت درد ہوا تھا۔ ماں سے میرا رشتہ کٹ گیا تھا۔ خون کے رشتوں میں بھی وہ قربت نہیں رہی۔ ایسی صورت میں تحفظ ہے کہاں جس کا ذکر کروں؟

☆ شعوری اور غیر شعوری افسانہ نگار کا فرق بتلایئے! کچھ لوگ بیدی کو شعوری اور آپ کو غیر شعوری فنکار کیوں گردانتے ہیں؟

☆☆ میری کہانیاں لاشعور کی کہانیاں ہیں۔ میرا خیال ہے کوئی کہانی غیر شعوری ہوتی ہی نہیں۔

☆ کچھ لوگ آپ کو بیدی اور بلونت سنگھ کا پیروکار بھی گردانتے ہیں؟

☆☆ یہ غالباً اس لئے کہ ہم تینوں کا تعلق پنجاب سے ہے۔ تینوں نے پنجاب پر کہانیاں لکھی ہیں۔ ویسے ادب میں کوئی کسی کا پیروکار نہیں ہوتا۔ کرشن چندر جیسی نثر قاضی عبدالستار نے نہیں لکھی حالانکہ قاضی کا زبان پر عبور کرشن چندر سے کہیں زیادہ ہے۔ بیدی اور بلونت سنگھ کی عظمت اپنی جگہ مسلّم۔ آنے والی نسلیں جنازہ کہاں ہے اور جگر جیسی کہانیوں کی فنی خوبیوں سے مستفید ہونا چاہیں گی۔ وہ دیے سے دیا جلائے گی مگر اُن کی پیروکار نہیں کہلائے گی۔

☆ آپ کے فن پر بات کرنے والے جا بجا پریم چند کا حوالہ دیتے ہیں مگر پریم چند سے آپ کا براہِ راست فنی تقابل کرنے سے کتراتے ہیں؟

☆☆ فنی تقابل کرنا بھی نہیں چاہیے۔ پریم چند کا تقابل تو منٹو' کرشن اور بیدی کی نسل سے بھی نہیں کرنا چاہیے حالانکہ اُنہوں نے اردو افسانے کو عالمی معیار کے مقابل لا کھڑا کیا ہے۔

☆ کیا یہ تاثر درست ہے کہ آپ کی کہانیوں کی طرح آپ کا ذہنی اور تخلیقی سفر بھی دھیما رہا ہے؟

☆☆ عورت سوا نو مہینے بعد بچہ جنتی ہے۔ سیپی' موتی بن جانے کے بعد منہ کھولتی ہے۔ اس عمل کو دھیما نہ کہیے۔ میں ہفتوں' مہینوں یہ سوچتا رہتا ہوں کہ کہانی کا پہلا جملہ کیا ہو۔ کئی کہانیاں ایسی ہیں جو سالوں کی فکر کا نتیجہ ہیں۔

☆ ''اردو افسانے میں رتن سنگھ کی آواز تیسرے سلسلے کے پہلے کہانی کار کی ہے'' آپ کے خیال میں یہ صاحب کہنا کیا چاہتے ہیں؟

☆☆ ڈاکٹر محمد حسن تو اب مرحوم ہو گئے۔ اب اُن کی تحریر سے قاری خود نتیجے اخذ کرے۔ رہی میری بات تو جب انھوں نے یہ لکھا تھا کہ رتن سنگھ کی شکل میں اردو ادب کو خلیل جبران مل گیا ہے تو میں نے اس کا یہی مطلب لیا تھا کہ انھوں نے ساتویں آسمان پر چمکتی منزل کی طرف اشارہ کیا تھا کہ وہاں پہنچ کر دم لینا۔

☆ خوب یاد کرایا آپ نے! ڈاکٹر محمد حسن کے علاوہ ایک اور صاحب نے بھی آپ کے اندر خلیل جبران کو دریافت کیا ہے۔ آپ کے خیال میں یہ مماثلت اتفاقی ہے یا اس کا کوئی ٹھوس جواز ہے؟

☆☆ انسان میں خدا کا نور موجود ہے لیکن کوئی انسان خدا ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اگر قارئین کو میری کہانیوں میں خلیل جبران کی کوئی خوبی نظر آتی ہے تب بھی میں خلیل جبران کی عظمت کو نہیں پہنچ سکتا۔

☆ آپ کی بیشتر کہانیاں خیر کا پیغام لیے ہوتی ہیں۔ اکثر یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ آپ دیدہ یا نادیدہ خواہش کے زیرِ اثر شر کو غالب دکھانے پر مجبور نظر آتے ہیں؟

☆☆ میری ایک کہانی ہے' بیسویں صدی کا صدر بازار۔ اس میں ایک آدمی کم پیسے ہونے کی وجہ سے کچھ نہیں خرید پاتا۔ نہ مکان' نہ بیوی' نہ آرام و آسائش کی دوسری چیزیں۔ بازار کے آخر میں وہ ایک کمانی دار لمبے پھل والا چاقو خرید لیتا ہے تو پھر اُسے وہ سب کچھ مل جاتا ہے جس سے وہ ساری عمر محروم رہا۔ یہ شر کے غالب ہونے کی کہانی نہیں' بلکہ حالات کے بدتر ہونے کی داستان ہے۔

☆ کبھی کبھی آپ کے ہاں Extra Marital رشتوں کو بھی برا نہیں گردانا جاتا؟

☆☆ نفسیات کے کئی ماہر اسے ایک فطری جذبہ سمجھتے ہیں۔ میں نے جب پہلے دن قلم اٹھایا تھا تو قسم کھائی تھی کہ ادب سے واسطہ رکھنا ہے تو اس لعنت سے باز رہنا ہوگا' کیونکہ اس سے ذہن میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں کہانی لکھی ہی نہیں جا سکتی۔

☆ آپ کے ہاں قلیل سامانِ ضائع کا حوالہ دینے والے اگر آپ کے تخلیقی جوہر کی قلت کا ذکر کر رہے ہیں تو کیا آپ کو اس کا اقرار ہے؟

☆☆ بڑے سے بڑا فنکار بھی اپنے آپ کو فن کا ماہر کہلانے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ بقول عابد سہیل ''رتن سنگھ کا فن اختصار سے عبارت ہے''۔ یہ اختصار صرف اور صرف استعاروں کے بل بوتے پر ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ کھلونے' ہزاروں سال لمبی رات' بیسویں صدی کا صدر بازار' داغ جیسی کہانیاں اس اعتبار سے مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔

☆ کوئی آپ کو مختصر افسانہ نگاروں میں نمایاں مقام کا حامل گردانتا ہے' کوئی مختصر واقعات کو بڑا بنانے کا ماہر کہتا ہے۔ رائے کا یہ تضاد قاری کو کنفیوژن میں مبتلا کر رہا ہے؟

☆☆ زندگی کے چھوٹے سے واقعات کو بڑے معنی پہنا کر تھوڑے لفظوں میں بیان کرنے کا نام ہی مختصر افسانہ ہے۔ میرا ایک افسانہ ہے ذرّے۔ ایک آدمی کسی کا بڑی بے رحمی سے قتل کرتا ہے' اور اُس کی لاش کو گھسیٹتا ہوا کنویں میں پھینکنے جاتا ہے' تو راستے میں چیونٹیوں کی قطار دیکھ کر اس لئے راستہ بدل لیتا ہے کہ لاش کے نیچے دب کر چیونٹیاں نہ مر جائیں۔

☆ ایک طرف آپ کو نہایت سادہ اور سچے فنکار کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ آپ نے اپنے تخلیقی اظہار کو بہت مانجھ کر روشن کیا ہے؟

☆☆ مختصر کہانی لکھنا اور مینا کاری کرنا لگ بھگ ایک سا عمل ہے۔ اس میں واقعات کے علاوہ لفظوں کی نشست و برخاست بھی اہمیت کی حامل ہے۔

☆ اکثر کہانیوں میں آپ کا کردار بطور راوی نمایاں ہوتا ہے۔ کبھی کبھی آپ بیانیے کو پُرکشش بنانے کے لیے خاص جتن کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں؟

☆☆ میں کہانی کے موضوع کو جند جان کا حصہ بنا کر لکھتا ہوں۔ اس لئے میں اکثر وارد ہو جاتا ہوں۔

☆ مختصر افسانہ نگاروں کی فہرست میں آپ کا نام سرِ فہرست گردانے والے بہت سی خوبیوں کے ساتھ آپ کے ہاں کچھ خامیوں کی بابت بھی شاکی دکھلائی دیتے ہیں۔ آپ کے خیال میں وہ خامیاں کیا ہو سکتی ہیں؟

☆☆ جناب آلِ احمد سرور اور احتشام صاحب کے ہاں جلسوں میں اکثر

یہ سننے کو ملتا تھا کہ میرے ہاں ایک آنچ کی کمی ہے۔ اُسی آنچ کی کمی کو دور کرتے کرتے تقریباً چار سو کہانیاں لکھ چکا ہوں۔ بہتر سے بہتر کی طرف سفر میں گامزن رہنا میرا کام ہے۔ کہاں تک کامیاب ہوا یہ وقت بتائے گا۔

☆ کچھ لوگوں کا یہ بھی فرمان ہے کہ اپنی سادگی جتلانے کے لیے آپ جتنی محنت کرتے ہیں اُس قدر توجہ کہانیوں کے اُسلوب اور تکنیک پر نہیں دے پاتے؟

☆☆ کہانیوں کے نقش ونگار سنوارنے کی کوشش ہی میرا اسلوب ہے۔ ٹیکنیک تو ہر کہانی کی ضرورت کے مطابق ڈھلتی ہے۔ میری کہانی خبر' حقیقت اور افسانہ پڑھ لیں تو بات واضح ہو جائے گی۔ پہلے دو سطر کی اخباری خبر ہے' پھر خبر کی تفصیل' پھر دونوں پر مبنی افسانہ۔

☆ آپ کے افسانوں کو چٹکلے کہنے والے آپ کو کس سمت دھکیلنا چاہتے ہیں؟

☆☆ ہزاروں سال لمبی رات کے علاوہ دو اور کہانیوں کو عابد سہیل نے اپنے پرچے کتاب میں میرے نام کے بغیر شائع کرتے ہوئے قارئیں سے کہا کہ وہ ان کہانیوں پر رائے بھی دیں اور مصنف کے نام کا بھی اندازہ لگائیں۔ تب ہزاروں سال لمبی رات کے بارے میں دو قسم کی رائے آئی تھیں۔

ایک تو یہ کہ بکواس ہے' چٹکلہ ہے' لطیفہ ہے

دوسری یہ کہ کلاسک ہے

اب جب یہ کہانی روسی' نارویجین زبانوں کی اینتھالوجی میں شامل ہے کئی جگہ نصاب میں ہے اور دیگر کئی زبانوں میں چھپ چکی ہے۔ اس کے بعد کچھ اور کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

☆ کہانی کے میڈیم میں غزل کہنے والا فنکار باقاعدہ شاعر کیوں نہ بن سکا؟

☆☆ باقاعدہ شاعر ہوں بھائی پنجابی زبان کا شاعر۔ یہ اور بات ہے کہ اُردو کہانی کار کی مہر لگ چکی ہے۔ اس لئے پنجابی والے بھی مجھے پنجابی شاعر کم اور اُردو افسانہ نگار زیادہ سمجھتے ہیں۔ میرے دو مجموعے ہیں پنجابی شاعری کے۔ سپنے والی دھوتی اور ہڈ بیتی۔ یہی ہڈ بیتی بعد میں اردو میں ترجمہ کی گئی۔ ایک دو ہوں کی کتاب اس سال چھپ جائے گی۔ ہندی میں ایک ہزار دوہے لکھے ہیں۔ اُردو میں ایک بار تابڑ توڑ 65 غزلیں کہی تھیں۔ عمیق حنفی صاحب کو دیکھنے کے لیے کہا تو پہلا شعر ہی وزن سے باہر دیکھ کر بولے ''تم انہیں پھاڑ کر نہیں پھینک سکتے'' آج میرا وقت برباد کر رہے ہو' کل کو کسی دوسرے کا کرو گے''۔ اور پھر یہ کہ یہ شاعری کی زبان نہیں ہے۔ اسی بات کو لے کر عابد سہیل نے اس مجموعے کا نام غیر شعری زبان کی غزلیں رکھ دیا ہے۔ دیباچے میں یہ سب باتیں لکھ کر رکھ دی ہیں۔ دیکھئے کب چھپتا ہے عروض کی غلطیاں ایک صاحب نے ٹھیک کر دی ہیں۔

☆ آپ کا بہت سا وقت بھارت کے شورش زدہ علاقوں میں بیتا ہے مگر ہماری نظر سے اُس موضوع پر آپ کی کوئی کہانی نہیں گزری؟

☆☆ کہانیاں ہیں حضور۔ آپ تک پہنچی نہیں۔ بیچ کی لکیر آڑے آتی ہے۔ میرے کہانی خبر' حیثیت اور افسانہ عزرایل' فلسطین کے تنازعے پر بھی ہے۔

☆ آپ کے ہاں Bureaucracy کی بداعمالیوں کا ذکر کثرت سے ملنے کے اسباب کیا ہیں؟

☆☆ اس موضوع پر میری ایک کہانی کا اردو میں تو کسی نے نوٹس نہ لیا۔ لیکن جب وہ کہانی ہندی میں چھپی تو یہی سوال ایک قاری نے اٹھایا تھا۔

ادیب کے اندر بقول فراق گورکھپوری تلوار کی دھار پر چلتے ہوئے بات کہنے کی ہمت ہونی چاہیے۔ تبھی وہ اپنے دور کا عکاس ہو سکتا ہے۔ ایسا ادب ہی وقت کی حدوں کو توڑ کر زندہ رہتا ہے۔

☆ مغرب میں ہر شے کا پیمانہ انسان کی ذات سے منسوب ہونے کے باوجود اعلیٰ معاشرتی روایات کا چلن عام ہے۔ رحمٰن اور رحیم کے دعوے دار ذلت اور پستی کا شکار ہیں؟

☆☆ رحمٰن اور رحیم تو سچی راہ پر چلنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ہم اُن پر سچا ایمان لے آئیں تو فرشتے انسان کی قدم بوسی کے لئے آنے لگیں گے۔

☆ چند ایک تراجم کے علاوہ ''ماں بولی'' میں آپ کا کام نہ ہونے کے برابر ہے کم از کم ہماری نظر سے ''مالی بولی'' میں کوئی طبع زاد تخلیق کبھی نہیں گزری؟

☆☆ ماں بولی میں ہی ادبی سفر شروع کیا تھا۔ دو کتابوں کا ذکر پہلے کر آیا ہوں۔ ایک سہ حرفیوں کی کتاب عنقریب شائع ہو جائے گی۔ ویسے میں نے اِدھر دو ایک سالوں میں بیس بائیس کہانیاں پنجابی میں لکھیں ہیں۔ پنجابی ماحول کے تعلق سے یہ کہانیاں' اردو کہانیوں سے کافی ہٹ کر اپنی الگ پہچان بنائیں گی' ایسی میں امید کرتا ہوں۔

☆ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ بھارت میں پنجابی زبان ہندی کے ساتھ گڈمڈ ہونے کے باعث تنزلی کا شکار ہے' کچھ لوگ تقسیم سے قبل اردو' فارسی زدہ پنجابی کو صحیح گردانتے ہیں؟

☆☆ تقسیم نے سب سے زیادہ نقصان پنجابی زبان کا کیا ہے۔ ہم لوگ تو اپنی زندگی اچھے بُرے جی لئے۔ اپنا درد دوسرے سے کہہ کر دل ہلکا کر لیا۔ یہ زبان ہمارا ذریعہ اظہار ہے مگر خود گونگی ہے۔ کچھ کہہ نہیں سکتی۔ نت نئے زخم کھا رہی ہے۔ لہولہان ہو رہی ہے' اور کوئی پرسان حال نہیں۔ اِدھر کے پنجاب کا ناطہ پوٹھوہاری' سرائیکی' جھانگی' جانگلی سے ٹوٹ گیا۔ آپ کے ہاں کے پنجاب والے دوابی' ڈوگری' ہریانوی' پہاڑی' گوجری لب و لہجے سے محروم ہو گئے۔ پوٹھوہار اور سرائیکی کے علاقوں سے آنے والوں کی نسلیں ماں باپ دادا دادی کے لب و لہجے سے نا آشنا ہیں۔ از راہِ تذکرہ سندھیوں کی نئی نسل سندھی نہیں بول سکتی۔ نہ اپنی زبان میں ہمارے بچے ہنس سکتے ہیں نہ رو سکتے ہیں۔ اس موضوع پر پنجابی زبان میں ایک کہانی بھی لکھی ہے۔ گورو نانک' گورو گوبند سنگھ' بابا فرید شکر گنج' سنت کبیر' اور کئی دوسرے سنتوں کے باقی میں اردو فارسی کے ایسے الفاظ ہیں جنہیں کل سمجھنے

والا کوئی نہ ہوگا۔ دھرم کی بات چھوڑو۔ وراث شاہ' قادر یار' پیلو' دمورد' شاہ محمد جیسے شعراء کی شاعری سے نئی نسل کہاں تک لطف اندوز ہوگی، اور زندگی کے راز سیکھ پائے گی' اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔

☆ آپ کے خیال میں پنجابی زبان' ادب' تہذیب' ثقافت کا مستقبل سیکولر بھارت میں کیا ہے؟

☆☆ پچھلے سوال کے جواب میں جو مسئلے اٹھائے ہیں اُن کا حل تلاش کرنے کے بعد مستقبل یہاں بھی روشن رہے گا اور وہاں بھی۔ اس کے لیے درسی سطح پر کوشش کرنے کے علاوہ مشترکہ کوی سمیلن' افسانوں کی شامیں' عوامی سطح پر میلوں ٹھیلوں کا اہتمام سارے لمبے چوڑے بارڈر پر ہو جس میں مغنی ہیر' مرزا صاحباں' سسی پُنوں' پورن بھگت گائیں۔ اسی طرح کے عوامی میل ملاپ سے دونوں طرف کے پنجابی لب و لہجے قابل فہم ہو جائیں گے۔

☆ بھارت کے حوالے سے یہی سوال اگر اردو کی نسبت کیا جائے تو آپ کیا کہنا پسند کریں گے؟

☆☆ ایک واقعہ بیان کر دیتا ہوں۔ دس بارہ سال پہلے لکھنؤ میں اقبال مجید نے مسلم معاشرے کے تعلق سے ایک کہانی تقریباً پون گھنٹے میں سنائی۔ اُس جلسے میں میں نے ایک کہانی سنائی ''رگ وید کے بعد'' دس بارہ منٹ میں۔ کہانی آرٹ کے Commercialisation کے موضوع پر ہے۔ پتہ چلا کہ میری کہانی چونکہ ہندو مائیتھولوجی سے اٹھائی گئی تھی اس لئے اُسے سمجھنے والا وہاں کوئی نہ تھا۔ جب کہ اقبال مجید کے بارے میں سننے کو ملا کہ انہوں نے قرآن کی آیتیں سنا ڈالیں۔ جواب خود اخذ کر لیں۔

☆ اردو زبان کے رسم الخط کی بابت جاری بحث کے حوالے سے آپ کا نقطہ نظر ریکارڈ پر آنا ضروری ہے؟

☆☆ رسم الخط زبان کو پہچان دیتا ہے۔ اس سلسلے میں پنجابی زبان کے حوالے سے بات واضح ہو جائے گی۔ آپ کے ہاں پنجابی اُردو میں' ہمارے ہاں گورمکھی میں اور کچھ حضرات اسے ہندی میں لکھنا پسند کرتے ہیں۔ ہم نے زبان کے مسئلے کو مذہب سے جوڑ رکھا ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ ان تینوں میں سے کون سی پنجابی کے لیے ٹھیک رہے گی۔ مسلمان گورمکھی میں پنجابی لکھ کر سکھ نہیں ہو جائے گا نہ سکھ اسے اردو میں لکھ کر مسلمان اور نہ ہندو اسے کسی لپی میں لکھ کر سکھ یا مسلمان۔ رہی بات اردو کی تو جن بچوں کا ذریعہ تعلیم اردو نہیں ہے انہیں اردو لکھنے کی مہارت نہیں ہوتی۔ وہ ایم۔ اے میں پہنچ کر اپنے نوٹس ہندی میں لکھتے ہیں۔ جب اردو آ جائے گی تو شوق کی تکمیل کے لیے اردو میں لکھنے لگیں گے۔

☆ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ پر ''رومن'' میں اردو زبان کے استعمال سے اردو کے مستقبل پر کیا اثرات اور نتائج مرتب ہو سکتے ہیں؟

☆☆ رومن میں اردو وہ لوگ لکھ رہے ہیں جو برصغیر سے باہر جا کر بس گئے ہیں۔ یہ صرف اس نسل کا مسئلہ ہے اُن کی آنے والی نسلوں کا اردو سے رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ اور اگر لوگ برصغیر میں رہتے ہوئے اردو کو رومن میں لکھتے ہیں تو اگر ان کا شوق بڑھا تو ہو سکتا ہے کل اُردو یہ ہی جی سیکھ لیں۔

☆ قریب چھ دہائی اردو زبان و ادب کی خدمت میں صرف کرنے کے بعد کوئی آپ سے دریافت کرے کہ اردو نے آپ کو اور آپ نے اردو کو کیا دیا تو آپ کے احساسات کیا ہونگے؟

☆☆ فاقہ مستی میں بھی ایسی سرمستی ایسی سرشاری جسے زر سے خریدا ہی نہیں جا سکتا۔ کہانی لکھ کر جو خوشی حاصل ہوتی ہے وہ شہنشاہوں کو بھی نصیب نہیں ہوتی۔ تخلیق کا کام کرتے ہوئے ادیب نصف خالق تو ہو ہی جاتا ہے۔ پھر یہ کہ ادب سے وابستہ ہونے کی وجہ سے زندگی جینے کا سلیقہ آیا تو پتہ نہیں اچھا انسان بن پایا یا نہیں' ہاں خود کو شر سے عیبوں سے بچا کر رکھنے میں مدد ملی۔ کبیر کے لب و لہجہ میں کہوں تو چادر جس کی چاہے نہ رہی ہو' سلوٹیں پڑی ہیں' مگر میل نہیں لگنے دی۔ اردو کی مہارانی کو کچھ دینے کی سکت اس فقیر میں کہاں۔ ہاں! لیا جھولیاں بھر کر ہے۔ میری کہانیاں چھ سات جگہ نصاب میں شامل ہیں' آٹھویں درجے سے بی۔ اے تک تین یونیورسٹیوں میں اس وقت پی۔ ایچ۔ ڈی ہو رہی ہے۔ جو ایم فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی پہلے ہو چکی' اس کا ذکر چھوڑ آیا ہوں۔ روسی اور نارویجین زبانوں میں بھی اپنی رسائی ہوئی۔ ارتقاء والے گوشہ چھاپ چکے۔ اب آپ نے قصہ کیا ہے۔ یہ سب اردو زبان ہی کی تو دین ہے۔

☆ آپ کو کب کب اپنے نظر انداز کیے جانے کا گلہ ہوتا ہے اور کس کس سے ہوتا ہے؟

☆☆ نظر انداز ہونے کا گلہ فطری بات ہے۔ لیکن یہ بھی دیکھتا ہوں کہ آج کے دور میں ادیب حاشیئے پر ہے اور نقاد سُرخیوں میں۔ ہمارے ہاں ادب کے تمام نظریے مغرب سے اُدھار لیئے ہوئے ہیں۔ اپنے ہاں کا کوئی مفکر برصغیر کی روح کو سمجھ کر ادب کو پرکھنے کے لیے نیا نظریہ پیش کرے گا تو تب اردو افسانے کے ساتھ انصاف ہو سکے گا۔۔۔۔ میرا مزاج یہ ہے کہ جب گلہ ہوتا ہے تو کسی کو بُرا بھلا کہنے کے بجائے خود میں خامیاں ڈھونڈنے لگتا ہوں۔ میری ایک نئی کہانی ہے ''ایک صاحب سے میں بہت ناراض تھا۔ ایک دن موقعہ ملنے پر جب انہیں کھری کھری سنا چکا تو مجھے اپنے آپ میں بڑی شرمندگی ہوئی''۔

☆ کیا آپ نوجوان اہلِ قلم کو اپنے تجربات کی روشنی میں کچھ احتیاطی تدابیر بتلانا چاہیں گے؟

☆☆ اس وقت اُردو کا افسانوی ادب خاص کر ہندوستان میں بڑے نازک دور سے گزر رہا ہے۔ ہمارے پیچھے آنے والی نئی نسل میں جو لوگ اچھا لکھ رہے ہیں وہ سب کے سب پچاس کے پیٹے میں پہنچ چکے یا پہنچ رہے ہیں۔ نئی نسل کے لئے یہ بہترین موقعہ ہے کہ اردو ادب کو مالا مال کریں۔ اُردو ادب ان کو شہرت کی دولت سے مالا مال کر دے گا۔

☆

''اپنے دور کی تاریخ''

(محترمہ عصمت چغتائی کا نادر مکتوب)

رتن سنگھ جی!

آپ کی کہانیوں کا مجموعہ ''پنجرے کا آدمی'' ملا۔ شکریہ۔ ایک سانس میں پڑھ ڈالا۔ اس میں میری اپنی مرضی کو دخل نہیں تھا کہانیوں نے مجھے پکڑ لیا۔

آپ کی کہانیاں کتنی سادی' کتنی معصوم اور زندہ ہیں۔ نہ قابلیت کا رعب ڈالنے کے لیے علامتوں کی بھرمار ہے' نہ فنکاری کی ہیبت بٹھانے کے لیے پیچدار' عام انسان کی سمجھ سے دور فلسفہ۔ کردار زندگی سے قریب جانے پہچانے مگر اپنی مثال آپ ہیں۔ چھوٹی سی بات سادگی سے کہی گئی ہے مگر بڑی شدت سے سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

ناف کا درد' منکر' صرف ایک آدمی' ایک غریب یگ' تیسری فتح' لافانی نانک' الف سے آم اور دوسری کہانیاں' کم وبیش سب ہی ننھی منی کہانیاں اپنے دامن میں اس وسیع دنیا کو سمیٹے ہیں۔ مگر مجھے ڈسٹ کور پر لکھے ہوئے حصہ سے اتفاق نہیں۔ آپ کے قدموں میں تھکان نہیں۔ آپ نے انسان کے دکھ سکھ میں خود کو پالیا ہے۔ نہ ہی آپ کا وجود تھکا ہوا ٹوٹا ٹوٹا اور بکھرا بکھرا ہے۔ آج کل خود کی تلاش ایک وبا ہو گئی ہے۔ آپ کی تحریروں سے تو معلوم ہوتا ہے آپ نے خود کو ہی نہیں اپنے اردگرد پھیلے ہوئے انسانوں کو بھی پالیا ہے اور اپنی کہانیوں میں انہیں زندہ کر دیا ہے۔ اب یہ ''خود کی تلاش'' بہت فرسودہ چیز ہو گئی ہے۔ اور یہ جملہ بھی پٹا ہوا ہے کہ ''اپنے آپ سے ملاقات شاذ و نادر ہی ہو پاتی ہے'' یہ نہایت رومینٹک جملہ ہوتے ہوئے بھی اب سڑ گیا ہے۔ اپنے اوپر کوئی ٹھپا نہ لگائیے' نہ لگنے دیجیے۔ تنقید میں راستہ نہ ڈھونڈیے۔ آپ ٹھیک راہ پر جا رہے ہیں یا غلط پر اس کا فیصلہ تنقید سے نہیں عوام کی طرف سے ہوتا ہے۔ آپ ان کرداروں کے ذریعہ اپنے دور کی تاریخ مرتب کر رہے ہیں۔ اپنے وقت کے چھوٹے سے انسان کی روداد سپرد قلم کر رہے ہیں۔

آپ سے مل کر تو ایسا محسوس ہوتا ہے آپ قطعی نارمل انسان ہیں۔ جینے کے طریقے جان گئے ہیں۔ خود کو پہچانتے اور جانتے ہیں۔ جو خود کی تلاش میں بھٹک رہا ہو وہ انسان کو کیا ڈھونڈے گا۔ خود غرضی چھوڑیئے اور اپنے بجائے دنیا کو ڈھونڈیئے اور پاتے رہیے۔ آپ ہی آپ خود کو پالیں گے۔

میں تین ہفتہ روس رہی۔ بمبئی آ کر بکھرے ہوئے تار جوڑے پھر پڑھنا شروع کیا اور بھی مشغولتیں ہیں۔ اتنے دن لکھنؤ میں رہی۔ ڈاک یہیں جمع ہوتی رہی' اب تک جواب نہیں دے پائی ہوں۔

سفید خون اور اشلوک بابا فرید مجھے وی پی کروا دیجیے۔ اگر کوئی کتاب حضرت گرونانک کے اقوال پر اردو یا ہندی میں ملے تو وہ بھی۔ بمبئی میں اردو ہندی کتابیں جو شال میں چھپی ہیں نہیں ملتیں۔ مجھے پتہ نہیں کہاں ملتی ہیں۔ میں آج کل مختلف مذہبوں کی تاریخ اور درس پڑھ رہی ہوں۔ طالب علمی کے آغاز میں میں نے comparative Religions کا ایک کورس کیا تھا' اُسے تازہ کرنا چاہتی ہوں۔ میں بھوپال آٹھ جون کو جا رہی ہوں اور آٹھ دن رہوں گی۔ آپ کتابیں ایسے بھجوائیں کہ وی پی وصول کرنے کے لیے میں بمبئی میں ہوں۔ میری لڑکیاں کام پر چلی جاتی ہیں۔ گھر میں کوئی نہیں ہوتا سوائے نوکر کے۔ لکھنؤ بہت یاد آتا ہے۔

عصمت چغتائی (●)

''اعتقاد بھی اعتماد بھی''

محمد حسن (●)

غالباً ۱۹۵۱ء کا ذکر ہے میں ''پایونیر'' اخبار میں سب ایڈیٹر تھا مگر بنیادی دل چسپی اُردو ادب سے برقرار تھی آل احمد سرور صاحب شعبہ اردو لکھنؤ یونیورسٹی میں ریڈر تھے ان کے گھر بیرور وڈ پر پابندی سے ہر اتوار کو انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے ہوتے تھے زوردار مباحثے ہوتے تھے اور ہر عمر اور ہر درجے کے لوگ یعنی بزرگ جوان اور نوجوان ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ یہ گویا لکھنؤ میں اُردو کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ آج کی اصطلاح استعمال کریں تو گویا خیالات کا کلیرنگ ہاؤس تھا گو سرکاری ملازمین کو یہاں آنا جانا منع تھا مگر ایک رام لعل کہ ریلوے ملازم تھے اور دوسرے ایاز انصاری کہ ریڈیو پر پروگرام ایگزیکٹو تھے ان احکامات کو خاطر میں نہ لائے۔

ایک دن رام لعل کے ساتھ ایک خاموش مگر بے چین طبیعت سردار جی دکھائی دیئے' انہوں نے تعارف کرایا رتن سنگھ ہیں جو چند روز سے ریلوے پارسل آفس میں ان کے رفیق ہوئے ہیں۔ رتن سنگھ بڑی پابندی سے ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں شریک ہوتے رہے مگر کسی نے جلسوں میں ان کی آواز تو کیا سانس لینے کی آواز تک نہ سنی۔

اس زمانے کا لکھنؤ بھی عجیب تھا ایک سے ایک عجیب وغریب شخصیت وہاں پڑی تھی انہی میں ایک صاحب ہادی نامی تھے سر پر دوپلی ٹوپی قمیض پاجامے اور قمیض پر کوٹ میں ملبوس وہ ہاکی کے ہر میچ میں ضرور دکھائی دیتے تھے کپڑے ملے ولے اور اکثر میلے ہی پہنتے تھے مگر ان کے کردار اور گفتار کے آگے ان کپڑوں پر کس کی نظر جاسکتی تھی خصوصیت صرف ایک تھی کہ ان کے نزدیک ایک وقت کی صرف دو قسمیں تھیں جو وہ ہاکی کا میچ دیکھنے میں صرف ہوا اور وہ جو ہاکی کے تذکرے میں گزرے۔ اور ہاکی کے میدان میں کھیل سے زیادہ وہ خود قابل دید ہوتے تھے کوئی کھلاڑی گول کی طرف بڑھا اور یہ خود کھڑے ہوگئے کبھی اس کو شاباش دے رہے ہیں کبھی اس کو راستہ بتا رہے ہیں کبھی بُرا بھلا کہہ رہے ہیں اور اگر خوش قسمتی سے گول ہوگیا تو یہ بیخود ہوکر خود بھی لڑھکیاں کھاتے ہوئے گول کے اندر پہنچ جاتے تھے کھیل کے شوقین بہت دیکھے مگر ہادی جیسا ہاکی کا عاشق دوسرا نظر نہ پڑا۔ لکھنؤ میں اکثر یہ ذکر آتا کاش کوئی ہادی پر کچھ لکھتا اور اسے زندہ جاوید کردیتا۔

ایک دن کسی نے بتایا کہ رتن سنگھ نے ہادی پر ایک کہانی لکھی ہے (خاکہ ہوتا تو اور اچھا تھا) بہرحال کہانی پہلے چند احباب نے سنی پھر انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں پڑھی گئی وہ دن اور آج کا دن۔ رتن سنگھ کے طرز احساس اور طرز اظہار پر ایک ناقابل شکست اعتقاد ہوگیا اعتقاد بھی اور اعتماد بھی۔

وہ کہانیاں کہاں لکھتے ہیں کہانیوں کے میڈیم میں غزل کہتے ہیں مختصر' گہری اور دردمندی سے بھرپور۔ شاید اختصار کی وجہ وہ مرکوز احساس ہے جو انہیں اِدھر اُدھر بھٹکنے نہیں دیتا۔ یہی اختصار اور ارتکاز دراصل رتن سنگھ کی کمزوری بھی ہے اور طاقت بھی۔

زمانہ کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کا تھا منٹو اور عصمت کا تھا قرۃ العین حیدر کا تھا جس میں جذبے کا ارتکاز پہلے رنگ برنگے سیاق وسباق میں انگڑائی لیتا تھا پھر سمٹ کر کسی ایک جذبے تک پہنچتا تھا جو بقول شاعر قلب کو تڑپا دے اور روح کو گرما دے مگر رتن سنگھ نے ایک نئی راہ نکالی کہ آرائش وزیبائش سے بے نیاز پلاٹ کے گھماؤ پھیراؤ سے بے پرواہ براہ راست جذبے کی شدت کو جوں کا توں پیش کردیا۔

میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ یہ رتن سنگھ کی سوچی سمجھی سازش نہیں محض مجبوری ہے جب خیال ان پر سوار ہوتا ہے تو آرائش وزیبائش کا موقع ہیں نہیں دیتا بلکہ انہیں جلد از جلد اظہار کے لئے مجبور کرکے چھٹکارا پالینا چاہتا ہے اس لئے وہ خیال یا یوں کہیے مرکزی خیال تک جلد از جلد پہنچنا چاہتے ہیں اور بہ محابا جُوں کا تُوں آرائش وزیبائش اور ہر قسم کے گھماؤ پھیراؤ سے بے نیاز ہوکر پیش کرنا چاہتے ہیں مگر دراصل یہ پیش کرنے کے الفاظ ہی بے جا ہیں وہ تو اپنے دل کی بات کو لفظوں میں ادا کرکے اپنا دل ہلکا کرلینا چاہتے اور وہ بھی جلد از جلد۔ کہ کہیں یہ جذبہ دل میں پڑا رہ گیا تو کوئی نیا گھماؤ نہ پیدا کردے۔ اب ان کی بلا سے کوئی پڑھے یا نہ پڑھے مختصر ترین مدت میں کم سے کم لفظوں میں جذبہ تو ادا ہوگیا یہ اور بات ہے کہ یہی بات کرشن چندر یا راجندر سنگھ بیدی یا منٹو کہتے تو اس کے لاکھوں برگ وبار نکالتے اور اس میں بڑی کاریگری دکھاتے قرۃ العین کہتیں کہ پوری تاریخ ہندوستان بلکہ تاریخ عام اور ادبی سماجیات کی قدریں سمو دیتیں۔ عصمت لکھتیں تو ہندوستان کی نسوانی تاریخ اس میں سما جاتی مگر رتن سنگھ کے لئے یہ واقعہ ہے اور اسے اسی طرح اور اسی قدر بیان ہونا چاہیے جیسا کہ وہ وقوع پذیر ہوا ہے۔

اگر آرٹ غیر ضروری لفظوں سے پرہیز کا ہنر ہے تو یہ آرٹ رتن سنگھ سے زیادہ شاید اردو ادیبوں میں کسی کو آتا ہو مختصر افسانہ نگاروں کی فہرست بہت لمبی ہے مگر سچے معنوں میں اور سچ مچ کے مختصر افسانے رتن سنگھ ہی نے لکھے ہیں اب اس میں ان کی خوبیاں بھی سمٹ آئی ہیں اور ان کی خرابیاں اور کمیاں بھی۔ بلکہ یوں کہیے کہ اُردو افسانے کو غزل بنانے کا فن در آیا ہے اور وہ بھی ایسے دور میں جب غزل کو بھی اس کے اختصار اور پریشاں بیانی کی پاداش میں گردن زدنی قرار دیا جارہا تھا۔

ارتکاز کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ ذرا بھی توجہ ہٹی اور افسانے میں کھانچہ پڑا اسی لئے تو اڑ گرایلن پو نے کہا تھا کہ طویل افسانہ دراصل اجتماع ضدین ہے۔ اور اس لحاظ سے غیر ممکن۔ یعنی ارتکاز بھی اور طوالت بھی یہ دونوں یکجا نہیں ہوسکتیں۔ رتن سنگھ کے سبھی افسانے اسی شق میں آتے ہیں جنہیں قرۃ العین حیدر کے لفظوں میں چٹکلے بھی کہا جاسکتا ہے مگر ان کا حال کبیر کے دوہوں کا سا ہے کہ دیکھنے میں چھوٹے لگتے ہیں مگر چوٹ بہت گمبھیر لگتی ہے۔

گیان دھیان کا مسافر

ڈاکٹر قمر رئیس (●)

یادش بخیر تقریباً بیس سال پہلے کی بات ہے میں اور رتن سنگھ کسی سفر میں ساتھ تھے۔ اچانک رتن سنگھ بولے۔ ''مہینوں سے ایک کردار' کہانی بن کر میرے ذہن میں آتا اور غائب ہو جاتا ہے۔ میرے استفسار پر کہنے لگے: یہ ایک بوڑھا کسان ہے۔ زندگی کی طویل مشقت اور محرومیوں سے نڈھال اور تھکا تھکا۔ اس کے پاس ایک کھیت ہے۔ اکثر وہ اپنے کھیت پر جاتا اور اس کے ایک کونے میں سکون سے لیٹ کر' کبھی کھلے آسمان کو تکتا کبھی آنکھیں موند کر دھیان میں ڈوب جاتا۔ اس کے چاروں طرف سے سرسبز کھیتوں کی ہریالی اور نم مٹی سے جو سگندآتی وہ اس پر نشہ سا کر دیتی۔ پھر اس زمین کے اسی ٹکڑے پر جہاں وہ لیٹتا تھا اُس نے ایک قبر سی کھودی۔ اس کے بعد اسی قبر نما گڑھے میں وہ اسی انداز سے لیٹنے لگا۔ کبھی صبح کی ہوا کے مست کر دینے والے نرم خرام جھونکوں میں وہ جیسے جھولا سا جھولتا۔ کبھی شام ڈھلے کھلے آسمان میں' آشیانوں کو لوٹتے ہزاروں پکشی اس پر سایہ کرتے گزر جاتے۔ ایک بار رات گئے تک وہ گھر نہیں پہنچا تو اس کے بچے کھیت میں اسے ڈھونڈنے آئے۔ اب انہوں نے دیکھا کہ وہ سمادھی لے چکا ہے''۔

شاید کچھ تفصیل اور تھی۔ یہ کہانی سن کر میں اور رتن سنگھ دونوں کچھ دیر کی خاموشی میں کھو گئے۔

یہ کہانی بھی رتن سنگھ کی عام کہانیوں کی طرح سادگی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی اور جہاں تک مجھے یاد ہے رتن سنگھ نے اس کہانی کو تحریری شکل نہیں دی۔ اور شاید اس طرح کی سینکڑوں کہانیاں رہی ہوں گی جو اس کے ذہن کے ایک دریچے میں داخل ہو کر دوسرے دریچے سے باہر نکل کر فضا کے دھندلکوں میں گم ہوتی رہی ہوں گی۔ صرف کچھ کہانیاں ایسی ہیں جو گزشتہ چالیس سال کے عرصہ میں اس کے تخلیقی شعور کی گرفت میں آ کر' اس کی کتابوں کی زینت بن سکیں۔ اُردو کے قارئین اس حقیقت کو تو مانتے ہیں کہ رتن سنگھ کی کہانیاں اپنی ایک الگ پہچان اور اپنے تیکھے تاثر کے اعتبار سے ایک الگ ذائقہ اپنی الگ پہچان اور اپنے تیکھے تاثر کے اعتبار سے ایک الگ ذائقہ رکھتی ہیں۔ لیکن اس کی اصل نوعیت کیا ہے ہماری دھرتی اور تہذیب میں اس کی جڑیں کہاں ہیں، جہاں سے وہ غذا لیتا ہے اس کے بارے میں کم' بہت کم سوچا اور لکھا گیا ہے۔ ایک اندیشہ مجھے اور ہے وہ یہ کہ رتن سنگھ اور جوگندر پال جیسے حسّاس ادیب جو تقسیم وطن کے نتیجہ میں اپنی دھرتی اپنے سماج' اپنے ریت رسم' اپنے البیلے موسموں' لوک گیتوں' شفاف دریاؤں اور اپنے سہانے لڑکپن کے دوستوں اور ہمسایوں سے اچانک جدا ہو کر دوسرے انجانے خطوں میں آ بسے تو ہجرت کے اس عمل میں وہ کس عذاب سے گزرے؟ اسے بہت کم قارئین اور ناقدین نے محسوس کیا ہے۔ ان کے روحانی مسائل کیوں کر دوسروں سے الگ رہے ہیں؟ انسانی قتل و خون' غارت گری اور درندگی کے جس طوفان سے وہ گزرے وہ شاید اسے کبھی فراموش نہ کر سکے؟ کیا جواں عمری کے اس تجربہ کی المناکی نے ان کی کہانیوں میں تنہائی' بے بسی' سفاکی' یاس انگیزی اور بے حسی کے جو پیکر ابھارے ہیں وہ زمینی سچائیاں نہیں ہیں؟ اور خود اپنے ملک میں گزشتہ نصف صدی میں انہوں نے طبقاتی جبر اور مجرمانہ سیاست کے جبڑوں میں جس طرح زندگی کو تڑپتے دیکھا ہے کیا اس نے ان کے دکھوں کی گرانی میں اضافہ نہیں کیا؟

''ہزاروں سال لمبی رات'' میں رتن سنگھ نے ازلی گرسنگ' ذلت و خواری اور محرومیوں کا شکار جن لوگوں سے اپنا تشخص قائم کیا ہے وہی اس دھرتی کے سپوت' اس کے وفادار اس کے محافظ اور وارث ہیں۔ رتن سنگھ اپنی نشتر جیسی کہانیوں میں اگر ایک طرف اس کے کبھی نہ ختم ہونے والے دکھوں کا گاتھا سُناتا ہے تو دوسری طرف ان کی معصومیت اور اپنی زمیں اور اس کی تہذیبی روایتوں سے اس کی وابستگی کو بھی ایک پل کے لیے نہیں بھولتا۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اس سماج کے مراعات یافتہ طبقہ کی ساری عیش کوشیوں کا بوجھ دراصل اس کے شانوں پر ہی بنا رہتا ہے جو فطری طور پر اس جمہوری نظام کے اقتدار کا خالق کہلاتا ہے۔

کہانی ''کاٹھ کا گھوڑا'' میں بندوق کے رکنے سے وزیروں' کبیروں اور افسروں کے قدم بھی رُک جاتے ہیں۔ ''ساتواں آسمان'' میں یہ چار مزدور ہیں جو پانچ ستارہ ہوٹل کی ساتویں منزل پر ایک عورت' شراب اور مرغ وماہی کے ساتھ رات' صرف ایک رات بسر کرنے کے خواب دیکھتے لیکن چوراہے کی ریڈ لائٹ پر یہی فاقہ زدہ مزدور لال بتی پار کرتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔ جب کہ دوسرے بے جھجک پار کر لیتے ہیں۔ ان کہانیوں میں بے حد نازک اور بلیغ EVOCATIVE علامتی اظہار ہے اس کی معنوی تہ داری کا مطالعہ الگ سے کرنے کی ضرورت ہے۔

رتن سنگھ کی کہانیوں کی دھیمی دھیمی فضا کی طرح اس کے ذہنی اور تخلیقی سفر کا نشوونما بھی نسبتاً سست رہا ہے۔ لیکن یہ طے ہے کہ اس کے قدم رکے نہیں۔ ابتداء میں میں نے جس غیر نوشتہ کہانی کی طرف اشارہ کیا تھا وہ حیات بخش زمین سے اور بے اماں فطرت کی ازلی روحانی نعمتوں سے اس کی وابستگی کا ایک رخ ہے۔ وہ کردار سازی کے عمل میں اکثر ان مظاہر سے انسان کے تہ دار رشتوں کی معنویت پر سوچتا نظر آتا ہے وہ جانتا ہے کہ مغربی تہذیب اور ہندوستانی تہذیب میں اختلاف کی جڑیں اسی سچائی تک پہنچتی ہیں۔ مغرب میں ہر شے کا پیمانہ اگر انسان کی ذات رہی ہے تو صرف اس لئے کہ یہ وہاں کے ارضی اور جغرافیائی حالات کا تقاضہ تھا یہی سبب ہے کہ وہاں قدرت کے مظاہر کا استحصال جی بھر کر کیا گیا۔ جب کہ ہندوستان میں اپنے سدا بہار موسموں کے ساتھ قدرت' انسان پر ہمیشہ مہربان رہی۔ اور جس نے انسان کو گیان دھیان کی طرف مائل کیا۔ (یہ الگ بات ہے کہ مراعات یافتہ برہمن

طبقہ علم وعرفان کی اجارہ داری کرنے لگا) ایلیا اہرن برگ اور سارتر جیسے مغربی مفکروں نے بھی ہندوستان کے بارے میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے۔

ویدوں کے دور کے اور بعد کے ہندوستانی رشیوں منیوں نے کبھی سوچا بھی نہیں کہ قدرت کا استحصال کیا جائے۔ ان کے نزدیک تو قدرت اپنی حیات بخشی کے باعث صرف پرستش کرنے کی چیز تھی۔ بعض قدیم مفکروں نے (اتھروید میں اس کی تفصیل ہے) کہا ہے کہ یہ سیارۂ زمین ایک زندہ اور خودکار عضو ORGANISM ہے جہاں لاکھوں سال سے جرثومے' پودے اور ہر طرح کی مخلوق ایک دوسرے سے ملکر متصادم ہوکر زندہ رہے ہیں۔ اسی لئے ہندوستان میں' اس کے دیومالائی ادب میں دھرتی ماں کے تصور پر اس شدومد سے اصرار کیا گیا۔ اس نظام فکر کے مثبت اور منفی دونوں پہلو ابھارے گئے ہیں۔ یہاں بات صرف اتنی ہے کہ ہندوستانی تہذیب سے جڑی اس سچائی کو مان لینا چاہیے۔ افسوس اس کا ہے کہ مارکسی مفکروں نے ہندوستانی سماج اور اس کی تاریخ کے مطالعہ میں ان پہلوؤں کو نظرانداز کیا۔ دوسری جانب مغرب میں قدرت کے اسرار اور خزانوں کا مطالعہ جس استحصالی نقطہ نظر سے کیا گیا اس کے اچھے اور برے نتائج سامنے ہیں۔ اس رویے کی بناء پر کرہ ارض پر جو ماحولیاتی عدم توازن پیدا ہوا اس نے خود انسانی وجود کو معرض خطر میں ڈال دیا ہے۔

یہ گریز اس لئے کرنا پڑا کہ رتن سنگھ کی کہانیوں کے منفرد ذائقہ اور ساخت کو سمجھنے کے لیے ضروری تھا۔ مجھے اکثر محسوس ہوا کہ رتن سنگھ اپنی کہانیوں میں اپنی دھرتی اور تہذیب کے سینے سے لگ کر سفر کرتا ہے۔ خاص طور پر جب پنجاب کی مٹی' اس کا پانی اور ہرے بھرے پودے اس کے دامن سے لپٹ جاتے ہیں۔ اس میدان میں مجھے لگا کہ وہ راجندر سنگھ بیدی اور بلونت سنگھ کا ہم قدم ہی بنا رہتا ہے۔ اگرچہ ان کی سوچ کے دائرے کچھ الگ ہو جاتے ہیں۔ ''پناہ گاہ'' کی اکثر کہانیوں میں اپنی دھرتی سے وابستگی کا یہ عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔

مصنف کی پناہ گاہ راوی کے کنارے بسے ایک گاؤں کے چھوٹے سے مکان کا وہ نیم تاریک کمرہ ہے جسے وہ اچانک ہجرت کے وقت گاؤں میں چھوڑ کر نہیں ساتھ لے کر آیا تھا۔ جب گاؤں کے نمبردار مراد علی نے بتایا کہ سب لوگ فوراً گاؤں چھوڑ کر نکل جاؤ تو گھر کے ہر فرد نے اپنے اپنے ہاتھوں میں سامنے پڑی ضرورت کی کچھ چیزیں اٹھالیں واحد متکلم لکھتا ہے:

> ''.....جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو میں گھبرایا ہوا اس اندھیرے کمرے میں گیا۔ اس کمرے میں بچھے ہوئے پلنگ پر ایک پل کے لئے لیٹا۔ اس کی بو باس کو اپنے وجود میں رچایا اس کی دیواروں کو اپنے گرد کھڑا کیا اور پھر چھت سمیت اسے اٹھا کر جلدی سیڑھیاں اترنے لگا۔ کیونکہ مراد علی اونچی آواز میں مجھے پکار رہا تھا کہ جلدی آؤ۔ چلنے کا وقت ہو گیا ہے''۔

یہ کمرہ ایک حوالہ بن جاتا ہے اس پورے ماحول اور گھر سے واحد متکلم کی وابستگی کا۔ گھر جس میں انسان' جانور یہاں تک کہ سانپ بھی ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ وہ بتاتا ہے:

> ''ہمارے گاؤں میں دوسرے تیسرے سال باڑھ آجاتی تھی راوی کا پانی اپنے کناروں کو توڑ کر ہمارے گاؤں کو جب کالے ناگ کی طرح گھیرتا تو ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا.....
> میں یہ ہولناک منظر دیکھ کر گھر لوٹتا تو اس کمرے میں چھپ جاتا جیسے یقین تھا کہ باڑھ کا پانی اس کمرے کی بلندی تک نہیں پہنچ سکتا۔ جب میرے دل کو ذرا سی دھیرج بندھتی تو ایسے موقعوں پر میں سوچتا کہ کاش اس کمرہ کی دیواریں اتنی بڑی ہو جائیں اتنی بڑی ہو جائیں کہ سارا گاؤں اس میں سمٹ جائے..... سارے مکان سارے کھیت اس کے اندر آکر باڑھ سے محفوظ ہو جائیں''۔

صرف انسان نہیں گاؤں' مکان' کھیت کھلیان سب یکساں طور پر راوی کی محبت اور دردمندی کے دائرہ میں سمٹ آتے ہیں اپنی اس کوٹھری کو وہ سب کی پناہ گاہ بنا دینا چاہتا ہے۔

پناہ گاہ کی پچاس سے زیادہ مختصر کہانیوں کے چھوٹے سے کینوس پر زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو لے کر جو باتیں کہی گئی ہیں وہ اتنی چھوٹی نہیں ہیں۔ ان میں ایک فلسفی کی نہیں ایک گیانی کی بصیرت ہے جو زندگی اور اس کے ماحول کو مثبت انسانی رشتوں کے حوالے سے دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ وہ صوفی اور جوگی کی طرح اردگرد کے مظاہر کو مایا یا محض اعتباری نہیں سمجھتا۔ لذت والم کا گہرا احساس اسے زندگی کی سچائیوں کا عرفان بخشتا ہے لیکن زندگی کا یہ رقص وہ ہمیشہ قدرت کے پھیلے ہوئے آنچل اور آنگن میں ہی دیکھتا ہے۔ اکثر اسے اُن کے اعضا وعناصر بھی انسان کی طرح خوش رنگ اور جاندار دکھائی دیتے ہیں۔ یہ بھی ایک سائنسداں کا نہیں ایک گیانی کا زاویۂ نگاہ ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جو اس کے باطنی تجربہ کے جلال وجمال کو کبھی کبھی الوہیت سے جوڑ دیتی ہے (کہانی ایک لمحہ کا خدا۔ ایک مجذوب کی کہانی)

حرص وہوس کی راہ پر چل کر اور ننگی خواہشوں کی ترغیب پر زرگری کی مشین میں ڈھل کر آج کا انسان قدرت کے گہوارہ سے دور ہو گیا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس بڑھتی ہوئی دوری کے المناک نتائج سے واقفیت کے باوجود اسے کم کرنے کی کوئی کوشش باآور نہیں ہو رہی ہے۔ مہلک امراض کی گرفت انسان کو آکاش بیل کی طرح اپنے آہنی شکنجہ میں کس رہی ہے۔ مغرب ہو یا مشرق اس حقیقت کا شعور عام ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس شعور کا استحصال کرنے کے لیے بڑی بڑی کمپنیاں جڑی بوٹیوں سے بنا کر نئی اور مہنگی دوائیں بازار میں لا رہی ہیں۔ رتن سنگھ نے متعدد کہانیوں میں قدرت کے آغوش سے انسان کی اس دوری کو موضوع بنایا ہے اور بعض بڑی خوبصورت کہانیاں لکھ کر انسان کی اس محرومی کا

احساس دلایا۔''مت جاؤ''ایسی ہی ایک کہانی ہے۔کہانی کا تمثیلی اسلوب بے حد معنی خیز ہے۔ جہاں نہ صرف جنگل کے جاندار اور پودے بلکہ دھوپ اور سایہ بھی انسانوں کی طرح احساس اور گویائی سے متصف ہیں۔کہانی کا ہیرو حسب عادت سیر کرتا ہوا بانسوں کے گھنے جنگل میں داخل ہو کر خشک پتوں کے بستر پر لیٹ جاتا ہے یہ اس کا معمول ہے۔شروع میں کچھ کانٹے دار جھاڑیاں اس کا راستہ روکتی ہیں لیکن دھیرے دھیرے وہ بھی اپنے مہمان سے مانوس ہو جاتی ہیں۔بیانیہ کی دھیمی دھیمی فضا قاری کو اپنے سحر کی گرفت میں لے لیتی ہے۔

''لمبے لمبے سانس لینے کے بعد جب میں اپنے پتھر کے تکیے پر سر ٹکا کر لیٹ گیا تو دیکھا کہ دھوپ کی دو تین چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں پتہ نہیں اس گھنے جنگل کے کون سے ٹیڑھے راستوں سے ہوتی ہوئی میرے پاس آ کر بیٹھ گئی تھیں''۔

''تم کب آئیں؟''میں نے دھوپ سے پوچھا

''بس یہ ابھی ابھی آئی ہے''۔میرے اردگرد پھیلے ہوئے سایے نے دھوپ کے آنے پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

دو منظر اور دیکھئے۔

''پتہ نہیں کب تک میں اس حیران کن منظر کو دیکھتا اپنے آپ میں کھویا رہتا کہ شبنم کا ایک قطرہ امرت کی بوند بن کر میرے ماتھے پر آ ٹپکا۔پھر کچھ اور بوندیں میرے وجود پر ٹپکیں اور مجھے ایسا لگا جیسے قدرت مہربان ہو کر مجھ پر امرت کی بارش کر رہی ہو۔مجھے لگا جیسے میرا وجود سرشار ہو رہا ہو۔ایک ٹھنڈک تھی جو میرے جسم میں اتر رہی تھی..... ایک وجد تھا جو میرے پورے احساس پر چھایا ہوا تھا۔ایک خوشبو تھی جو مجھے اپنے اندر سمیٹے کسی انوکھی دنیا میں لئے جا رہی تھی''۔

''بوڑھے تیتر نے پر پھڑ پھڑائے تو مجھے ایسا لگا جیسے بانسوں کے جھنڈ میں موجود سناٹے نے مجھے اپنی موجودگی کا احساس دلایا ہو۔یوں اس سناٹے کی آواز کو میں نے اس جھنڈ میں اکثر سنا ہے۔اکثر یہ سناٹا اپنے خاموش قدموں سے چل کر میرے پاس آتا ہے۔مجھ سے باتیں کرتا ہے۔اس خاموش سناٹے نے کتنی ہی خاموش کہانیاں مجھے سنائی ہیں۔ کتنی ہی درد بھری۔آنسوؤں سے بھیگی ہوئی کہانیاں مجھ سے سنی ہیں''۔

بے شک ان پیکروں میں شعری زبان نے جان ڈال دی ہے۔ لیکن اس میں محض رومانوی تخیل کی کارفرمائی نہیں ہے۔اس کے پیچھے آج کے انسان کی کھوکھلی زندگی کے تئیں تڑپ ہے سوچ ہے۔یہ گیان اور اعتماد ہے کہ اس صارفی مشینی دور میں بھی قدرت انسان کو راحت بخش سکتی ہے۔شرط یہ ہے کہ انسان خوشدلی اور محبت سے اس کی طرف بڑھے۔اس کہانی کا عنوان اور انجام معنی خیز ہیں۔جو قدرت سے انسان کی ازلی رشتہ کی گواہی دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ قدرت بظاہر سبزۂ بیگانہ نظر آتی ہے لیکن فی الحقیقت وہ بھی انسان کے لمس اور پیار کو ترستی ہے آخری سطریں دیکھئے:

''جھنڈ سے باہر آتے ہوئے کانٹے دار جھاڑی کی وہ ٹہنی جو جھنڈ کے اندر آنے سے منع کرنے کے لیے روز میرا راستہ روک کر کھڑی ہو جایا کرتی ہے وہ میرا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی ہے۔

کہتی ہے.....''مت جاؤ''۔

رتن سنگھ کو ریڈیو پر اپنے منصبی کاموں کو انجام دیتے ہوئے' مدھیہ پردیش کے آدی باسی علاقوں میں بھی رہنے کا موقع ملا ہے اور جیسا کہ انہوں نے مجھے بتایا کئی بار خطرہ مول لے کر وہ دور دور تک گہرے گھنے جنگلوں میں آدی باسی قبائل کے رہن سہن اور رسم و رواج کو دیکھنے گئے۔

''جنگل اداس ہے''اور''ٹھہرا ہوا لمحہ''جیسی کہانیوں میں بھی ان کے ان تجربات کا عکس ملتا ہے۔یہاں بھی انہوں نے جنگل اس کے جانوروں' رنگا رنگ پرندوں' بدلتے موسموں اور انسانوں کے درمیان ہم آہنگی اور بقائے باہم کے قدیم رشتوں کو بڑی ہنرمندی سے جھلکایا ہے۔ان کہانیوں کا مناسب تجزیہ رتن سنگھ کے تخلیقی اسلوب اور ان کی کہانیوں کے منفرد کردار کی تفہیم میں بڑی مدد کر سکتا ہے۔

آدی باسیوں کے ساتھ قدرت کے ایک جوشیلے رقص کے بعد کہانی کار کہتا ہے:

''ناچتے ناچتے قدرت کا من بھر گیا تو کائنات کا یہ ناچ بھی تھم گیا۔ سرسراتی ہوا پیڑوں کی ٹہنیوں پر بیٹھ کر آرام کرنے لگی۔ٹہنیاں بھی ہل جل نہیں رہی تھیں تا کہ ہوا کے آرام میں خلل نہ پڑے۔دور آسمان پر بادلوں کی گھٹا اب پھیکی سی ہو کر سارے افق پر چت لیٹی تھی..... کچھ وقت گزرنے کے بعد ہوا پھر مدھم چلنے لگی تو جیسے سارا جنگل انگڑائی لے کر جاگنے لگا۔ٹہنیوں کے بیچ سے سرسراتی ہوا نے جیسے ایک نغمہ چپکے سے چھیڑ دیا۔جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہوا سارے جنگل میں ایک لطیف سی میٹھی آواز پیدا کر رہا تھا۔جیسے دریا کی لہریں آپس میں ٹکراتی ہوئی گنگناتی ہیں۔اس نغمے کو سن کر پکشی بھی چہچہا اٹھے تھے۔اور ان کے مدھر سنگیت کو سن کر آدی باسیوں کی ٹولی کے کچھ لوگ اٹھ کر بیٹھ گئے تھے اور باقی لیٹے ہی لیٹے آنکھیں کھولے ٹانگیں پسارے کسمسا رہے تھے۔جہاں یہ آدی باسی بیٹھے تھے وہاں ان کے قریب سے ایک شیر دھیرے دھیرے چلتا ہوا اور ان آدی باسیوں کی بو کو سونگھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔تبھی ایک ہرن آدی باسیوں کے پاس سے ہوتا ہوا ادھر کو جانے لگا جدھر شیر گیا تھا تو ایک آدی باسی نے ذرا سا ہاتھ بڑھا کر ہرن کی ٹانگ پکڑ لی۔

''ادھر کہاں جاتا ہے۔تیرا باپ ابھی ابھی اُدھر گیا ہے۔اس نے دیکھ لیا تو کچا چبا جائے گا''۔

یہ کہتے ہوئے اس نے ہرن کا منہ دوسری طرف کر کے چھوڑ دیا۔ لیٹے لیٹے ہی ایک آدی باسی کی نظر ایک پیڑ کی ٹہنی پڑ گئی اُس ٹہنی کو اپنے بلوں میں جکڑے ہوئے ایک بہت بڑا سانپ اپنے سر کو ادھر اُدھر جھلاتا ہوا مستی کے عالم میں جھوم رہا تھا۔ اس سانپ کو دیکھتے ہیں ایک آدی باسی نے تیر کمان سنبھالیا تو دوسرے آدی باسی نے اس کے نشانے کو بھانپتے ہوئے اسے تیر چلانے سے منع کر دیا۔

''جو اپنی طرف بری نظر سے نہ دیکھے اس پر تیر چلانے سے پاپ لگتا ہے''۔

رتن سنگھ کی اکثر و بیشتر کہانیاں ایک ہمہ داں راوی کے ذہن اور زبان سے بیان ہوئی ہیں۔ متعدد کہانیوں میں راوی خود ایک کردار بھی بن جاتا ہے لیکن اکثر وہ راوی ہی بنا رہتا ہے۔ البتہ اپنے بیانیہ کو قاری کے لیے پرکشش بنائے رکھنے کے لیے وہ طرح طرح کی تدبیریں کرتا ہے۔ بے جان اشیاء اور حیوانوں کو انسانی صفات سے متصف کر کے وہ صرف تمثیل کا روایتی روپ نہیں ابھارتا بلکہ اس طرح وہ انسانی سیرتوں کو اپنے ماحول کے تفاعل میں دکھا کر آخر آخر کوئی پیغام ضرور دیتا ہے جیسے ''گریا کی ڈالی'' یا ''دنت کتھا''۔ فطاسیے بھی رتن سنگھ کی کہانیوں کی اندرونی بافت کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ یہاں لوک راویتوں' لوک گیتوں سے بھی وہ کام لیتا ہے جیسے مجذوب کی کہانی یا تلاش ایک بالی کی۔ پنجاب اور وسطی ہندوستان کے لوک قصّوں اور دیومالائی حکایتوں نے بھی کہیں کہیں رنگ بھرا ہے۔ مثال کے طور پر سیالکوٹ کا لاڑا۔ انجان وادی اور دیوار جیسی کہانیاں۔ آخر الذکر کہانی میں دو بھائیوں کے جھگڑوں کی وجہ سے ان کی آبائی حویلی کا دو حصّوں میں تقسیم ہو جانا ہے۔ کہانی میں چھوٹے چھوٹے واقعات کی کڑیوں کو اس ہنرمندی سے جوڑا گیا ہے کہ پوری کہانی برصغیر ہندو پاک کی تقسیم کا علامیہ بن جاتی ہے۔ اس سلسلہ کی ایک نہایت موثر اور مکمل کہانی ''بیسویں صدی کا صدر بازار'' ہے۔ کہانی کا بے نام ہیرو جو بے روزگار اور مفلوک الحال ہے۔ اپنی پسند کی ایک حسینہ کو لے کر جب بازار میں نکلتا ہے تو دیکھتا ہے کہ مکانات' ملبوسات خوبصورت زیورات اور فرنیچر ہر شے اس کی قوت خرید سے باہر ہے۔ وہ دل مسوس کر رہ جاتا ہے۔ اس کا وجود لہولہان ہے۔ آخر میں ایک دوکان دار کھٹکے سے کھلنے والا ایک چاقو اسے دکھاتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے آگے بجلیاں سی کوند جاتی ہیں۔ وہ اسے خرید لیتا ہے۔ کہانی کی آخری سطریں دیکھئے:

''اور پھر یہ ہوا کہ خوبصورت کپڑے پہنے' قیمتی زیورات سے لدی پھندی اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ جب وہ اپنے نئے گھر میں داخل ہوا تو اس کا ہر گوشہ بازار کی ایک سے ایک خوبصورت چیزوں سے آراستہ تھا''۔

یہ ہے اس عہد کی بھیانک سچائی۔ غیر مساوی' پست و بلند سماج میں خواہشیں تو فطری طور پر جنم لیتی ہیں اور اگر ان کی آسودگی کا کوئی جائز راستہ دکھائی نہ دے تو دھاردار چاقو ہی ان کی تکمیل میں ضمانت دیتا ہے اسی لئے رتن سنگھ سرگوشی میں سہی' اپنی کہانیوں میں صاف کہتا ہے کہ میرا موضوع حیات مابعد نہیں یہی زمین اور یہی زندگی ہے۔ وہ کشف و کرامات' روحانی فتوحات اور رواجی اخلاقی پابندیوں پر بھی یقین نہیں رکھتا۔ لیکن وہ خواب ضرور دیکھتا ہے۔ اپنی دھرتی پر ایک ایسے منصفانہ معاشرہ کے جس میں انسان' استحصال اور ہر طرح کے فرق و امتیاز اور جبر و تشدد سے آزاد اور پاک ہو۔ جہاں اس کی فطری ضرورتیں اور خواہشیں پوری ہو سکیں اور جس میں رہ کر انسان مہربان قدرت کی نعمتوں سے اپنے وجود کو شاد کام کر سکے۔ ''پناہ گاہ'' کی بے شمار کہانیوں میں اسی متوازن لیکن حقیقت پسندانہ سوچ کے دریچے کھلتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک کہانی کی نشان دہی ضرور کروں گا جسے افسانہ نگار نے ایک سوال کی صورت میں قارئین کے سامنے رکھا ہے۔ وہ ہے ''حد سے گزر جانے کے بعد'' کہانی میں ایک عورت جو اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ سکون سے زندگی بسر کرتی ہے۔ اچانک ایک دن بغیر کسی خاص تحریک خواہش یا لالچ کے اپنے جیٹھ سے جنسی رشتہ قائم کر لیتی ہے۔

وہ خود لیٹی لیٹی جیٹھ کے اتنے قریب چلی گئی یا وہ اس کے قریب آ گیا کہ اس کے جسم سے نکلتی رنگ و روغن کی ساری بدبو اس کے جسم میں منتقل ہو گئی۔ دو دن ہو گئے ایک تو وہ اپنے تن بدن سے اس بدبو کو چھڑا نہیں پا رہی اور پھر اوپر سے اڑوسنوں پڑوسنوں کی کھا جانے والی نظریں.....'' لیکن وہ اپنے فعل پر شرمندہ نہیں ہے۔ وہ پڑوسی عورتوں کے پاس سے گزرتے ہوئے کہتی ہے ''یہ کیا کھسر پسر لگا رکھی ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اپنے شوہر کے بھائی کے ساتھ کیا ہے تمہارا تو کچھ نہیں لیا ہے''۔ کچھ دیر بعد جب وہ ایک پیاسے مزدور کو شربت پلاتی ہے تو شربت پلاتے ہوئے اسے بڑا اچھا لگ رہا تھا۔ مزدور غٹ غٹ شربت پی رہا تھا اور وہ ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے اس کی ٹھنڈک کہیں اس کے اندر بھی اترتی جا رہی ہے' دراصل اس کا جیٹھ بچوں اور بیوی کے بغیر مجرد زندگی بسر کر رہا تھا۔ پیاسے مزدور کو شربت پلانے اور اس کی تسکین اور ٹھنڈک کو خود اپنے اندر محسوس کرنے کے واقعہ سے یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ اس دردمند عورت نے اپنے جیٹھ کی عمر بھر کی جنسی تشنگی کو مٹانے کے لیے اس سے ہم بستری کی۔ اور اس لئے اسے اپنے اس اضطراری عمل پر پچھتاوا نہیں۔ تاہم آخر میں جب اس عورت کا جیٹھ اس کے کمرہ میں آتا ہے تو وہ جھٹ سے گھونگھٹ نکال لیتی ہے اور کہتی ہے ''جی آپ ڈیوڑھی میں ہی بیٹھا کریں آپ کا کھانا میں وہیں بھجوا دیا کروں گی''۔ افسانہ نگار یہی سمجھتا ہے کہ اس فعل کی تکرار یا تسلسل ایک غیر اخلاقی یا غیر سماجی عمل ہوگا۔ پریم چند اور شرت چندر نے بھی EXTRA MARITAL رشتوں پر کہانیاں لکھی ہیں۔ وہاں بھی ترغیب اور تحریک عورت کی طرف سے ہوتی ہے۔ اور دونوں فنکار عورتوں کے اقدام کو غلط نہیں ٹھہراتے۔ فرق اتنا ہے کہ وہاں عورت اپنی جنسی آسودگی کے لیے قدم اٹھاتی ہے جب کہ رتن سنگھ کا کردار ایک جنسی فاقہ کش کی پیاس بجھاتا ہے۔ اس سچائی کی حکمت ایک سچا گیانی ہی جانتا ہے۔

''سنگ کے سینے میں پھول کا جلوہ''

شارب ردولوی
(لکھنؤ، بھارت)

رتن سنگھ داستانوں کے دیس پنجاب سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی لیکن ہزاروں لوگوں کی طرح انھیں بھی تقسیم ملک کے بعد دربدری کا سامنا کرنا پڑا اور نہ جانے کس طرح وہ لکھنؤ پہنچ گئے۔ لکھنؤ اُس وقت ترقی پسند ادبی تحریک اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ اور احتشام حسین، آل احمد سرور، سجاد ظہیر، حیات اللہ انصاری، علی عباس حسینی، اثر لکھنوی، سراج لکھنوی، مسیح الحسن، رضیہ سجاد ظہیر جیسے ادیبوں، شاعروں اور افسانہ نگاروں سے چھلک رہا تھا، انہیں کے زیر سایہ رتن سنگھ کی ذہنی تربیت ہوئی اور یہیں ان کے اندر سے افسانہ نگاری کا انکر پھوٹا۔ لکھنؤ کا وہ زمانہ بھی تخلیقی ادب کا سنہرا دور تھا۔ اس زمانے نے اردو کو ایسے افسانہ نگار دیئے جن کے قلم نے اردو افسانے کو وقار و اعتبار بخشا جن میں قاضی عبدالستار، مسیح الحسن، رام لعل، نیّر مسعود، عابد سہیل، منظر سلیم، اقبال مجید، قیصر تمکین، رتن سنگھ اور آغا سہیل کو کون فراموش کر سکتا ہے۔ کسی ایک شہر نے کسی ایک زمانے میں اتنے قابلِ قدر افسانہ نگار نہیں دیئے ہونگے ایسا لگتا ہے کہ لکھنؤ اس زمانے میں افسانوں کا شہر بن گیا تھا۔ داستان گوئی کی روایت جدید افسانے کی شکل ہی اس عہد میں جس طرح فروغ پائی پھر کبھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا۔

رتن سنگھ کی قصہ گوئی کی تربیت اِس نرم و نازک تہذیبی شہر میں ضرور ہوئی لیکن ان کے تحت الشعور میں رنگین پگڑیوں، لہراتے دوپٹوں، کھنکتی چوڑیوں، بھنگڑا اور گدّا کا تیز رفتار زندگی سے بھرپور رقص کہیں نہ کہیں بسا رہا جو انجانے میں ان کے قلم کو لے کر اس خوبصورت دنیا میں چلا جاتا ہے جس کے بارے میں ایک جگہ خود انھوں نے لکھا ہے:

> ''ایک دھرتی میرے سپنے میں کبھی کبھی آ جاتی ہے
> جس کی ایک لطیف جھلک دیکھ لینے سے میری روح پر نشے کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے..... سپنے میں اس دھرتی پر پاگلوں کی طرح گھومتا ہوں۔
> پیڑوں کو بانہوں میں لے کر گلے سے لگاتا ہوں۔
> اور ٹوٹی ہوئی دیوار کو چومتا ہوں۔ (دربدری صفحہ 45,46)

اسی طرح رتن سنگھ کی سانسوں میں وہ خوشبو بسی رہی۔ رتن سنگھ کا افسانوں کا پہلا مجموعہ ''پہلی آواز'' 1969 میں دوسرا مجموعہ ''پنجرے کا آدمی'' 1973 میں تیسرا ''کاٹھ کا گھوڑا'' 1993 میں چوتھا ''پناہ گاہ'' 2000 اور پانچواں ''پانی پر لکھا نام'' 2008 میں شائع ہوا۔ 1986 میں ''دربدری'' جو ان کی زندگی کی المناکی کی داستان ہے شائع ہو چکی تھی جسکی حیثیت ان کی ہجرت اور لکھنؤ و بھوپال کی سرگذشت کی ہے جسکی ابتدا میں فارسی کا یہ شعر درج ہے۔

آں را کہ ملک نیست ہمہ ملک جائے اوست
درویش ہر کجا کہ شب آید سرائے اوست

اور یہی درویشی ان کی زندگی اور فکر کا حصہ بن گئی۔

رتن سنگھ نے ''پہلی آواز'' کی اشاعت سے پہلے ہی ترقی پسند نوجوانوں میں اپنی ایک جگہ بنالی تھی اور ''ہادی'' پر ان کے افسانے نے انھیں اپنے ہم عمر لکھنے والوں میں نمایاں کر دیا تھا۔ اس وقت کے لکھنؤ میں ہادی کی بڑی اہمیت تھی۔ نوری ہوٹل، امین آباد میں وہ روز شام کو آ کر بیٹھ جاتے اور ان کے اِرد گرد فٹ بال اور کرکٹ کے نوجوان کھلاڑی جمع ہوتے جاتے۔ چائے کا دور چلتا تھا۔ یہ گروپ ہوٹل کے ہال میں بیٹھنے کے بجائے عام طور پر صحن میں بیٹھتا تھا اس لیے وہاں میز کے گرد کرسیوں کی گنجائش زیادہ تھی دوسرے ان کی گفتگو میں کوئی مُخل نہیں ہوتا تھا۔ یہ محفل شام تک جمع رہتی تھوڑی تھوڑی دیر میں نوری کے مشہور ''بیرے'' ناظم کو پکارنے کی آواز آتی ناظم کو معلوم تھا کہ کوئی نیا آدمی آیا ہوگا۔ وہ ایک گلاس پانی اور ضرورت ہوئی تو کرسی پہنچا دیتا۔ پھر کوئی چائے کا آرڈر دیتا کباب بھی منگائے جاتے ہادی سب کے آرڈر میں شامل رہتے۔ رتن سنگھ نے جب ہادی پر افسانہ لکھا اور ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں پڑھا تو بہت تعریف ہوئی۔ اس سے پہلے بھی لوگ رتن سنگھ کے افسانے پسند کرتے تھے ان کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ بہت مختصر افسانے لکھتے ہیں ان کے افسانوں میں نہ کوئی گھماؤ ہوتا تھا اور نہ وہ جان بوجھ کر اس میں کسی نقطۂ نظر کو ابھارنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ افسانہ لکھتے تھے جو ان کے اندر کی آواز تھی اور یہ صورت آج بھی باقی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی تحریکات کے نشیب و فراز کا ان کی تحریر پر کوئی بُرا اثر نہیں دکھائی دیتا۔

رتن سنگھ کے افسانوں میں تین باتیں خاص طور پر اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اول انسانی نفسیات پر ان کی گہری نگاہ دوسرے انسان دوستی اور روشن خیالی تیسرے زندگی سے ان کا تعلق۔ ان کے افسانوں کا کینوس بہت وسیع ہے اس لئے کہ ان کا پس منظر اودھ بھی ہے اور پنجاب بھی اور دونوں تہذیبوں کی جلوہ گری ان کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔

رتن سنگھ کے افسانوں کو رومانیت اور ترقی پسندی کے خانوں میں تقسیم کرنا مشکل ہے۔ حالانکہ جس عہد میں انھوں نے افسانے لکھنے شروع کیے اس زمانے میں یہی دونوں اثرات اردو افسانے پر حاوی تھے اس وقت کے بزرگ افسانہ نگاروں میں نیاز فتحپوری، مجنوں گورکھپوری، علی عباس حسینی وغیرہ رومانی افسانہ نگار ہی تھے۔ حیات اللہ انصاری، کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، رضیہ سجاد ظہیر، مسیح الحسن وغیرہ کے یہاں ترقی پسند اور رومانیت کے ملے جلے

اثرات تھے۔ رتن سنگھ بنیادی طور پر ترقی پسند ہیں لیکن انھوں نے کہانی کو عصری تقاضوں اور بدلتی ہوئی قدروں کے ساتھ کچھ اپنے ڈھنگ سے برتنے کی کوشش کی۔ رتن سنگھ کی شخصیت میں مجھے تصوف کا خمیر نظر آتا ہے۔ وہ سارے عالم کے دکھ کو اپنے اندر لے لینا چاہتے ہیں۔ ان دکھوں کے ساتھ جینے اور ان سے انسانیت کو نجات دلانے کا تصور ان کی کہانیوں میں رچا بسا نظر آتا ہے۔ ان کے مجموعے ''پنجرے کا آدمی'' کے دیباچے 'میری کہانی' کے ایک اقتباس سے رتن سنگھ اور ان کی کہانیوں کے اندر سانس لیتی ہوئی زندگی کو بہتر طریقے پر سمجھا جاسکتا ہے۔

> ''ہزاروں سال کے وقت کی طویل پگڈنڈی پر میں نے اپنے آپ کو ہر موڑ' ہر مقام پر پایا۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ میں جنگلوں کی خارزار راہوں سے لہولہان گزر رہا ہوں۔۔۔۔ تپسیا کر رہا ہوں، کہیں الہام سن رہا ہوں۔۔۔۔ کہیں قتل ہو رہا ہوں، کہیں زہر پی رہا ہوں۔ جب زہر مری رگوں میں تحلیل ہونے لگتا ہے اور جان ٹوٹنے لگتی ہے تو ایسا لگتا ہے کہ ہزاروں لاکھوں سال سے پیدا ہونے والے کڑوروں انسان کا مجموعی درد میرے وجود پر چھا جاتا ہے۔ میرے اندر سمو جاتا ہے اور میری روح کی درد بھری آواز سٹپٹاتی ہوئی ساری کائنات کو انسانی درد کی کہانی سنانے لگتی ہے۔
>
> (پنجرے کا آدمی صفحہ 9)

یہ انسانی درد کی کہانی رتن سنگھ کے افسانوں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ان کی ہر جگہ یہی کوشش رہتی ہے کہ وہ اس درد کا درماں تلاش کر سکیں وہ جانتے ہیں کہ ہر شخص ازل سے کرب میں مبتلا ہے۔ اپنی ایک کہانی ''ناف کا درد'' میں انھوں نے اسی کرب کا احساس دلانے کی کوشش کی ہے لیکن ان کے یہاں کرب کا یہ احساس انفرادی نہیں ہے حالانکہ ''ناف کا درد'' ہر ایک کا اپنا درد ہے۔ رتن سنگھ نے اسے علامت کے طور پر استعمال کیا ہے انسان پیدائش کے بعد ناف کاٹ کر ماں سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے۔ اور پہلی بار وہ اس کرب کو محسوس کرتا ہے جو کسی رشتے کے ٹوٹنے اور کسی سے الگ ہو جانے سے ہوتا ہے عیشا اور اس کے درمیان جب آگ اور خون کا دریا حائل ہو گیا اس وقت بھی اس نے ناف میں شدید درد محسوس کیا تھا۔ رتن سنگھ کے یہاں یہ انفرادی کرب انفرادی نہیں رہتا وہ ہر جگہ زندگی کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں:

> ''اسی طرح میں ایک روز ناف کے درد سے تڑپ رہا تھا کہ مجھ سے میرے دل نے کہا کہ تم ناف کے درد سے تڑپا نہ کرو اس زمین پر رشتوں کا ٹوٹنا لازمی ہے۔۔۔۔ تھوڑی دیر رک کر غالباً میرے درد کو محسوس کرتے ہوئے وہ بولا اس دنیا میں ہر آدمی کی ناف کٹی ہے۔ ہر آدمی زندگی سے کٹا ہے اور ہر آدمی کے ناف کا درد ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے احساس نہ ہونے پائے۔
>
> میں نے کہا جس آدمی کے درد ہوتا ہے اسے دوسروں کے درد کا احساس ہوتا ہے؟ اگر اس دنیا میں سب کی ناف کٹی ہے تو سب ایک دوسرے کے ہو جائیں ایک دوسرے کے دکھ درد کو بانٹیں لیکن ایسا نہیں ہوتا۔۔۔۔''
>
> (ناف کا درد ''پنجرے کا آدمی'' ص 20-19)

رتن سنگھ کا مسئلہ یہی ہے کہ آخر جب ہر آدمی ایک تکلیف میں مبتلا ہے تو وہ دوسرے کے درد کو کیوں محسوس نہیں کرتا اگر وہ دوسرے کے درد کو اس طرح محسوس کرنے لگے جس طرح وہ اپنے درد کو محسوس کرتا ہے تو دنیا محبت سے بھر جائے کوئی کسی کا دشمن نہ رہے اور کسی کو اپنی عیشا سے علیحدہ نہ ہونا پڑے۔ یہ کہانی زندگی کے ایسے کا ایک تخلیقی احساس ہے جس میں تقسیم ملک کے سانحے کا اشارہ ہی نہیں آج کی زندگی کے ٹوٹنے اور بکھرنے کی کہانی چھپی ہوئی ہے۔

''پہلی آواز'' رتن سنگھ کی ایک ایسی کہانی ہے جو آج بھی ہمارے سامنے سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے۔ یہ ایک ایسے لڑکے کی کہانی ہے جسے ہم روز بازاروں' اسٹیشن کے پلیٹ فارموں اور ٹرین کے ڈبوں میں دیکھتے ہیں جو کبھی جھوٹے ٹکڑے اور کبھی صرف لوگوں کی دھتکار کھا کر کسی دوکان یا اسٹیشن کے کسی کونے میں سو جاتا ہے۔ رتن سنگھ نے بہت خاموشی سے اس کہانی کو اس طرح کی ہمدردانہ فضا سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کہانی ان کی شروع کی کہانیوں میں ہے اور اس کا ذکر میں نے اس لیے خاص طور پر کیا کہ رتن سنگھ کی کہانیاں صرف وہی نہیں ہوتیں جو بظاہر الفاظ میں بیان ہوتی ہیں بلکہ ان کا اصل رنگ ان کے بین السطور میں ہوتا ہے۔ اس کہانی کے منّا کو جس سے ہمارے ملک کا کوئی بازار اور کوئی بھی اسٹیشن آج بھی خالی نہیں ہے۔ ایک دن ایک پولس والا پکڑ لیتا ہے اور اسٹیشن ماسٹر کے یہاں زبردستی خس کی ٹٹیوں پر پانی چھڑکنے کے لیے رکھوا دیتا ہے۔ اس سے منّا کو تکلیف تو ہوئی لیکن جس دن اسے اس کام کی مزدوری کے دس روپئے ملے اور وہ اسے مٹھی میں دبا کر باہر نکلا تو اسکا انداز بدلا ہوا تھا:

> ''اس کے چہرے پر انجانی سی خوشی کے آثار نمودار ہوئے اور پھر وہ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ آم خریدنے کے لیے بھاگنے لگا۔ بھاگتے ہوئے وہ یوں محسوس کر رہا تھا کہ جیسے اس کے قدم زمین پر نہ پڑ رہے ہوں۔''
>
> (پہلی آواز صفحہ 16)

رتن سنگھ نے بغیر کچھ کہے ایک بہت اہم سماجی مسئلہ کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے جو کہانی کے مقصد کی شکل میں کہیں محسوس نہیں ہوتا۔ لیکن اپنی محنت سے کمائے ہوئے روپیوں کو پا کر منّا کو جس خوشی' اعتماد اور عزت نفس کا احساس ہوتا ہے یا کسی چیز کو خود خرید پانے کو جو ناقابلِ بیان مسرت وہ محسوس کرتا ہے وہ آخری سطروں میں ایک اشارہ ضرور چھوڑ جاتی ہے۔

یہی انسانی درد و غم سے ہمدردی' محبت' انہیں خوش دیکھنے کی تمنا رتن

سنگھ کی کہانیوں کا بنیادی موضوع ہے۔ میں نے لکھا ہے کہ وہ مزاجاً صوفی ہیں جو سب کا دکھ اپنے اندر اتار لینا چاہتا ہے۔ سب کے دکھوں کو اپنے اندر بسا کر دوسروں کو خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ ''منکر'' بھی ان کی اسی طرح کی کہانی ہے۔ یہ کہانی بھی واحد متکلم میں ہے یعنی راوی خود اسکا بنیادی کردار ہے۔ اس کہانی میں رتن سنگھ نے مذہبی حوالوں سے کام لیا ہے۔ اس کہانی کا راوی ایک ازلی شخص ہے۔ جو کرشن بھی تھا رام بھی۔ عیسیٰ بھی اور محمد بھی۔ یہ تمام مذہبی رہنما اور پیغمبر انسانیت کو غم و آلام سے چھٹکارا دلانے کے لیے آئے لیکن آج بھی چورا ہے پر انسانوں کی بھڑیں میں بھیک مانگنے والا فقر موجود ہے۔ اس کا کاسہ آج تک کیوں نہیں بھرا۔ اس کے درد کا درماں کیوں نہیں ہو پایا۔ اس لیے وہ سب سے انکار کر دیتا ہے:

''اب دنیا چاہے مجھے منکر ہی سمجھ لے۔ زیادہ سے زیادہ مجھے ایک مرتبہ اور کوئی سزا دے گی اور کیا کرے گی۔ میں سب سزائیں بھگت چکا ہوں۔

(منکر ''پنجرے کا آدمی'' صفحہ 24)

رتن سنگھ کی گرفت بیانیہ پر بہت اچھی ہے۔ وہ ایک سادہ قصہ گو بھی نہیں ہیں جو صرف داستان طرازی کے لیے لکھتے ہوں ان کی کہانیاں اساطیری انداز لیے ہوں یا علامتی ان کی گہری عصری حسیت ہر جگہ نظر آتی ہے۔ ان کی کہانیاں مختصر ضرور ہیں لیکن ان کے اندر ایک وسیع دنیا آباد ہے۔ ذرا سی توجہ سے جسکی جھلک دکھائی دینے لگتی ہے ''بیتے وقت کی ایک کہانی'' میں وہ لاکھوں سال کا سفر کرتے ہیں اور نہ جانے کتنے اندھیرے ''یگوں'' کا سفر کر کے وہ ایک ایسے جنگل میں پہنچ جاتے ہیں جہاں کھلا آسمان' لہریں لیتے ہوئے شفاف پانی کے دریا اور درختوں پر چہچہاتی چڑیوں کے غول ہیں اور ایک آدمی اپنے نوجوان بیٹے کو شکار کے گُر سمجھا رہا ہے۔ شاید وہ پہلی بار شکار کرنے جا رہا ہے:

''۔۔۔۔ دیکھو ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی ہرن کو کوئی ہرنی اچھی لگتی ہے تو اسے اسکے جسم سے بھینی بھینی خوشبو آتی ہے اور جیسے جیسے یہ خوشبو اس کے حواص پر چھاتی جاتی ہے ویسے ویسے ہرن اپنی سدھ بدھ کھوتا جاتا ہے۔۔۔۔ یہی موقع ہوتا ہے جب ہرن کو تیر کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے''

(''پناہ گاہ'' صفحہ 216)

لڑکا اس گُر کو سیکھ جاتا ہے لیکن جب ایک موقع پر وہ ایک ہرن کو اسی دیوانگی میں ہرنی کی خوشبو میں محو اسکے قریب دیکھتا ہے تو فوراً کمان میں تیر جوڑ کر نشانہ لگاتا ہے لیکن اس سے قبل کہ کھنچی ہوئی کمان سے تیر چھوٹے وہ اپنے بازو ڈھیلے کر دیتا ہے اور کمان کو نیچے جھکا دیتا ہے، وہ لڑکی جسکی خوشبو ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کے اپنے وجود پر چھائی ہوئی تھی اس کے قریب آ کر پوچھتی ہے:

''۔۔۔۔ تیر چلایا کیوں نہیں۔۔۔۔ دھت، پیار کرنے والوں کو کہیں کوئی تیر مارتا ہے۔ یہ الفاظ لڑکے کے منہ سے نکلے اور ہوا نے ان لفظوں کی خوشبو کو الہام کے طور پر لیا تو جیسے اندھیرے دور میں روشنی سی جگمگا اٹھی۔۔۔۔ اس روشنی کو لے کر وقت کے تمام اندھیروں کو چیرتا ہوا میں واپس آج کے یگ میں آ تو گیا ہوں لیکن کوئی بتائے کہ میں اسے کہاں رکھوں تا کہ اس روشنی سے لوگوں کے دل جگمگا اٹھیں''۔

(بیتے وقت کی کہانی ''پناہ گاہ'' صفحہ 218)

رتن سنگھ کے افسانے پڑھتے وقت مجھے ایک بات کا خیال آتا ہے کہ ان کے یہاں بار بار جنگل' پہاڑ اور یگوں کے سفر کا ذکر آتا ہے۔ ان کے افسانوں میں یہ بات نسلی لاشعور Collective Unconcous کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ''بیتے وقت کی کہانی'' ہو یا ''ناف کا درد' یا میری کہانی' یا ''ایک گاتھا'' یا ''جنگل اداس ہے'' وغیرہ ان کی بہت سی کہانیوں کا رشتہ میتھ اور جنگل سے سے جڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ بڑے انہماک اور تفصیل سے ان کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ بار بار ان یگوں کا سفر کرتے ہیں۔ پہاڑ اور جنگل ان کے تحت الشعور کا حصہ بن گئے ہیں۔ اس طرح اگر ان کی کہانیوں کا نفسیاتی مطالعہ کیا جائے تو بعض دلچسپ نتائج سامنے آ سکتے ہیں۔ ان کے یہاں ایک روحانی سفر کا بھی تصور ملتا ہے جو اچھائی' محبت اور خیر کے لیے سرگرداں ہے۔ رتن سنگھ اپنی کئی کہانیوں میں اس سفر سے گزرتے ہیں۔ ایک مجذوب کی کہانی' ہمیں جنگلوں میں تو نہیں لے جاتی لیکن اس میں کیفیت کچھ اس طرح کی پائی جاتی ہے۔

رتن سنگھ کی اکثر کہانیوں میں ان کا یہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے وہ کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ پاتے، غالبؔ کی طرح ایک سوت کی ڈوری، لوٹا اور شطرنجی لے کر وہ ایسی جگہ چلے جانے کی تمنا تو نہیں کرتے جہاں کوئی بھوکا، ننگا نظر نہ آئے لیکن یہ ضرور چاہتے ہیں کہ سب کو ایک ایسا کمرہ مل جائے جہاں وہ ہر مصیبت میں اپنا سر چھپا سکیں۔

''پناہ گاہ'' یوں تو ایک سادہ سی کہانی ہے، ایک اجڑے خاندان کی جو کبھی راوی کے کنارے آباد تھا اور اپنی زمین، جائیداد اور کھیتوں کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کے باوجود جب راوی کا مزاج بگڑتا تو وہ اپنے کنارے توڑ کر پورے گاؤں میں پھیل جاتی اور بہت سے کچے اور پرانے مکانوں کو زمین بوس کر دیتی لیکن اس کے مکان کا ایک تنگ و تاریک کمرہ اس کے لیے سب سے زیادہ سکون کی جگہ تھی جس تحفظ کا احساس اُسے اس کمرہ میں ہوتا تھا وہ کسی دوسری جگہ نہیں ہوتا تھا اور جس کمرے کو اپنے ذہن کے کسی گوشے میں بسا کر وہ تقسیم ملک کے موقع پر پاکستان سے ہندوستان اٹھا لایا تھا اور جب کبھی وہ بہت پریشان ہوتا تو وہ اسی کمرے کے ایک گوشے میں چھپ جاتا۔

کہانی تو اتنی ہی ہے لیکن وہ یہاں پر ختم نہیں ہوتی۔ وہ اپنے اختتام تک پہنچتے پہنچتے آج کی بچپن اور غیر محفوظ دنیا کے لیے ایک بسیط کہانی بن جاتی

ہے:

''۔۔۔جب باڑھ آتی تھی تو اپنے بچپن میں اس کمرے میں لیٹا ہوا میں یہ دعا مانگا کرتا تھا کہ کمرہ سارے گاؤں' ساری بستی کی پناہ گاہ بن جائے۔۔۔اور اب اکثر اس اندھیرے کمرے میں پہنچ کر اس کے طاق میں رکھے ہوئے دیئے کو روشن کرتا ہوں اور اسکی جلتی ہوئی لَو کی طرف دیکھتا رہتا ہوں، ایک ٹک اور سوچتا ہوں کہ اسکی لَو کو کیسے اتنا تیز کیا جائے کہ اسکی پیلی روشنی پھیلتی پھیلتی ساری دنیا کو اپنی آغوش میں لے لے''۔

(پناہ گاہ صفحہ 19)

رتن سنگھ کی قصہ گوئی کا فن ان کے افسانے ''ایک پھول پتھر کا'' میں اپنے عروج پر نظر آتا ہے۔ کہانی ایک سنگ تراش (پتھر گھاڑا) کے گرد گھومتی ہے جسے ایک پتھر کے اندر پھول نظر آتا ہے اور وہ اسے اس کے اندر سے نکالنے کے لیے جی جان سے لگ جاتا ہے۔ یہ پھول واقعی پتھر کے اندر موجود ہے یا یہ صرف ایک فنکار کی نگاہ کا کرشمہ ہے۔ الورا اور اجنتا کی مورتیاں ان عظیم فنکاروں کی نگاہ کا کرشمہ ہی تو ہیں جنھوں نے اس سنسان جنگل اور ویران پہاڑوں میں ان خوبصورت اور دلفریب نقش ونگار کو دیکھ لیا اور انہیں ان پتھروں سے نکالنے کے لیے نہ جانے اپنی کتنی نسلیں صرف کر دیں۔ یہ چٹانیں اور جنگل عام انسانوں کے لیے خوفناک جانوروں کا بسیرا تھیں لیکن وہاں پتھر گھاڑوں کی نسل آ کر آباد ہوئی جس نے حسن کے اس خزانے کو پتھروں کے اندر دیکھ لیا۔ یہ آج بھی نہیں معلوم کہ یہ فنکار کون تھے، کہاں سے آئے تھے اور کتنی زندگیاں انھوں نے اس حسن کو نمایاں کرنے میں صرف کر دیں۔

رتن سنگھ کا پتھر کا گھاڑا بھی اسی نسل کا کوئی انسان محسوس ہوتا ہے جس نے سنگ کے سینے میں پھول کا یہ جلوہ دیکھ لیا اور اس کی چھینی ہتھوڑی اسے پتھر کی قید سے آزاد کرنے میں لگ گئی:

''ارے اس پتھر کے اندر یہ خوبصورت پھول کیسے قید ہو گیا۔ پھول بھی وہ جو ٹہنی سے لگا ہوا ہو۔۔۔اس کے ہاتھوں کی انگلیاں اس پھول کے لمس کو پانے کے لیے بچپن ہو رہی تھیں اور دل تصور ہی تصور میں پھول کی شکل وصورت دیکھ کر متوالوں کی طرح دھڑکے جا رہا تھا''

(ایک پھول پتھر کا۔ ماہنامہ آجکل فروری 2010 صفحہ 4)

کہانی میں جمالیات کا یہ مسئلہ بھی چھپا ہوا ہے کہ حسن بذاتِ خود کسی چیز میں موجود ہوتا ہے یا وہ صرف فنکار یا دیکھنے والے کی نگاہ میں ہوتا ہے۔ پتھر کی اس چٹان پر وقت کے کتنے ہی پیر پڑے ہوں گے لیکن وہ پھول صرف اس پتھر گھاڑے کو ہی نظر آیا۔ دوسری بات جو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ زندگی ہے جو ایک مسلسل عمل ہے۔ اور اسکا حسن دلکشی اور لفریبی اس عمل سے تعلق رکھتی ہے۔ یہاں بھی وقت گزرتا جاتا ہے جسکا کوئی احساس پتھر گھاڑے کو نہیں ہوتا اسکی ہتھوڑی پتھر پر چلتی رہتی ہے اور شاید یہی زندگی کے وجود کی علامت ہے:

''چٹان کے وجود میں درد زہ کی میٹھی میٹھی درد بھری لہریں اٹھ رہی تھیں ایک پھول جنم لے رہا تھا۔ ایک زندگی وجود میں آ رہی تھی''

(آجکل فروری 2010۔ صفحہ 4)

پتھر گھاڑے کا یہ عمل جاری رہتا ہے۔ کب تک وہ اس کام کو کرتا رہا اسکا جواب تاریخ کے پاس بھی نہیں ہے:

''پہاڑ کہتے ہیں ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ پتھر گھاڑے کی ٹھک ٹھک کو اسی طرح سنتے آئے ہیں''۔

آجکل فروری 2010 صفحہ 5)

پھول آخر کار پتھر سے باہر آ گیا لیکن پھر موسم بدل گیا آندھی اور دھاکوں نے پوری فضا کو مسموم کر دیا پتھر گھاڑا اس خون آلود آندھی سے پھول کو بچانے کے لیے اپنے بدن سے اسے ڈھانپ لیتا ہے:

''وقت گزرنے کے ساتھ پتھر گھاڑے کا ہاڈ مانس کا تن پتھر کا بن چکا ہے۔ لیکن لوگ کہتے ہیں کہ لہو کی لالی والی یہ آندھی جیسے ہی مٹے گی ویسے ہی پتھر گھاڑے کا پتھر کا تن پھر سے ہاڈ مانس کا بن جائے گا۔ اور اس کے اٹھتے ہی دنیا پر پھول کا حسن آشکار ہوگا جو زندگی کے حسن کا عکاس ہے''

(آجکل فروری 2010 صفحہ 6)

رتن سنگھ نے اس افسانے کو بڑی خوبصورتی سے برتا ہے۔ قصّے کی بنت بہت مضبوط ہے۔ کہانی کے ارتقا میں جو فنکاری ہے وہ کم افسانوں میں پیدا ہوتی ہے رتن سنگھ کا یہ افسانہ ایک ''پتھر گھاڑے'' کا قصہ نہیں بلکہ تخلیقی عمل کی تجسیم ہے جو بڑا مشکل کام ہے۔

رتن سنگھ نے اپنی کہانیوں میں انسانی جذبات کے ساتھ سماجی و تہذیبی زندگی کی بڑی پُر اثر تصویر کشی کی ہے سیالکوٹ کا لاڑا (پناہ گاہ) معصوم محبت' جمالیاتی احساس' اور پنجاب وراجستھان کی تہذیبی زندگی کی بڑی خوبصورت تصویر ہے۔ رتن سنگھ کے افسانوں کی یہ خوبی ہے کہ وہ قصہ گوئی کے شوق میں اسے طول نہیں دیتے۔ ان کا فن کہانی کے اختصار میں ہے۔ زبان پر انھیں قدرت ہے اور وہ الفاظ کا بہت خوبصورت استعمال جانتے ہیں اور بڑی سے بڑی بات کو مختصر جملوں میں ادا کرنے کے ہنر سے واقف ہیں۔ ان کی بیشتر کہانیاں واحد متکلم میں ہیں۔ ان کے یہاں ان کے افسانوں میں کردار کی اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی قصّے کی ہے اور یہ قصے حقیقت' تجربے اور مشاہدے کے ایسے عمل سے وجود میں آئے ہیں کہ جن پر کبھی کبھی حقیقت یا آپ بیتی کا گمان ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہی قصہ گوئی کی صلاحیت اور زبان کے تخلیقی اظہار پر دسترس رتن سنگھ کا فن ہے۔

''زمانہ کی نئی کروٹ''

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

(کراچی)

رتن سنگھ ''کم فنکار'' نظر آنے کے لیے جتنی جدوجہد کرتا ہوا نظر آتا ہے وہ اتنی جدوجہد ہمیں اپنے افسانوں کی تکنیک سے متاثر کرنے کے لیے کیوں نہیں کرتا۔ مجھے اس سوال کا یہی جواب ملا کہ بعض لوگ اپنے طرز نگارش کی سادگی سے بہت ناجائز فائدہ کماتے ہیں۔ وہ پہلے تو ہمیں اپنی کہانیوں میں آسانی سے داخل ہونے دیتے پھر کبھی کبھی ہم کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے ہیں کہ یہ کہانی کی شروعات ہے یا زخم پر سے پٹی کھلی ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جو کچھ بھی پیش کیا جارہا ہے وہ کہانی کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے۔ آخر بے زبانی یا کم زبانی بھی اظہار ہی کی ایک صورت ہے۔ رتن سنگھ نے اپنی کہانیوں کی کم زبانی یا سرگوشیوں سے کچھ اس نوعیت کا کام لیا ہے کہ وہ ہم کو ''کیا کہا جارہا ہے؟'' کے بجائے ''کس طرح کہا جارہا ہے؟'' جیسے سوال کے جواب کی تلاش میں الجھا دیتے ہیں۔ جیسے ہی وہ ہمیں موخرالذکر سوال کے جواب پر اکساتے ہیں وہ بہ حیثیت آرٹسٹ نصف سے زیادہ کامیابی کے حقدار ہوجاتے ہیں۔ آپ کہیں گے کہ آدھی کامیابی سے کام نہیں چلتا۔ بالکل ٹھیک کہیں گے آپ۔ لیکن آدھی کامیابی اگر افسانہ کے شروع میں ہی مل جائے تو پھر شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ کہانی حقیقت حال کی کہانی ہے یا طرزِ احساس کی کہانی ہے۔

رتن سنگھ اُردو افسانہ کی تیسری نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس میں ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، جوگندر پال، رام لعل وغیرہ شامل ہیں۔ وہ ان افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنھوں نے کم لکھا اور اچھا لکھا۔ ہوتا آیا ہے کہ بسا اوقات بعض ادیب اعتماد کی کمی کے سبب سے بہت لکھتے ہیں کہ شاید وہ اپنی تحریروں کے ہجوم میں کچھ زندہ بچ رہ سکنے والی تحریریں لکھ سکیں۔ بعض ادیب اپنی ہر تحریر اس یقین کے ساتھ لکھتے ہیں کہ وہ اور اُن کا کام زندہ رہے گا۔

رتن سنگھ پاکستانی الاصل ہیں۔ سیالکوٹ اُن کا آبائی ضلع ہے۔ اُن کی کہانیوں میں شروع شروع اپنے پرکھوں کی زمین سے اکھڑنے کا غم خون کے ساتھ گردش کرتا رہا۔ وہ کچھ عرصہ قبل پاکستان آئے تھے۔ اس دوران وہ اپنی جنم بھومی بھی گئے اور یہ ہوا کہ برسوں سے مندمل شدہ زخم دوبارہ ہرا ہوگیا۔ انہیں محسوس ہوا کہ ان کے گاؤں کا ایک ایک پیڑ..... اور کھیتوں کی ہریالی، ان سے بیتے ہوئے دنوں کا حلا احوال لے رہی ہے۔ ''تم کیسے ہو؟'' ہمارے بغیر کس طرح جیئے، کیا ہم تمہیں یاد آئے وغیرہ وغیرہ۔ رتن سنگھ ان سوالات کے جوابات آنسوؤں کی غیر مختتم لڑی کے ذریعے دے پایا یا نہیں، لیکن اب یہ لڑی خشک ہو چکی ہوگی جس طرح ایک دفعہ پہلے بھی ہوچکی تھی۔

رتن سنگھ کے آنسوؤں کی اس لڑی نے بعض افسانوں میں Water-mark کا کام کیا ہے۔ ایک ایسی پہچان کی صورت میں جو افسانہ کے آر پار نظر آتی رہی ہے۔

مجھے رتن سنگھ کے یہاں راجندر سنگھ بیدی جیسا سکھِ ترخان تو نظر نہ آسکا لیکن جس بات نے میرا بے پناہ پیچھا کیا ہے، یا یوں کہہ لیجیے کہ مجھے پریشان کر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ اُس کی کہانی ایک منفرد طرزِ احساس کے منبع سے برآمد ہوتی ہے اور وہ جس طرزِ احساس کی دنیا بساتے ہیں وہ صرف دن میں خواب دیکھنے والے ہی بسا سکتے ہیں۔ سرگوشی عموماً کانوں میں کی جاتی ہے۔ رتن سنگھ کی کہانیاں اُس کے تجربات کی فی الفور منتقلی میں کامیابی ہوجاتی ہیں۔ اور اُس کے کہے کو سچ سمجھنے کے لیے قارئین سے چُپ چاپ راضی نامہ لکھوالیتی ہیں۔ تو پھر یہ میں نے کیا کہا کہ وہ راجندر سنگھ بیدی کی طرح شعوری فنکار نہیں ہے۔ کیا میں اپنی بات کو اس طرح نہیں کہہ سکتا کہ ہر چند کہ راجندر سنگھ بیدی اور رتن سنگھ کا موازنہ مقصود نہیں ہے لیکن ایک حیرانی ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتی اور وہ یہ کہ بیدی بہت عمدہ بلکہ نوک پلک سے درست فنکار ہونے کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں جبکہ رتن سنگھ اپنے قارئین کو بعض ایسے گوشوں اور احساسات کے عجیب وغریب علاقوں میں لے جاتے ہیں جن پر ایک عرصہ سے نگاہ نہیں پڑی تھی۔ یعنی یہ علاقہ بالکل غیر آباد تھا۔ اس لیے ناموجود بھی۔ لیکن رتن سنگھ یکدم ہمارے احساسِ خفتہ کو بیدار کر کے ہمیں وہ کچھ دکھانے اور محسوس کروانے کے لیے تیار کرتے ہیں جنہیں دیکھ اور محسوس کر کے ہم رتن سنگھ سے زیادہ اپنی قوتِ ادراک کی پیٹھ تھپکتے ہیں۔ اگر ایسا ہو پائے بلکہ ہوتا رہے تو پھر رتن سنگھ کی بہ حیثیت ایک افسانہ نگار کامیابی معرض بحث کی بحث سے نکل کر زندہ حقیقت بن جاتی ہے۔

میں رتن سنگھ کے متعدد افسانوں کا مطالعہ کر پایا ہوں۔ ''کاٹھ کا گھوڑا'' کے افسانوں کے علاوہ بھی۔ پاکستانی ہونے کی وجہ سے رتن سنگھ کے بعض افسانے میرے مطالعہ میں نہ آپائے ہوں گے۔ 50-40 افسانوں کے مطالعہ کے بعد افسانہ نگار کی شخصیت اور اس کی ملکیت احساس کا کسی نہ کسی حد تک یقین ہو ہی جاتا ہے۔ رتن سنگھ کے افسانوں میں احساس کی سطح کی حقیقت اس سرعت کے ساتھ تبدیل ہو سکتی ہے کہ تعجب کے علاوہ اور کوئی ردعمل ممکن بھی نہیں۔ رتن سنگھ اپنے قلیل سامانِ صناعی کے باوجود ناظر کو منظر اور منظر کو ناظر کی صورت دینے میں اس درجہ مشاق واقع ہوئے ہیں کہ وہ صرف اس تبدیلی کا اشارہ کرتے ہیں۔ اس کی زبان اس تبدیلی کے لیے مناسب تلازمے تلاش کر چکی ہوتی ہے اور رتن سنگھ نے جس حقیقت کو چشم زدن میں محسوس کیا ہے وہ ہم بھی چشم زدن میں درست تسلیم کر لیتے ہیں۔

''کاٹھ کا گھوڑا'' اور ''خاموشی'' یقینی طور پر اس لائق ہیں کہ انہیں اس حقیقت کی تصدیق کے لیے ایک ادبی جیوری کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ وہ جیوری یہی سمجھے گی کہ اُس کا کام بہت آسان ہے۔ شاید جیوری مطالبہ کرے کہ کچھ اور افسانے پیش کیے جائیں تاکہ بات کے دائرہ کو وسیع تر کیا جاسکے۔

چلیے ہم ''ساتواں آسمان'' کی طرف آتے ہیں۔ وہی مسرت اور

ممکنہ عیش وطرب کی اُمید پر ایک طرف چار مزدور اور دوسری طرف فائیو اسٹار ہوٹل کے ساتویں فلور پر کسی مزدور کی کامیابی کے نتیجہ میں خود کو ''خستہ'' کر دینے پر راضی ایک جسم فروش قتالہ۔ صبح کا سورج یاجوج اور ماجوج کے قصے کی یاد دلاتا ہے۔ اگر حسن وشباب حاصل کرنے کے آزمودہ نسخہ استحصال کو معروف قواعد سے نکال کر دماغ سوزی کی قوت پر منحصر کیا جاتا ہے تو پھر جس دیوار کو چاٹتے چاٹتے یاجوج ماجوج کی صبح ہوئی تھی اُس سے آنکھوں میں دُھول بھرنے اور ساتویں آسمان کے بالاتر ہونے ..... یہاں تک کہ وہ ناقابل حصول ہو جائے ..... کے علاوہ کچھ بھی ممکن نہیں۔ رتن سنگھ نے ''کاٹھ کا گھوڑا'' میں بندو کو کاٹھ کا گھوڑا اور کاٹھ کے گھوڑے کو بندو بنا کر ارد گرد پھیلے ہوئے مسخرہ پن کا مذاق اڑایا تھا۔ رتن سنگھ نے ''خاموشی'' جیسے لاجواب افسانے میں جانوروں اور انسانوں کے رویّوں میں جس درجہ مماثلت تلاش کی تھی وہ انسان کی عظمت سے زیادہ اُس کی خلقی معصومیت پر ایک ایسے یقین کا اظہار کرتی ہے جو ''گروگرنتھ'' کی بصیرت پر یقین رکھنے والے ایک سادہ لوح فنکار کے حصار میں آ کر ایمان کی سطح سے اُٹھ کر فن بن سکتا تھا۔

علاوہ ازیں ''سوکھی ٹہنیوں میں اٹکا ہوا سورج'' ''بکھرے ہوئے سپنے'' اور ''پہلا قدم'' جیسے افسانے انسان کی زندگی کے گزرے ہوئے لمحات کی بعض ایسی سچائیوں کی تلاش قرار دی جاسکتی ہیں جو غور سے نہ دیکھی جائیں تو بڑی عام سی باتیں لگتی ہیں اور توجہ سے دیکھی جائیں۔ لمحۂ موجود سے الگ ہو کر..... تو ان سچائیوں کے ساتھ ایک زندگی کیا بلکہ درجنوں زندگیاں گزاری جاسکتی ہیں۔

آخر ''بکھرے ہوئے سپنے'' کی بکری کو ''تماشۂ زندگی'' کو دوسری یکسر مختلف سطح پر دیکھنے کی کوشش نہیں تو کیا ہے۔ یہ وہ سطح ہے جہاں ''خاموشی'' کا موضوع ایک اور صورت میں سامنے آتا ہے۔ بکری کے حوالہ سے حمید یاد آتا ہے اور وہ شاید اس لیے کہ بکری کے ساتھ کہانی میں جاری ساری Empathy کی فضا حمید کے بغیر بامعنی نہیں۔

رتن سنگھ کی کہانیوں کے مطالعہ سے ایک حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ایک اہم فنکار چھوٹے چھوٹے واقعات کو اس قدر بڑا اور اہم بنا سکتا ہے اور بنا دیتا ہے کہ اُس کی نظروں سے دیکھی ہوئی چیزیں ایک اور وجود میں ڈھل جاتی ہیں اور وہ وجود ایک ''فنکار'' کی سوچ کا وہ لمحہ ہے جب اس وجود کو فنکار نے دیکھا تھا۔ ایک اہم فنکار انسان اور اس کے ساتھ زندگی گزارنے والوں کے لیے موانست اور دیکھ ریکھ کے جن رشتوں کو جنم دیتا ہے اگر ان رشتوں کے احساس کو اُسی گہرائی و گیرائی میں دیکھا جاسکے تو فنکار کی کامیابی قرار دیا جاسکتا ہے۔

''رتن سنگھ'' جدید اردو کہانی کے اُفق پر جس قدر نظر انداز کئے گئے ہیں اُس سے یہی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاید اب پانسے کا رُخ پلٹنے والا ہے چونکہ ہمارے برصغیری سماج نے اس قدر کاٹھ کے گھوڑے دیکھ لیے ہیں کہ اب کاٹھ کے گھوڑے کو حقیقی گھوڑا بن کر خرافات کے جال سے نکلنا ہی ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ بدلتا ہوا زمانہ ہی رتن سنگھ کو دریافت کرے گا اور جس کام کو رتن سنگھ سے انجام پانا تھا وہ زمانہ کی نئی کروٹ سے ممکن ہو پائے گا۔

دائمی شہرت

رتن سنگھ کو کہانیاں لکھنے کے ساتھ شہرت کے پیچھے بھاگنے کا ہنر بھی ہاتھ آ جاتا تو آج وہ افسانے کی دنیا میں بامِ عروج پر ہوتے۔ بہرحال محنت کسی کی کبھی رائیگاں گئی ہے نہ رتن سنگھ کے ساتھ ایسا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اندیشہ اگر ہے تو اردو ادب میں رتن سنگھ کی دائمی شہرت کا ہے جس کے لیے میں رتن سنگھ کو پیشگی مبارک باد دینا چاہتا ہوں۔

احمد ندیم قاسمی (●)

☆

''کڑاہ پرشاد''

رتن سنگھ کی لمبی کہانیاں بھی چھوٹی سی، بڑی سڈول اور اتنی تیز رو ہیں کہ قاری انہیں ایک ہی سانس میں پڑھ لیتا ہے۔۔۔۔ میرا خیال ہے وہ خواہ ایک ہی نشست میں اپنی کہانی پوری کرتا ہے، خواہ زائد نشستوں میں، وہ اسے محویت میں ایک ہی رو میں پورا کر جاتا ہے۔ ظاہر ہے وہ سوچتا سمجھتا بھی ہوگا مگر کچھ ایسے اور اتنا جیسے کہانی ''کر'' رہا ہو، مانو واقعتاً کچھ پیش آ جانے پر۔ اسی لئے اس کی کہانی پیپل کے پتے کی طرح اوپر اوپر سے اتنی شفاف اور سرسبز معلوم ہوتی ہے کہ پڑھنے والا اسی پر کڑاہ پرشاد رکھ کر کھالے۔

جوگندر پال (دہلی، بھارت)

☆

افسانے کا خلیل جبران

رحمان اختر (دہلی، بھارت)

خلیل جبران بھی عجیب ادیب تھا۔ اس کی شہرت ادب کی دنیا میں ایک حق گو قلم کار کی حیثیت سے رہی ہے۔ اس نے اپنے عہد اور ملک کے لوگوں سے بہ بانگِ دہل نفرت کا اظہار کیا تھا اور اپنے سماج کے ناہموار اعمال پر کھل کر تنقید کی تھی۔ ایسا حوصلہ قلم کاروں میں شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اردو تو یوں بھی حلیمی اور تہذیبی زبان ہے جس کے پاس سوائے آداب کے رکھا ہی کیا ہے۔ اردو کے افسانوں میں گذشتہ پچاس برس کے دوران سماج کی ناہمواریوں کا ذکر ہوتا رہا ہے لیکن اردو کے افسانہ نگار کو اپنے اظہار کے ساتھ ساتھ افسانے پر کم خود پر آنچ آنے کا خطرہ زیادہ لاحق رہا ہے۔ صرف ایک دو نام ایسے ہیں جنہوں نے اپنے افسانوں میں حق گوئی کے لیے خود پر پہرے نہیں بٹھائے اور جو بات، جو سچائی یا سماج کی جو حقیقت نظر کے سامنے آئی اسے سچی تصویر کے طور پیش کر دیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایسے افسانوں کی پیش کش کے بعد ادب کی دنیا میں خوب واویلا ہوا۔ مثال کے طور پر عصمت چغتائی کا ''لحاف'' منٹو کا ''سڑا ہوا گوشت'' اور کھول دو'' وغیرہ۔ نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ یہ شور و غل اردو کے آدابی مزاج کو کچھ دن تک ہضم نہیں ہوا لیکن آخرش یہی افسانے اردو افسانہ نگاری میں یادگار بن گئے۔

موجودہ عہد کے افسانہ نگاروں میں رتن سنگھ نے بھی سماج کی تلخ حقیقتوں سے بڑے بے باکانہ انداز میں پردہ اٹھایا۔ وہ کڑوی سچائیاں جو کبھی قتل و غارت گری، استحصال، ظلم و جبر، فسادات اور مذہبی وحشی پن کے روپ میں ملک اور سماج برداشت کرتا ہے، اس کی وجوہات کی گہرائی پر رتن سنگھ کا قلم خلیل جبران کے قلم کی طرح رواں دواں ہے۔

رتن سنگھ کی ابتدائی کہانیوں سے ہی بغاوت کی بو آتی ہے۔ یہ بغاوت ہر اس ناہموار عمل سے ہے جو عام زندگی کو disturb کرتی ہے۔ 1964ء میں لکھی گئی کہانی ''بغاوت'' ایک ایسے معصوم بچے کے اردگرد گھومتی ہے جس کا باپ اور ماں پیسے کمانے کے ہوڑ میں بچے کو ایک دوسری عورت کی دیکھ ریکھ میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور بچہ چھوٹی عمر سے ہی حقیقی ممتا کو ترستا ہوا بڑا ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ مزاج میں چڑچڑا پن آ جاتا ہے۔ ایک شام جب ماں باپ اپنے دفتروں سے لوٹتے ہیں اور بچے کو گود میں لیتے ہیں تو بچے کی معصوم بغاوت ابھرتی ہے۔ اس بچے کی بغاوت کا منظر رتن سنگھ نے یوں قلم بند کیا ہے:

> ''میں نے زور سے پیشاب کی دھار ماری تو باپو کے گرم کوٹ اور پینٹ پر لمبی چوڑی لکیر بن گئی۔ وہ یوں پیچھے ہٹا جیسے دشمن کے اچانک حملہ کر دینے سے فوجی گھبرا اٹھتے ہیں۔ پھر ماں کی گود سے اترتے اترتے میں نے اسے بھی بھگو دیا۔ میں خوش تھا کہ دونوں کو ایک ہی حملے میں پسپا کر دیا''۔

کہانی ''بغاوت'' رتن سنگھ کے مزاج کی نشان دہی کرتی ہے۔ یہ بغاوت صرف رتن سنگھ کی ہی نہیں ایسے کتنے ہی بچے آج کرپچ کلچر کے سبب ممتا سے محروم ہو کر باغی ہو رہے ہیں۔ رتن سنگھ نے ایسے موضوعات کو خاص طور پر ابھارا ہے۔ رتن سنگھ کے یہاں قلب کو تڑپانے اور روح کو گرمانے کا فن ہے۔ افسانہ نگاری میں وہ دوسروں سے ایک الگ راہ نکالنے کی کامیاب کوششوں میں نظر آتے ہیں۔

رتن سنگھ کا افسانہ ''دھجیاں'' ہے۔ جس میں انہوں نے ایک پاگل کے کردار کو پیش کیا ہے جو دن بھر کپڑے پھاڑ پھاڑ کر سورج کا قطرنا پتا ہے۔ یہ ایک تمثیلی افسانہ ہے جو آج کے انسان کی نارسائیوں کی داستان ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ کہانیوں میں تیکھے موضوعات منتخب کرنے کے باوجود مزاجاً رتن سنگھ گل و گلزا رشخصیت کے مالک ہیں۔ شخصی طور پر ان سے ملیے تو انتہائی میٹھا سبھاؤ ہے۔ جوگندر پال نے رتن سنگھ کی شخصیت اور کہانی کا تجزیہ بڑے خوب صورت انداز میں کیا ہے:

> ''اس کی کہانی پیپل کے پتے کی طرح اوپر اوپر سے اتنی شفاف معلوم ہوتی ہے کہ پڑھنے والا اس پر کڑھا پر شادر کھ کر کھا لے''۔

''خاموشی'' کہانی میں بیانیہ کا لطف ہے۔ ایک غریب اپنی ناداری سے تنگ آ کر بھوکے جانوروں کو پیٹتا ہے۔ افسانے کے اختتامی لمحے پر رتن سنگھ نے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ بے زبان بھینسیں پٹنے کے بعد بھی آسمان کی طرف سے زمین پر سر نیچا نہیں کرتیں۔ غریب مارنے سے ہاتھ روکتا ہے اور انہیں کی طرح وہ بھی آسمان کی طرف دیکھنے لگتا ہے۔ یہاں رتن سنگھ کا جملہ بڑا معنی خیز ہے:

> ''ڈھوروں میں ایک اور ڈھور کا اضافہ ہو جاتا ہے''۔

ایسے جملے رتن سنگھ کو ہر تخلیق میں خلیل جبران ثابت کرتے چلتے ہیں۔ رتن سنگھ کے افسانوں میں ایک خاص بات یہ دیکھنے میں آئی ہے کہ داستان گوئی کا سلسلہ اور لطف بالکل اسی طرح قائم و دائم نظر آتا ہے جو میر امن کی ''باغ و بہار'' اور رجب علی بیگ سرور کے ''فسانۂ عجائب'' کا وصف ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہانی نے داستان سے افسانے تک درجہ بدرجہ جو سفر طے کیا ہے اس سفر کی طرف رتن سنگھ قاری کے ذہن کو تاریخی تسلسل سے جوڑتے ہیں۔ ''ہزاروں سال لمبی رات'' کہانی میں کہانی کی کہانی چلتی رہتی ہے۔ کہانی کے دوران ایک موڑ آتا ہے جس میں ایک عام شاہی دعوت پر غریب پیٹ بھر کر کھانا کھاتے ہیں:

> ''جھوٹ بالکل جھوٹ''
>
> برآمدے میں لیٹے ہوئے سبھی بھوکے آدمی کہانی سنتے ہوئے احتجاجاً کھڑے ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں:
>
> اگر ہم نے رات کو پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہوتا تو اس وقت تمہاری کہانی سننے کی بجائے چین کی نیند سو رہے ہوتے''۔

ان جملوں میں رتن سنگھ داستانی سماں بھی باندھتے ہیں اور بھوک

اور بے بسی کی تصویر بھی پیش کرتے ہیں۔ یہ مزاج کہانی کار کو پنجاب کی ان لوک کتھاؤں سے ملا ہے جنہوں نے پنجابیت کو انفرادیت دی ہے۔ پنجاب کے تناظر میں رتن سنگھ کی کہانیاں ''دکھ کی عمر'' ''پنجرے کا آدمی'' اور ''آؤ لاہور چلیں'' اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ مصنف زمین دوز اپنی انسانی جڑوں سے جڑا ہوا ہے اور اس وابستگی کے سبب ہی کہانی میں کہانی پن بھی اور سچائی بھی۔

رتن سنگھ کے یہاں کہانی کے کسی فیشن کا نہ کوئی خاص رنگ ہے نہ خاص روش بس کہانی ہے اور صرف کہانی۔ ایک ایسی کہانی جو اخبار کی خبر کی طرح اگلے دن مرتی نہیں بلکہ ہمیشہ زندہ رہنے والی کہانی رہتی ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے ''پہلی آواز'' ''پنجرے کا آدمی'' ''صبح کی پری'' ''مانک موتی'' اور ''کاٹھ کا گھوڑا'' ہو یا ناولٹ ''دربدری'' سب میں ہی ایک الگ مزاج اور الگ شناخت جھلکتی نظر آتی ہے۔ رتن سنگھ نے اپنے افسانوں میں جن علامتوں سے کام لیا ہے وہ علامتیں گنجلک نہیں ہیں بلکہ موضوع کی معنویت سے بہت قریب ہے۔ مثال کے طور پر ''ایڈیٹ'' افسانے میں علامت کو حقیقت کے قالب میں افسانہ نگار نے ڈھال دیا ہے۔ ایڈیٹ کا ہیرو ایک شریف اور باضابطہ آدمی ہے۔ اس کی کار ایک چوراہے پر گرین سگنل کا انتظار میں ہے۔ کافی دیر کے بعد وہ بھی بے ضابطگی پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے کہ سرکار کے غریبی ہٹاؤ نعرے کی ہری بتی جام ہوگئی ہے۔ پھر انکے چوراہے پر بھی یہی منظر ہے اور وہ پھر بے ضابطہ ہو جاتا ہے اور پھر قانون توڑتا ہے۔ کہانی کے آخر میں رتن سنگھ کے یہ جملے معنی خیز ہیں:

''اور وہ ایڈیٹ بنا اب بھی سڑک کے اس پار کھڑا ہے۔ بتی ابھی تک لال ہے پیلی یا ہری نہیں ہو رہی۔ اس لیے اسے پتا نہیں اور کتنا انتظار کرنا پڑے گا''۔

یہ قانون شکنی کا ماحول' دہشت پسندی' اسمگلنگ اور استحصال کی علامتیں ہیں۔ جنہیں آج کا سماج بھوگ رہا ہے اور کہانی کار خلیل جبران کی طرح اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ موجودہ سیاسی حالات' فسادات' آپسی رنجشیں اور امن کی تباہی آج کا سماج روز بھوگ رہا ہے۔ ان تمام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے رتن سنگھ کا افسانہ ''پچھتاوا'' مکمل ایک تصویر نظر آتا ہے۔ اسی افسانے کے یہ جملے واضح تصویر پیش کرتے ہیں:

''ان دونوں سانڈوں نے سارے میلے کی بساط ہی الٹ دی۔ پتہ نہیں لوگ جواب تک میلے کی یک رنگی میں ڈوبے ہوئے تھے' وہ کیسے رنگ و نسل کے تفرقوں میں بٹ گئے۔ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے اور پھر سارا میلہ ہی اجڑ گیا۔ اس عالم میں پہاڑ کو جس بات کا زیادہ صدمہ ہوا وہ یہ تھا کہ اس اجڑی ہوئی دھرتی پر دونوں سانڈ مل کر ایک دوسرے کی تھوتھنی جوڑے ہوئے بیٹھے تھے اور جگالی کر رہے تھے''۔

بدعنوانیاں سیاسی' مذہبی اور علاقائی سطح پر ہی نہیں بلکہ آج ہر شعبہ حیات میں سلو پوائزن کی طرح پھیل رہی ہیں۔ تعلیم جو ایک مقدس سلسلہ اور پیشہ تصور کیا جاتا ہے اس میں بھی عیار لوگ طاقت و ثروت کے بل پر ڈگریاں حاصل کر رہے ہیں۔ رتن سنگھ نے اس تعلیمی نظام پر بھی علامتی اور تجریدی انداز سے ایک افسانے ''رگ وید کے بعد'' میں چوٹ کی ہے۔ یہ اقتباس دیکھئے:

''تب مہرشی ویاس جب اپنی گپھا پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک بھیڑ جمع تھی جیسے بازار لگا ہو۔ ہر شخص پیسے سے' چھل سے' کپٹ سے' طاقت سے روشنی کا پرشاد حاصل کرنے کے لیے ٹوٹا پڑتا تھا ایک دوسرے کو گھسیٹ رہا تھا۔ ایک دوسرے کا گلا دبا رہا تھا۔ گپھا کے اندر ویاس رشی کی مورتی ستھاپت کر دی گئی تھی۔ ہاٹ پر خرید و فروخت کی بڑی گہما گہمی تھی''۔

رتن سنگھ کے افسانوں میں مجموعی طور پر لفظیا کی وسعت' معنوی انفرادیت' عصری حسیت اور فنی بصیرت نمایاں نظر آتی ہے۔ فکری اور فنی تکنیک کی دل کشی بھی ان کے افسانوں میں نمایاں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ رتن سنگھ ایک اشتراکیت پسند ذہن کے مالک بھی ہیں اور شاعر بھی۔

کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ رتن سنگھ کے افسانوں میں پنجابیت غالب رہتی ہے۔ لیکن ہمارے خیال سے یہی پنجابیت ان کے دھرتی سے جڑے رہنے کا ثبوت ہے۔ اردو افسانوں میں پنجابی لفظیات یا پنجاب کے علاقائی محاورے اور الفاظ استعمال کرنا رتن سنگھ کے سچے پنجابی ہونے کی مثال ہے۔ ایک دوسرے پہلو سے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ رتن سنگھ نے اردو دنیا کو اپنے افسانوں کے حوالے سے پنجابی الفاظ سے روشناس کرایا۔ اپنے افسانوں میں ''ڈُل سکتا ہے'' ''گلو بند کی جگہ'' ''گانی'' ''لاٹھی کی جگہ'' ''ڈنگوری'' ''بدحالی کی جگہ'' ''مندحالی'' ''عریانی کی جگہ'' ''تنگیز'' ''کچہ گاؤں کی جگہ'' ''کچہ پنڈ'' استعمال کر کے رتن سنگھ نے اردو پنجابی کے رشتے کو مستحکم کیا ہے۔ یہ کہنا بالکل غیر مناسب ہے کہ پنجابی الفاظ کی وجہ سے رتن سنگھ کے افسانے بے لطف ہو جاتے ہیں۔ رتن سنگھ سے پہلے راجندر سنگھ بیدی نے اپنے افسانوں اور ناولٹ ''ایک چادر میلی سی'' میں پنجابی الفاظ جان بوجھ کر استعمال کیے ہیں۔ بیدی نے ایک جگہ لکھا ہے:

''میرا ماحول پنجابی ہے، میری زبان پنجابی ہے۔ میں اگر پنجابی الفاظ استعمال کرتا ہوں تو اپنے خلوص کا ثبوت دیتا ہوں''۔

یہی الفاظ رتن سنگھ پر بھی صادق آتے ہیں۔ مجموعی طور پر رتن سنگھ کے افسانے فکر و فن کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں اور زندگی کے سچے ترجمان ہیں۔ ہر افسانہ مقصدیت اور انفرادیت کا حامل ہے۔ رتن سنگھ نے خلیل جبران بن کر سماج کی جن سچائیوں کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے وہ کہانیاں آج بھی ایک نئے تعمیری معاشرے کے قیام کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ ایک حقیقی افسانہ نگار کی حیثیت سے رتن سنگھ خلیل جبرانی حوصلے کے ساتھ اپنی کہانی کو مختلف موضوعات کی پگڈنڈیوں سے گزارتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں۔ کہانی کی کہانی ابھی جاری ہے اور اس وقت تک جاری رہے گی جب تک سننے والے بور نہیں ہوں گے۔ رتن سنگھ کی کہانی نہ اب تک کسی کو بور کر سکی ہے نہ آگے کر سکے گی۔

ایک حقیقت پسند افسانہ نگار

صبا اکرام
(کراچی)

ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے رسالے ''عصری ادب'' (دہلی) میں شائع ہوئے اپنے ایک مضمون میں جس کا عنوان ''تیسری آواز کا افسانہ'' ہے یہ اصرار کیا ہے کہ رتن سنگھ کی حیثیت اُردو افسانے میں ''تیسری آواز'' کے سلسلے کے پہلے کہانی کار کی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن کے مطابق تیسری آواز وہ ہے جو ''پرانے طرز کے واقعاتی افسانے اور تجریدی اور علامتی مہملیت پسند افسانوں کے درمیان سے ابھری''۔ اس آواز کو جو کہیں سے ان کے کانوں میں آ گئی تھی' بڑی کوشش کی کہ اس کو کوئی روپ عطا کر سکیں اور اس سلسلے میں انہوں نے ''عصری ادب'' کے پلیٹ فارم سے بھرپور تحریک بھی چلائی' مگر یہ حقیقت ہے کہ تیسری آواز کی تحریک کا نوزائیدہ بچہ چند سانسیں لے کر ہی دم توڑ گیا۔

ہاں' مگر میں ڈاکٹر محمد حسن کی اس رائے سے اختلاف بھی نہیں کروں گا کہ ستر کی دہائی کے افسانہ نگاروں (ہندوستانی افسانہ نگاروں) کا اپروچ بیشتر صورتوں میں وہ نہیں تھا جو ساٹھ کی دہائی کے افسانہ نگاروں کا تھا۔ اُردو افسانے میں ہر قسم کے تجربات کے مراحل سے گزرنے اور اس حوالے سے تمام Risk لینے کی جرأت ساٹھ کی دہائی کے افسانہ نگاروں نے کی اور ان کے تجربے کو سامنے رکھ کر ستر کی دہائی کے افسانہ نگاروں نے اپنا الگ راستہ طے کیا۔ انہوں نے علامتی اور استعاراتی طرزِ اظہار سے مکمل طور پر رشتہ بھی نہیں توڑا اور ایک دُوری سی جو بیانیہ سے پیدا ہو گئی تھی' اسے بھی کم کرنے کی کوشش کی۔ بلکہ اُسے ندرت اور تازگی سے ہمکنار کیا' جس کی وجہ سے اس کی شکل پریم چند کے بیانیہ سے بالکل الگ نظر آنے لگی۔

رتن سنگھ چونکہ ستر کی دہائی سے پہلے کے لکھنے والے ہیں' لہٰذا یہ کہنا کہ وہ اس اسلوب کے ساتھ اس دہائی کے نئے لکھنے والوں کے ساتھ ایک نئی یا تیسری آواز کی صورت میں سامنے آئے صحیح نہیں لگتا' بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسا کہنا Justifiable نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے افسانوں کا اگر مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ علامت نگاری اور بیانیہ کا ایک امتزاج ان کے یہاں اس دوران بھی رہا ہے' جب دوسرے تجریدیت اور علامت نگاری کی ڈگر پر بہت تیز تیز آگے چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے نہ دائیں جانب کا راستہ اختیار کیا نہ بائیں جانب والا' بلکہ درمیان میں جو ایک پگڈنڈی انہوں نے اپنے افسانوی سفر میں اختیار کی تھی' آج بھی اُسی پر آگے چلے جا رہے ہیں۔ اپنے فن کو اپنی پہچان بناتے ہوئے۔ افتخار امام صدیقی نے ''کاٹھ کا گھوڑا'' میں شامل افسانوں پر گفتگو کرتے ہوئے ٹھیک کہا ہے کہ:

''.....رتن سنگھ نے اپنے تخلیقی اظہار کو بہت مانجھ کر روشن کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں صرف کہانیاں ہیں' نقاد نہیں ہیں۔ ان کہانیاں پر اُنہوں نے لیبل نہیں لگائے ہیں''۔

(شاعر: ہم عصر اُردو ادب نمبر۔ 1997ء)

رتن سنگھ کے یہاں بیانیہ اور علامتی طرزِ اظہار اور ترقی پسند سوچ اور جدید رویّے کے امتزاج سے جو صورت سامنے آئی ہے اس کی خوبصورت مثال ''سوکھی ٹہنیوں میں اٹکا سورج'' ''من کا طوطا'' ''رگ وید کے بعد'' ''جس تن لاگے'' ''ایسی گھڑی کا بوجھ'' ''دھجیاں'' ''ہزاروں سال لمبی رات'' ''آخری اُداس آدمی'' اور دکھ کی عمر وغیرہ افسانے ہیں۔ ''سوکھی ٹہنیوں میں اٹکا سورج'' سے ایک اقتباس نقل کر رہا ہوں' ملاحظہ فرمائیں:

> ''زندگی میں پہلی بار سوکھے پیڑ کی ٹہنیوں میں سورج کو اٹکا ہوا دیکھ کر وہ حیران ہو رہا ہے' خوش ہو رہا ہے۔ سوکھے پیڑ کی ٹہنیوں میں اٹکے ہوئے سورج کی کرنیں اس کے وجود کے رگ و ریشے میں روشنی بن کر' زندگی بن کر داخل ہو رہی ہیں۔ کسان پر ایک نشہ سا چھاتا جا رہا ہے اور وہ پلکیں جھپکائے بغیر سورج کی طرف دیکھ رہا ہے' ایک ٹک''۔

رتن سنگھ کا یہ کسان خارجی پس منظر میں اچانک ایک نقطے کی صورت سامنے آتا ہے اور افسانہ کے اختتام تک اس کی داخلی کیفیت افسانے کی فضا پر چھا جاتی ہے۔ یہ کسان Spirit کے اعتبار سے پریم چند کے کسان سے مماثل ضرور ہے مگر پیش کش کے اعتبار سے بالکل مختلف ہے۔ یہ پریم چند کے کسان کی طرح اپنی خارجی زندگی کا حال نہیں بیان کرتا جو لٹا پٹا اور بدحالی کا شکار ہے' بلکہ کہانی کی طرح خود بھی کئی ان کہے سوالات کھڑے کر کے قاری کو اپنی پرچھائیں کے پیچھے لگا لیتا ہے۔ یہی انداز رتن سنگھ کے افسانوں کو اکہرے پن سے بچا لیتا ہے۔ یہاں اس افسانے کے بیانیہ میں Visuality کا عنصر شامل ہو گیا ہے جس نے فنی اعتبار سے افسانے کی خوبی میں اضافہ کر دیا ہے۔

رتن سنگھ کے افسانوں کا ''میں'' یا ''وہ'' بیشتر صورتوں میں ایک ایسے کردار کی طرح سامنے آتا ہے جو کبھی خود کلامی اور کبھی کہانی میں پیش کی گئی صورتحال کا حصہ بن کر اپنی محرومیوں اور اپنی داخلی کیفیت کا اظہار اس طرح کرتا ہے جیسے وہ انہیں منتقل نہیں کر رہا ہے' بلکہ قاری کو انہیں Share کرنے پر تیار کر رہا ہے۔ ''من کا طوطا'' سے چند سطور نقل کر رہا ہوں۔ آپ کو یقیناً احساس ہو گا کہ یہ تو آپ کے من کے طوطے کی بات کی گئی ہے۔ آپ ہی کے سپنوں اور تمناؤں کا قصہ ہے جو کبھی پوری نہیں ہوتیں' مگر جن سے دل کا دامن چھڑانا بھی ممکن نہیں:

> ''اگلے دن صبح ہوئی تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ پھر سے پہلے کی طرح نو بہ نو' تازہ بہ تازہ میرے جسم سے نکل کر میرے سامنے تپائی پر بیٹھ گیا۔ پھر اسی طرح پھدکتا ہوا پہاڑ کی تصویر کے پاس گیا اور پھر وہاں سے مجھے کچھ کہے بغیر کھڑکی کے راستے باہر نکل گیا۔

تب سے میرے من کے طوطے کا یہی حال ہے۔ پتہ نہیں زندگی کی کون کون سی کششیں ہیں' جو میرے من کے طوطے کو اپنی طرف بلاتی ہیں۔ پتہ نہیں کیسے کیسے میٹھے سپنے اپنے دل میں سموئے ہشاش بشاش وہ روز گھر سے نکلتا ہے اور ہر شام تھکا ہارا مایوس اور اُداس واپس لوٹ آتا ہے''۔

رتن سنگھ نے اپنے افسانوں میں موضوع سے زیادہ اسلوب پر توجہ دی ہے اور اپنے فن کا خوبصورت اور موثر مظاہرہ کیا ہے۔ موضوعات تو بیشتر صورتوں میں وہی نظر آتے ہیں جو ترقی پسند افسانہ نگاروں نے بھی اپنے یہاں پیش کئے ہیں۔ مگر ڈائمنشن بعض صورتوں میں بالکل مختلف سامنے آئے ہیں۔ لفظیات بھی Unfamiliar نہیں ہیں' مگر اُن کے اسلوب نے انہیں تازگی بخش دی۔ وہ عام بول چال کی زبان سے لفظیات لے کر اپنے بیانیہ کی بنت میں اس طرح شامل کرتے ہیں کہ وہ اپنے عام مفہوم کے حوالے سے ایک پوری کہانی سامنے رکھ دیتے ہیں اور ساتھ ہی اندر کی تہوں میں علامت اور اشاریت کے پردوں کے پیچھے ایک الگ کہانی کی جھلکیاں پیش کرتے ہیں جس کی ایک خوبصورت مثال ''ساتواں آسمان'' ہے۔ نئے لکھنے والوں کے یہاں فن کا یہی وہ کمال ہے جس نے ان کے افسانوں کو اس خطرے سے بچائے رکھا جس کا خدشہ مہدی جعفر نے اپنے مضمون ''افسانے کے نئے امکانات'' میں ظاہر کیا ہے۔

''ایک تو مواد کی حیثیت سے دوسرے ہیئتی لحاظ سے.....خوف ہے کہ کہیں ایک ہی قماش کا گٹھا ہوا ادب تخلیق نہ ہونے لگے''۔

(مہدی جعفر.....اُردو افسانے کے اُفق)

1947ء میں تقسیم برصغیر کے بعد ہجرت کا دکھ جھیلنے والے افسانہ نگاروں میں رتن سنگھ بھی شامل ہیں۔ مگر انہوں نے اپنی جائے پیدائش سے اپنی محبت کا اظہار اس طرح نہیں کیا' جیسا کہ عام طور پر انتظار حسین کے یہاں نظر آتا ہے۔ انتظار صاحب نے گزرے دنوں کی یادوں اور اپنے Nostalgia کو اکثر اپنے افسانوں میں برتنے کی کوشش کی ہے اور بڑی کامیابی سے اسے اپنے عصر اور موجودہ گردوپیش سے ہم آہنگ کر دیا ہے جبکہ رتن سنگھ اردگرد کے معاشرتی ماحول سے کہانی کا موضوع لے کر اس ماحول کے فرد کے حوالے سے کہانی پیش کرتے ہیں' مگر جہاں کہیں ان کا ناسٹلجیا دل میں سوئیاں چبھوتا ہے' وہاں یہ صاف پتہ چل جاتا ہے کہ ان کے افسانے کا ''میں'' یا ''وہ'' ایک ایسا فرد ہے جو ہوا میں تیر رہا ہے۔ اس کے پاؤں کو زمین کی مٹی نے ابھی ٹھیک سے تھاما نہیں ہے۔

اپنے بارے میں لکھتے ہوئے اپنے اس احساس کا اظہار رتن سنگھ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''جس سرزمین پر میں پیدا ہوا وہ میری آنکھوں سے چھین لی گئی ہے' وہاں میں جا نہیں سکتا اور جس سرزمین پر میں رہتا ہوں اس کی ایک مٹھی بھر مٹی بھی مجھے نہیں مل سکی۔ اس لیے میرے قدموں کو رکنے کے لیے کہیں جگہ نہیں ملتی''۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے ''اردو افسانہ: روایت اور مسائل'' میں نئے افسانہ نگاروں پر گفتگو کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے:

''زمین پر اُتر کر کردار کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ کرنے کا رجحان ان کہانی کہنے والوں کے یہاں عام ہے جو خواب کار کم اور حقیقت پسند زیادہ ہیں' ایسے لوگ بڑے سنجیدہ شہری ہوتے ہیں اور ان کے شور میں ہمیشہ سوسائٹی کی بے اعتدالیاں یا ناہمواریوں کو طشت از بام کرنے کا رجحان موجود رہتا ہے''۔

ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے کو سامنے رکھ کر رتن سنگھ کے افسانے ''چھلنی کے چھید'' ''دھوپ بیمار ہے'' اور ''رگ وید کے بعد'' وغیرہ پڑھیں تو بلا جھجک آپ یہ کہہ اُٹھیں گے کہ وہ ایک حقیقت پسند افسانہ نگار ہیں۔ اُن کی افسانوی تخلیقات میں Bureaucracy میں پائے جانے والے Corruption کی جھلکیاں بھی سامنے آئی ہیں اور سستی مادیت پرستی کا شکار ہوئے انسانوں کے ہاتھوں روحانی اور اخلاقی قدروں کی تباہی کا منظرنامہ بھی اشاریت اور علامتوں کے ذریعے بڑے فنکارانہ انداز میں پیش ہوا ہے۔

''مفکر افسانہ نگار''

تقسیم ملک کے بعد جو ترقی پسند افسانہ نگار منصۂ شہود پر نمودار ہوئے، اُن میں رتن سنگھ ایک اہم نام ہے جنہوں نے اپنے منفرد اسلوب و انداز سے اُردو افسانوی ادب میں اپنی الگ شناخت قائم کی ہے۔ حقیقت پسند افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ وہ جدید ادب سے بھی متاثر ہیں اور ان کا موضوع سماجی تفریق و امتیاز کو نیست و نابود کر کے معاشرے میں پائے جانے والی مفلسی، غربت اور ناہمواری کا خاتمہ کرنا ہے۔ اُن کی کہانیوں میں انسانی ہمدردی کا جذبہ بدرجہ اُتم موجود ہے جن میں کہیں کہیں وہ علامت و تمثیل کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے واقعات سے اپنی کہانی کا ایسا تانا بانا بنتے ہیں کہ قاری اُس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اُن کی کہانیوں میں فکر و آگہی بھی اور گیان دھیان بھی۔ اپنے سیدھے سادے اسلوب، حقیقت پسند رویے اور انسانی رشتوں کو استواریت و استحکام بخشنے کے جذبے نے انہیں کہیں کہیں ایک فلسفی اور مفکر افسانہ نگار بنا دیا ہے جس کی کہانیاں قاری کو اُن پر سوچ و چار کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

نند کشور وکرم

زندگی کے حسین اتفاقات

ڈاکٹر رینو بہل

(چندی گڑھ، بھارت)

ایک ادیب کو وہ لمحے خوش قسمتی سے نصیب ہوتے ہیں جب اُسے living legend سے اسی کی زبانی اُس کے زندگی کے ہنسی اور تلخ تجربات سے فیض یاب ہونے کا موقع ملے۔ اس کی رہنمائی نصیب ہو۔ رتن سنگھ جی سے میرا تعارف ایک خوش گوار اتفاق تھا۔ پھر اُن سے جان پہچان چند ملاقاتوں اور پُر خلوص مزاج نے اُنکی شخصیت سے آشنا کرادیا۔ ایک اچھے ادیب کے ساتھ ساتھ وہ صاف گو Straight forward اور سچے انسان بھی ہیں۔ ظرافت کی چاشنی باتوں میں ملا کر دوسرے کو قائل کرنے کا فن بھی خوب آتا ہے۔

ایک بار کسی کہانی پر گفتگو کے دوران خوبصورتی کا ذکر ہوا۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے ''اپنی اتنی عمر میں میں نے صرف ایک ہی خوبصورت عورت دیکھی ہے''۔

میں نے پوچھا ''وہ کون ہے؟''

''اس دنیا میں سب سے خوبصورت میری بیوی ہے''۔

اس وقت تک میں اُن کی شریک حیات سے ملی نہیں تھی حالانکہ فون پر اکثر ان سے ڈھیر ساری باتیں ہوجاتی تھیں۔

''اچھا پھر تو اُن سے جلد ہی ملنا پڑے گا''۔ میرے دل میں اُن سے ملنے کا اشتیاق اور بڑھ گیا۔

''جس عورت نے میرے مشکل وقت میں میرا ہنس کر ساتھ دیا۔ چھوٹے چھوٹے بچوں اور میرے گھر والوں کے ساتھ ایک کمرے میں گذارا کیا کبھی کوئی گلہ نہیں شکوہ نہیں اور آج تک میرا ساتھ دے رہی ہے اس سے زیادہ بھلا خوبصورت اور کون ہوسکتا ہے۔''

اُن کی یہ بات میرے اندر تک اُتر گئی۔ خوبصورتی کا اُن کا یہ نظریہ اُن کے خیالات اور جذبات کی گہرائی سے آگاہ کرا گیا۔ پھر میری ملاقات ان کی شریک حیات سے ہوئی تو اُنھیں مل کر سمجھ میں آیا کہ رتن سنگھ جی جو کہتے تھے کتنا صحیح کہتے تھے۔ آج جس رتن سنگھ کو دنیا جانتی ہے وہ رتن سنگھ نہ ہوتا اگر اُن کی شریک حیات کا ساتھ نہ ہوتا۔ اُنھیں بنانے سنوارنے کے پیچھے کتنی قربانیاں چھپی ہیں اس عورت کی اسی لئے تو آج وہ اپنے شوہر کی نظر میں دنیا کی سب سے خوبصورت عورت ہے۔ اس سے زیادہ ایک عورت کے لیے فخر کی بات اور کیا ہوسکتی ہے۔

پھر ایک ملاقات کے دوران اُنھوں نے اپنی زندگی کے اوراق پلٹے اور ماضی کے سفر پر اپنے ساتھ لے گئے۔ اتفاق کے دو اہم قصے سنائے جنہوں نے اُن کی زندگی کا رُخ بدل دیا۔ اُنھیں کی زبانی یہ قصّہ ملاحظہ فرمائیں۔

''بات 1947ء کی ہے۔ جب بٹوارے کے بعد اپنا وطن چھوڑنا پڑا تو اُس وقت میں صرف دس جماعت پاس تھا۔ کہانی بھی لکھتا تھا۔ ایک پروفیسر تھے کرشن نرائن کٹکڑ، ہندی کے نقاد بھی تھے اور ہندی کا رسالہ بھی نکالتے تھے۔ کہیں سے بھی میری کہانی پڑھ کر ہندی میں اُس کا ترجمہ کرکے چھاپ دیتے اور اُس کے عوض میں مجھے دس روپے بھی دیتے۔ اس وقت دس روپے کی قیمت بھی بہت ہوتی تھی۔ ایک روز کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے ایک لکھنؤ یونیورسٹی کا ایم اے کا طالب علم مجھے ملا میری کہانیوں سے کافی متاثر تھا۔ کہنے لگا:

''آپ اتنا اچھا لکھتے ہیں کیا آپ ایم۔اے ہیں؟''

''نہیں میں تو صرف میٹرک پاس ہوں''

یہ سن کر اُسے بڑی مایوسی ہوئی۔ میری یہ بات پروفیسر کرشن نرائن کٹکڑ نے سن لی جو پاس ہی بیٹھے تھے۔ اُٹھ کر میرے پاس آئے اور کہنے لگے:

''اگلے سال تم بی۔اے کر رہے ہو۔ میں تمہارا نام لکھ رہا ہوں''

''مگر میں نے تو انٹر پاس بھی نہیں کیا؟''

''میں کچھ نہیں جانتا۔ تم کسی طرح بھی اس سال انٹر پاس کرو میں نے کہہ دیا سو کہہ دیا۔

مجھے بات بڑی مشکل ہی نہیں ناممکن سی لگی۔ مگر اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ میرے پڑوس میں ایک صاحب رہتے تھے پریم کُمار۔ انھوں نے بھی نئی نئی کہانی لکھنا شروع کی تھی۔ میں نے جب انٹر کی بات کی تو کہنے لگے میرے پاس فارم پڑا ہے جو میں اپنی بہن کے لئے لایا تھا۔ مجھے لگتا ہے وہ امتحان نہیں دے پائے گی اس لئے فارم تم بھرلو۔ اس طرح فارم ملا اور میں نے امتحان دے ڈالا اور پاس بھی ہوگیا۔ اگلے سال میں پروفیسر کٹکڑ کا شاگرد تھا۔ اس وقت میں ریلوے میں ملازم بھی تھا۔ گھر گرہستی، بچے اور کہانی لکھنے کا جنون اُوپر سے پڑھائی کے لئے وقت نکالنا بہت مشکل تھا۔ اس مشکل کو بھی کٹکڑ صاحب نے آسان بنا دیا۔ انھوں نے میرا ساتھ تب تک نہیں چھوڑا جب تک میں نے بی۔اے مکمل نہیں کرلیا۔ اکثر کافی ہاؤس میں ہی بیٹھے بیٹھے پڑھا دیتے۔ کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ میری فیس تک خود انھوں نے اپنی جیب سے دی۔ اس طرح میں نے بی۔اے مکمل کرلیا۔ 1945ء میں میٹرک اور اس کے پندرہ سال بعد یعنی 1960ء میں بی۔اے۔ اُس کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے ریڈیو اسٹیشن میں ملازمت مل گئی اور پھر ترقی کرتے کرتے میں سٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوا۔

اس سے بڑا اتفاق یہ ہے کہ ریلوے میں ایک صاحب رگھوں رام کام کرتے تھے جن کا تعلق یوپی کے SC طبقے سے تھا۔ اُس وقت ذات پات، چھوت چھات کی بڑی وبا پھیلی تھی۔ ایک روز مجھے ڈرتے ڈرتے پوچھنے لگے

''میں پڑھنا چاہتا ہوں۔ کیا میں بھی بی۔اے کرسکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں۔ بالکل کرسکتے ہو۔ کسی دن شام کو گھر آنا پھر بات

کرتے ہیں۔''

وہ ایک دن شام کو گھر آیا میرے بیوی بچوں سے ملا۔ جب میری بیوی نے اُس کے سامنے چائے ناشتہ رکھا تو اُس نے چائے کو ہاتھ تک نہ لگایا یہ کہہ کر خاموش ہوگیا کہ ''آپ کا دھرم خراب ہوجائے گا''۔ اس کی یہ بات میرے دل کو تیر کی طرح چبھ گئی۔ مجھ سے جتنا بن پڑا میں نے اُس کی مدد کی۔ داخلہ کروایا' کتابیں دیں اور سب سے زیادہ اُسے اس قدر حوصلہ دیا کہ اُسے خود پر اعتماد ہو جائے جس کی اُس میں بڑی کمی تھی۔ قصور اس کا نہیں معاشرے کا تھا۔ خیر اس نے محنت کی اور بی۔اے پاس کرلیا۔ پڑھائی مکمل کر کے اس میں اعتماد بھی پیدا ہوا اور اُسے ترقی بھی ملی۔ Sr Div.Personal Officer کے عہدے سے وہ ریٹائر ہوا۔ جب اس نے بی۔اے مکمل کیا تھا مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں نے کنگز صاحب کا قرض اتار دیا۔ دِیئے سے دیا جلا کر روشنی کردی۔

دوسرا اتفاق بھی بڑا دلچسپ تھا جسے بیان کرتے کرتے وہ دوبارہ ماضی کے پتے اُلٹنے لگے۔

اُن کے گاؤں (داؤد) میں ایک صاحب تھے مولوی برکت علی جنہیں وہ پیار سے برکت چاچا کہتے تھے۔ رتن سنگھ کے بھائی لکھنؤ میں پڑھتے تھے۔ وہ خود میٹرک کے بعد کالج نہیں جاسکے کیونکہ اُن کے والد کی طبیعت ناساز رہتی تھی اور اُن کی دیکھ بھال وہ ہی کرتے تھے۔ ایک روز چاچا برکت علی کہنے لگے کہ ریلوے میں کلرک کی اسامی کے لئے بھرتی ہورہی ہیں۔ تم بھی فارم بھر دو۔ انھوں نے یہ کہہ کر انکار کردیا کہ ''میں نے کلرک کی نوکری نہیں کرنی''۔ مولوی چاچا کہنے لگے ''چل اسی بہانے لاہور بھی دیکھ لیں گے'' اپنے آپ چاچا نے فارم بھرے پھر جمع بھی کروا دیئے۔ دونوں نے ریلوے کے امتحان دئے اور دونوں پاس بھی ہوگئے۔ دونوں کو ملازمت مل گئی اور دونوں نے نوکری جوائن بھی کرلی۔ یہ بات 1946ء کی ہے۔

ابھی نوکری جوائن کی تھی کہ والد صاحب کی طبیعت پھر بگڑ گئی اور انہیں چھٹی لے کر گھر جانا پڑا۔ اس وقت یہ قانون تھا کہ اگر چھٹی تین مہینے سے زیادہ ہوجائے تو نوکری سے برخاست کردیتے تھے۔ چاچا برکت علی فکر مند تھے کہتے رہے آجاؤ نہیں تو نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھو گے مگر وہ والد صاحب کو چھوڑ کر جانے کو تیار نہیں تھے۔ نوکری سے نکالنے کی فائل تیار ہوکر Controller کے پاس حکم کے لیے پیش کر دی گئی تھی۔ اس وقت کنٹرولر ایک انگریز افسر تھا۔ اس کے پی اے کا پیغام آیا کہ صاحب ملنا چاہتے ہیں۔ وہ ملنے چلے گئے افسر نے پوچھا:

''کیا بات تم نوکری پر کیوں نہیں آرہے؟''

''صاحب میرے والد بیمار ہیں اور میں اُنھیں چھوڑ کر نہیں آسکتا''۔

''کیا ہوا ہے اُنھیں؟''

''سر دماغی پریشانی (Mental Problem) ہے۔ اُنھیں چھوڑ نہیں سکتا۔''

اُس افسر نے اُسی وقت اپنے پی اے کو بُلایا اور کہا:

''آج کی ان کی جوائننگ (Joining) لے لو اور کل سے تین مہینے کی چھٹی منظور''۔

اُس افسر کی مہربانی سے مشکل آسان ہوگئی۔

پھر 1947ء کا بٹوارا ہوا تو وہ لوگ گھر سے بے گھر ہوگئے۔ بہت دکھ تکلیفیں سہنی پڑیں پر ایک بات یہ ہوئی کہ اُس نوکری کی بنا پر یہاں ریلوے میں نوکری مل گئی۔ اُس مشکل وقت میں وہ نوکری ہی سہارا تھی۔ ہر ماہ جب میں تنخواہ لاتا تو مجھے لگتا تھا کہ چاچا برکت علی میرے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں ''لے رکھ لے۔''

یہ کہتے کہتے رتن سنگھ جی کی آنکھیں نم ہوگئیں آواز بھر آئی اور میں اُن کے ساتھ جو ماضی کے سفر پر نکلی تھی پھر سے اس کمرے میں لوٹ آئی جہاں میں تھی۔ رتن سنگھ جی تھے اور دنیا کی سب سے خوبصورت عورت۔

''الف سے انار''

جس گاؤں میں رتن سنگھ نے آنکھ کھولی، اس میں صرف چھ سات گھر سکھوں کے تھے۔ پچاس ساٹھ گھر ہندوؤں کے، باقی مسلم آبادی تھی۔ تعلیم کا چرچا برائے نام تھا۔ رتن سنگھ نے شیشم کے درخت کے نیچے ٹاٹ پر بیٹھ کر اپنا پہلا سبق الف سے انار مولوی امام دین سے پڑھا۔ ان کے والد محترم نے کسی سکھ استاد کو تلاش نہیں کیا بلکہ اس کو منتخب کیا جو گاؤں میں اپنی علمی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا۔۔۔۔

رتن سنگھ جس طرح اپنے والد پرتاپ سنگھ کا احترام کرتے تھے بالکل اسی طرح اپنے استاد مولوی امام دین کی بھی عزت کرتے ہیں۔ آج بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اوپر سے وہ پرتاپ سنگھ ہیں اور ان کے اندر مولوی امام دین چھپے ہوئے ہیں۔

شورصہبائی (کراچی)

☆

سیال کوٹ کا لاڑا

رتن سنگھ

میں نے اپنی لاڑی کو بچپن میں اس وقت چن لیا تھا جب میں ماں کا دودھ پیتا تھا اور وہ لاڑی تھی ایک گوگلیانی۔

پنجاب میں گوگلیانی' راجستھان کی ان عورتوں کو کہتے ہیں جو گلی گلی' گھر گھر سوئیاں اور کندھوئیاں بیچتی ہیں۔ یہ سوئیاں' کندھوئیاں بیچتے ہوئے انہوں نے اپنے پکے ججمان بھی بنا رکھے ہیں۔ اپنے ججمانوں کے گھروں میں نئے بچے کی پیدائش پر لوریاں' شادی ہونے پر گھوڑیاں اور دوسرے خوشی کے گیت گایا کرتی ہیں' کوئی افسوس کا موقعہ ہو تو بین کے دردناک گیت گا کر اپنے ججمانوں کے دکھ درد میں شریک ہوتی ہیں۔

میری پیدائش کے موقع پر بڑی گوگلیانی چونکہ مرگئی تھی' اس لئے اس کی چودہ پندرہ سال کی بیٹی میری لوری کے گیت گانے آئی۔

گوگلیانی گاوے لوری
کا کا لمبڑی عمریا توری
اونچ اٹریا جو تو جائے
تجھ کو دنیا سیس نوائے
تیرا اونچا ہوا قبال
امبڑی لامصری کا تھال
گوگلیانی گاوے گھوڑی
لاڑا لاڑی بڑھیا جوڑی
جو تو بیاہ کرنے کو جائے
کوئی اپسرا بیاہ کر لائے
تیری چاچی ہوئے نہال
چاچی لامصری کا تھال
کا کا بلاں وچ مسکائے
دادی پیلاں پاندی آئے
متھا چمے مرچاں وارے
دادی پوتے توں بلہارے
اسکا مکھڑا سوہا لال
دادی لامصری کا تھال

میری ماں بتایا کرتی تھی کہ مجھے گود میں لے کر' گوگلیانی اپنی باریک لمبی آواز میں جب یہ لوری گا رہی تھی تو پتہ نہیں کب میں اس کے دودھ کو منہ میں ڈال کر چپل چپل پینے لگا۔ میں دودھ پی رہا تھا اور شرم کے مارے گوگلیانی کا چہرہ لال انار ہوتا جا رہا تھا۔

دادی نے جب مصری کے بھرے ہوئے تھال کے اوپر پانچ روپے رکھ کر گوگلیانی کی جھولی میں ڈالے تو بولی ''لے میں نے تجھے مصری کھلا دی تو بھی ماں بننے والی ہے' تو بھی مجھے مصری کھلا''۔ گوگلیانی نے شرم کے مارے مجھے اپنی چھاتی سے بھینچ لیا اور جب وہ مجھے ماں کی گود میں ڈالنے لگی میں واپس جا ہی نہ رہا تھا۔ اتنی اچھی لگی تھی مجھے گوگلیانی۔

جب میں کچھ بڑا ہوا تو گوگلیانی کی انگلی تھامے میں گلی گلی گھوما کرتا تھا۔ وہ سوئیاں اور کندھوئیاں بیچتی رہتی اور میں اس کے غرارے یا رنگ دار چنری کو تھامے اس کی طرف دیکھتا رہتا۔ جب وہ کسی کی لوری گاتی تو مجھ پر وجد کا سا عالم طاری ہو جاتا تھا۔ میں آنکھیں بند کئے اپنے کانوں میں اس کی میٹھی آواز کا رس گھولتا رہتا۔

لوگ مذاق میں اس سے پوچھتے کہ یہ تیرا کون لگتا ہے تو وہ ہنس کر کہتی ''یہ میرا لاڑا ہے''۔

رہی میری بات تو میں کہتا ہی تھا کہ میری لاڑی ہے۔

میرا جواب سن کر لوگ ہنستے اور میری لاڑی کا رنگ چنے کی طرح کھل اٹھتا۔

میرے ذہن میں اپنی اس لاڑی کی جو تصویر محفوظ ہے وہ کچھ اس طرح ہے کنوئیں کی طرح گہری تھوڑی کے اوپر شعلوں کی طرح دہکتے دو تراشے ہوئے ہونٹ ان کے اوپر لٹکتی تیکھی پتلی تلوار سی ناک' اس ناک پر رکھی ہوئی کٹار سی بڑی بڑی آنکھیں جن کے اوپر کالی بھنویں اس طرح جھکی رہتیں جیسے آنکھوں کی خوب صورتی کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی ہوں۔ اس کے ماتھے کے عین بیچ و بیچ بالوں کے چیر سے لٹکتی ہوئی چاندی کی زنجیر کے سہارے ایک ٹیکا جھولتا رہتا تھا۔ سر کے بیچ و بیچ چوک پھول اور اس چوک پھول کی اونچی ٹیسی پر اٹکا ہوا اس کی گہرے رنگ کی ساڑھی یا دوپٹے کا پلو' جو اس کے لمبے چہرے کو اپنے ہالے میں لئے رہتا تھا اور اس کی چنری کے رنگ کی دمک اس کے گورے رنگ پر پڑتی ہوئی کوئی ایسا جادو جگاتی جیسے قوس قزح کے ساتوں رنگ اس کے چہرے پر نکھر

آئے ہوں۔ پھر اس کے ہاتھوں سے لے کر کہنیوں تک اور کہنیوں سے لے کر کندھوں تک سفید' لال اور ہرے رنگ کا چوڑا بازوؤں کی ذارسی حرکت سے جھنجھنا اٹھتا تو مجھے ایسا لگتا جیسے چھاکے والے کنوئیں کی اونچی نشار کا پانی ''اولو'' میں گرتا ہوا میٹھا گیت گا رہا ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے بچپن میں میں اس کی گود میں بیٹھ کر اس کی چپکی ہوئی چولی میں ٹنگے چھوٹے چھوٹے شیشوں میں اپنا چہرہ دیکھا کرتا تھا۔ چہرہ دیکھتا اور اپنی چھوٹی چھوٹی انگلیاں ان شیشوں پر مار مار کر کہا کرتا تھا۔ ''میں یہاں بھی ہوں' میں یہاں بھی ہوں''۔

''میرا لاڑا تو میرے دل میں رہتا ہے وہ مجھے اپنے سینے سے بھینچ کر کہتی تھی۔''

پھر یہ ہوا کہ بچپن کے دن بہت پیچھے رہ گئے۔

آخری مرتبہ جب میں نے اپنی لاڑی کو دیکھا تب میں چودہ پندرہ سال کا بھرپور جوان ہو گیا تھا۔ جوان' لمبا چوڑا' چھ فٹ سے نکلتا قد' سر پر کلف لگی پگڑی باندھ کر میں پورا مرد لگتا تھا۔ اس بار جب وہ آئی تو میرے بڑے بھائی کی منگنی ہوئی تھی اور اس کی سسرال سے بڑے بڑے موتی چور کے لڈو آئے تھے۔ ایک ایک لڈو پاؤ پاؤ بھر کا تھا۔ اتنا موٹا کہ میرے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں نہ سماتا تھا۔

ہمارے گھر کے کھلے چوڑے آنگن میں گوگلیانی بدھائی کا گیت گا رہی تھی۔

ہوئی منڈے دی کڑمائی
گوگلیانی دے بدھائی
دوہٹی بیٹھی پیڑاڈاہ کے
گل وچ ہار ہمیلاں پا کے
اس کی گود میں کھیلے بال
امبڑی لامصری کا تھال

گوگلیانی گا رہی تھی' ناچ رہی تھی۔ ناچتی ہوئی جب وہ تیزی سے چکر پر چکر کاٹتی تو اس کا کھلا گھرا' چھتری کی طرح پھیل جاتا اور اس کے دوپٹے' اس کی چولی میں ٹنگے رنگ برنگے شیشوں سے رنگ برنگی کرنیں پھوٹتی رہتیں۔

اس موقعہ پر سب خوش تھے۔

سب اس کے تال میں تال ملا کر تالی بجا رہے تھے۔

اس تالی میں اگر کسی کے ہاتھ نہیں اٹھ رہے تھے تو میرے۔ میں اداس تھا۔ میرا بچپن بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اس لئے گوگلیانی کی انگلی تھامے اس کے ساتھ نہیں گھوم سکتا تھا۔ اب میں اس کے ڈیرے میں جا کر اس کی گدڑی کے نرم اور گرم بستر میں اپنی لاڑی کے سینے سے لگ کر نہیں سو سکتا تھا اور ابھی میں پورا مرد نہیں بنا تھا کہ کھل کر اس سے اپنے عشق کا اظہار کر دوں۔ میں تو اب بھی سوچ رہا تھا کہ وہ میری لاڑی ہے اور اب سر پر کلف دار پگڑی باندھے پورا مرد بننے کی کوشش کے باوجود مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب مجھے لاڑی کے سینے سے لگ کر جو سکھ مل سکتا ہے اسے کیسے حاصل کروں۔ اس ناچ جاری تھا اس کے گیت کی باریک دھن اب بھی میرے کانوں میں رس گھول رہی تھی اور اس رس کا نشہ دھیرے دھیرے میرے وجود پر چھا رہا تھا لیکن مجھے مکمل سرشاری نہیں مل رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے بڑے ہونے کے ساتھ ہی میری لاڑی مجھ سے دور ہو گئی ہے۔ شاید اسی لئے اس نے ابھی تک میری آنکھوں میں جھانک کر نہیں دیکھا تھا۔ پہلے کی طرح اپنے سینے سے لگا کر مجھ سے پیار نہیں کیا تھا۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے میں بار بار اپنے بچپن میں لوٹ جاتا لیکن لاڑی کے جسم سے نکلتی کرنوں کی رنگینی مجھے واپس آنگن میں لے آئی۔

میری اداسی کو شاید گوگلیانی نے بھانپ لیا۔ مجھے پتہ ہی نہ چلا کہ ناچتے ناچتے کب اس کا بازو کوند کر لپکا۔ مجھے تو تبھی پتہ چلا جب اس نے بازو سے پکڑ کر مجھے آنگن کے بیچ و بیچ کھینچ لیا اور میرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے میرے جوان چہرے کے دونوں طرف ناگن کی طرح سر گھماتے' میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال اس نے گیت کا مکھڑا اٹھایا۔

میرا لاڑا کھڑا اداس
میں تو جاتی اس کے پاس
میری دولت اس کا پیار
اپنی جان میں کروں نثار
یہ تو میرا قیمتی لعل
امبڑی لامصری کا تھال

گیت جاری تھا۔ لاڑی میرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گدے کی تال میں ناچ رہی تھی۔ چاروں طرف کھڑے میرے گھر والے اور محلے بھر کی عورتیں مرد اکٹھے ہو کر اپنی تالی سے تال دے رہے تھے، ہنس ہنس کر دوہرے ہو رہے تھے اور میرے لئے تو جیسے وقت کا چلتا ہوا چکر رک گیا تھا۔ آسمان سے امرت کی گنگا اتر رہی تھی اور دھرتی اس امرت کو گرہن کر کے سچے سکھ کا آنند لے رہی تھی۔ اس سرشاری میں میری آنکھیں مندی جا رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں اتنی تاب ہی نہیں تھی کہ میں اپنی لاڑی کے سورج کی طرح چمکتے چہرے کی طرف دیکھ سکوں۔

مجھے ہوش اس وقت آیا جب میں نے دیکھا کہ لاڑی میری دادی کے لائے ہوئے لڈوؤں سے بھرے تھال کو اپنے جھولے میں ڈال رہی تھی۔ لڈو جھولے میں رکھ کر اس نے تھال میں رکھے چاندی کے دس سکے بھی اٹھائے اور انہیں بھی اپنے جھولے کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔

گوگلیانی میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ مجھے بہت اچھا لگا۔ میں نے ایسا محسوس کیا کہ اب لاڑی کے لیے وہاں سب کے موجود ہونے کے باوجود اور کوئی موجود نہیں تھا اگر کوئی تھا تو صرف میں' جس کی طرف دیکھ کر وہ بار بار مسکرا

رہی تھی۔

اس نے ذرا سا دم لے لیا تو وہ خود ہی بولی۔ اب تک تو میں بڑے بیٹے کی کڑمائی کی بدھائی دینے کے لئے گا رہی تھی۔ اب میں صرف اپنے لاڑے کے لئے گاؤں گی۔ یہ کہہ کر اس نے ایک ادا سے شرارت بھری نظر سے میری طرف دیکھا۔ میں تو پہلے ہی اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا جو ناچتے ناچتے سرخ انار ہو رہا تھا۔ میرے اندر کا جوان مرد یہ سوچ رہا تھا کہ یہ عورت کسی طرح بھی چونتیس پینتیس کی نہیں لگتی۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے وقت اس کے لئے ٹھہر گیا ہو۔ گزرتے ہوئے وقت کا اس پر کچھ بھی اثر نہ پڑ رہا ہو اور جیسے وہ میری ہم عمر ہی ہو۔

اتنے میں اپنے جھولے کو سمیٹتی ہوئی وہ اٹھی اور پھر کھڑے ہو کر بازو لہرا کر اس نے ایک ہاتھ کان پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے مجھے اپنی طرف کھینچ کر اس نے مجھے اپنے سینے سے لگا کر میرے ماتھے اور گال کو چوم کر گیت کی تان اٹھائی۔

مجھ کو مل گیا میرا لاڑا
جیون بھر کا ساتھ ہمارا
ہم نے چن لی اپنی راہ
ٹنڈے لاٹ کی نہیں پرواہ
منڈیا میں مچھلی تو جال
دادی لامصری کا تھال

گوگلیانی مجھے اپنے ساتھ لے کر گا رہی تھی' ناچ رہی تھی' میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے اپنے حسن کے جادو سے مسحور کر رہی تھی۔ سب ہنس رہے تھے خوش ہو رہے تھے۔ لیکن میری خوشی کی کوئی تھاہ نہیں تھی۔

لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ جس مقام پر خوشی کی انتہا ہوتی ہے وہ مقام سوئی کی نوک کے ہزارویں حصے سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ انسان کا وجود تو دور رہا۔ وہ اپنے تصور میں بھی اس مقام پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اس اونچائی سے اس قدم جب پھسلتے ہیں تو وہ رنج کی گہری کھائی میں جا گرتا ہے اور وہ خوشی جسے پانے کے لئے اس کا من مچلتا رہتا ہے' وہی سوئی کی نوک کی طرح اس کے وجود کے روئیں روئیں میں چبھ کر اسے چھلنی کرتی رہتی ہے' لہولہان کرتی رہتی ہے۔

یہی میرے ساتھ ہوا۔

زندگی کے اس موڑ پر جہاں گوگلیانی نے میرے گھر والوں کے سامنے مجھے اپنا لاڑا مان کر زندگی بھر ساتھ رہنے کا گیت گاتے ہوئے کہا تھا کہ اے لڑکے میں مچھلی ہوں جو تمہارے جال میں پھنس چکی ہے۔

ہاں زندگی کے اسی موڑ پر میرا دل غم سے روشناس ہوا۔

ہوا یہ کہ میری لاڑی نے جب سے میرے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر یہ گیت گایا تھا کہ

مجھ کو مل گیا میرا لاڑا
جیون بھر کا ساتھ ہمارا
ہم نے چن لی اپنی راہ
ٹنڈے لاٹ کی نہیں پرواہ
منڈیا میں مچھلی تو جال
دادی لامصری کا تھال

بس اسی وقت سے مجھ پر نشہ سا طاری تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن جب لاڑی اپنا سوئیوں کندھوئیوں والا تھیلا کاندھے سے لٹکائے ہمارے گھر سے اپنے ڈیرے کی طرف گئی تو میں ہانپتا کانپتا گھر کی چھت پر چڑھ کر کھیتوں کی پگڈنڈیوں میں اٹھلا اٹھلا کر چلتی اپنی لاڑی کو اس وقت تک دیکھتا رہا جب تک وہ مجھے دکھائی دیتی رہی تھی۔

اور جب وہ آموں کے جھنڈ کے پاس جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تب بھی میرے تصور نے اسے اس پگڈنڈی کے ہر موڑ پر کھڑا کر کے دیکھا کہ وہ وہاں کتنی خوب صورت لگتی ہے۔

میرے ہونٹ انہی بولوں کو گنگناتے رہے
منڈیا میں مچھلی تو جال
منڈیا میں مچھلی تو جال

لیکن میرا یہ سپنا جاگتے میں دیکھا ہوا سپنا تھا۔

اس مقام پر جب میرے دل کو کسی طرح قرار نہیں آیا تو میں نے ماں سے سفید شلوار مانگی۔ اپنے بڑی بھائی کی شہر سے دھل کر آئی استری کی ہوئی قمیض پہنی۔ سر پر کلف لگی پگڑی باندھی اور اس طرح اپنی طرف سے پورا چھیلا بن کر میں گوگلیانی کے ڈیرے کی طرف چل دیا۔

شام کے وقت اچھا خاصا جمگھٹ لگتا تھا۔

گوگلیانیوں کے مردوں کی بھٹیاں جن میں دن کے وقت وہ کسانوں کے لئے درانتیاں و کھرپیاں بنایا کرتے تھے' شام کے وقت وہ الاؤ میں تبدیل ہو جاتیں' ان میں ایک طرف گوگلیانیاں کھانا بناتیں اور دوسری طرف مرد آگ سینکتے رہتے' گودھول کے وقت جب کسان اور چرواہے لوٹتے تو ان کے جلتے ہوئے الاؤ کے گرد کبھی کبھی گانے بجانے کے پروگرام بھی ہو جاتے۔

اس دن شام کے دھندلکے میں جب میں وہاں پہنچا تو ویسا ہی جمگھٹ لگا ہوا تھا۔ سب لوگ ارد گرد کھڑے تھے اور میری لاڑی بیچ میدان میں بوڑھے نمبردار کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ناچ رہی تھی گا رہی تھی۔

آیا سیالکوٹ کا لاڑا
یہ تو من کا میت ہمارا
میں نے ایسی جوت جلائی
اس کی لوٹ جوانی آئی

اس کو مل گئے بیتے سال
بوڑھے لامصری کا تھال

لاڑی بے سدھ ہو کر گا رہی تھی۔ وہی شمع کی طرح دہکتا چہرہ' وہی ناگن سی لہراتی اس کی چوٹی اور۔۔۔۔

میرے دل پر چوٹ لگی۔ یہ تو میری لاڑی ہے صرف میری اور یہ کسی دوسرے کے ساتھ ناچ رہی ہے۔

زخمی سانپ کی طرح پھنکارے مارتا میں الٹے پاؤں واپس لوٹ آیا تو لاڑی نے آدھے راستے میں مجھے آدبوچا۔

''تم لوٹ آئے ناراض ہو کر.....ارے پگلے یہ ہماری روزی روٹی ہے۔ نمبردار کے ساتھ تو میں ڈھونگ کر رہی تھی۔

لیکن میرا غصہ کافور نہیں ہوا۔

میں آنکھوں میں آنسو بھرے لوٹ آیا۔

اس رات میں نے کھانا نہیں کھایا اگلے دن بھی نہیں۔ سارا دن اپنے گھر کی پچھلی اندھیری کوٹھری میں رضائی میں دبکا پڑا رہا۔ وہ رات وہ دن میرے لئے زندگی کی سب سے اندھیری رات تھی جس میں میرے تن بدن پر کانٹے چبھتے رہے' روح لہولہان ہوتی رہی۔

اگلے دن گوگلیانی آئی تو اسے دادی سے پتہ چلا کہ میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔ جب اس کے آواز دینے پر بھی میں باہر نہیں آیا تو خود ہی اندر آ گئی۔ آتے ہی میرے ساتھ رضائی میں لیٹ گئی۔ مجھے سینے سے لگا کر پیار کیا۔ اپنے دوپٹے سے میرے آنسو پونچھے میرے ماتھے اور گالوں کو چوما۔

اتنے میں اس کے اشارے پر دادی میرے لئے چاولوں کی تھالی بھر کر لے آئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے ایک ایک لقمہ کر کے مجھے چاول کھلائے۔ آخری لقمے پر بولی ''لے یہ بھی کھالے' اتنے پیار سے تو میں نے اپنے خصم کو بھی کھانا نہیں کھلایا ہوگا''۔

پھر وہ پاس کھڑی دادی سے بولی ''سردارنی تمہارا یہ پوتا بھی اب جوان ہو گیا ہے۔ اس کے لئے بھی بڑھیا سی لاڑی ڈھونڈ تو پھر میں اس کے بیاہ کی گھوڑی گانے آؤں گی''۔

''تُو کیا دے گا رے' سیالکوٹ کے لاڑے' مجھے اپنی گوڑی گانے کا'' اس نے بڑے پیار سے ٹھوڑی سے میرا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''تمہاری جیسی سندر چاندسی بہو''۔ میں نے کہا

''یہ بات ہوئی نہ کچھ''۔

''لیکن وہ میری لاڑی کی بہو ہوگی' نمبردار کی لاڑی نہیں'' میں نے شرارت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اسکی ہنسی کے ساتھ ہی اس اندھیری کوٹھری کا کونہ کونہ میری لاڑی کے حسن کی چمک سے جگمگا اٹھا۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پر ماں کی ممتا چھلک رہی تھی اور محبوبہ کا پیار بھی۔

''فرد کی روح''

رتن سنگھ زندگی کے سرچشمہ کی تلاش میں مختلف زاویوں سے فرد کی روح تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ بات انکی تخلیقی رو کی نشاندہی کرتی ہے۔ ان کے افسانوں میں محسوسات کی کارفرمائی ملتی ہے۔ اور اس طرح جو وژن ابھرتا ہے، وہ بڑا جاندار، حقیقت خیز، انوکھا اور اچھوتا ہوتا ہے۔

مہدی جعفر (الہ آباد' بھارت)

☆

''اردو ادب کے نورتن''

ایک سے زائد جہات کے حامل اہلِ قلم قاری کو اکثر پریشانی میں مبتلا رکھتے ہیں۔ پڑھنے والے کے لیے یکسُو ہو کر فوری طور سے کوئی رائے قائم کرنا مشکل ہوتا ہے۔ یہی حال ہمارے رتن سنگھ جی کا ہے۔ یہ اکیلے رتن نہیں بلکہ اُردو ادب کے نو رتن ہیں۔ افسانہ، ڈرامہ، ترجمہ، شاعری، تنقید خدا معلوم اور کن کن شعبوں میں طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ چہارسو کی زیرِ نظر اشاعت اس حوالے سے نیک شگُن ہے کہ ایک ہی وقت بلکہ ایک ہی نشست میں جناب رتن سنگھ کے افکار و خیالات اور ان کی تخلیقات کے مطالعے کی روشنی میں، قاری ٹھوس رائے قائم کرنے میں آزادی بلکہ آسانی محسوس کرے گا۔

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ
(دہلی' بھارت)

☆

سنگھاسنبنیسی

(ایک منی ڈرامہ)

رتن سنگھ

پُتلی: اے راجہ بھوج! اٹھا سکتا ہے راج پاٹ کا بوجھ۔ راج تخت پر بیٹھے وہ، جو پورا قلندر ہو۔

بھوج: اپنی بات کا راز تو کھول۔ جو کہنا ہے کھل کر بول۔

پُتلی: جانتے ہو راجن! راجہ کیسا ہوتا ہے؟

بھوج: کیسا ہوتا ہے؟

پُتلی: راجہ پیڑ کے جیسا ہوتا ہے۔

بھوج: میں کچھ سمجھا نہیں!

پُتلی: سمجھتا وہ ہے، جو سمجھنا چاہتا ہے۔ جو نہیں سمجھتا وہ بغیر سمجھے ہی راج تخت پر قبضہ کرنے کے لئے بھاگتا ہے۔

بھوج: تو آدمی کیا کرے؟

پُتلی: راج سنگھاسن پر بیٹھنے کے نیم پڑھے۔ اُن پر عمل کرے اور سب سے ضروری یہ کہ اپنے آپ کو راج سنگھاسن کے لائق سدھ کرے۔

بھوج: کیسے ہوتے ہیں راجہ کے گُن؟

پُتلی: سننے کی ہمت ہے تو سُن۔ میں نے کہا نہ راجہ پیڑ کے جیسا ہوتا ہے۔ کہو تو پیڑ کے گن بتاؤں؟

بھوج: ہاں بتاؤ۔

پُتلی: تو اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ پیڑ سارے آسمان سے اُترتی ہوئی کڑی دھوپ سہتا ہے۔ اور اپنے نیچے بیٹھنے والوں کو ٹھنڈی میٹھی چھاؤں دیتا ہے۔

بھوج: تم کہنا کیا چاہتی ہو۔

پُتلی: یہی راجہ کا فرض ہے۔ یعنی پرجا کا سُکھ۔ راجہ کے سر پر قرض ہے۔ جو یہ قرض چکا سکتا ہے وہی انصاف پسند راجہ وکرمادتیہ کے تخت کی طرف آ سکتا ہے۔ یہی وکرمادتیہ نے کیا تھا۔ اُس نے خود دُکھ سہے تھے۔ پرجا کو سکھ دیا تھا۔ تب یہ سنگھاسن چمکتا تھا۔ ہیرے سا دمکتا تھا۔

بھوج: اُس کے بعد کیا گھٹا کہ یہ سنگھاسن منوں مٹی کے نیچے دبا رہا۔

پُتلی: اُس کی کہانی بہت دُکھ دائی ہے۔ اسے یاد کر کے میری آنکھ بھر آئی ہے۔

بھوج: دل دُکھی نہ کرو۔ کھول کر ساری بات کہو۔

پُتلی: راجہ وکرمادتیہ کی مرتیو کے بعد جب راج کمار باپ کے تخت کی طرف بڑھا، تو اُس پر بیٹھ نہ پایا، تخت کو چھوتے ہی گر پڑا۔

بھوج: گر پڑا۔

پُتلی: گر پڑا اور مورچھت ہو گیا۔

بھوج: بے ہوش ہو گیا؟

پُتلی: بے ہوشی کی حالت میں وہ کیا دیکھتا ہے کہ اُس کا باپ وکرمادتیہ سامنے کھڑا ہے۔

بھوج: مرا ہوا باپ۔ وہ وہاں پر کیسے آیا؟

پُتلی: یہ نہ پوچھو کہ کیسے آیا؟ یہ پوچھو کہ اُس نے بیٹے کو کیا بتایا۔

بھوج: کیا بتایا؟

پُتلی: ہوا یہ راجن کہ اُس وقت راجکمار گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ تبھی وہاں شیر آ گیا۔ شیر کو دیکھ کر راجکمار، اپنی جان بچانے کے لئے پیڑ پر چڑھ گیا۔ شیر نے گھوڑے کو کھا لیا۔

بھوج: پھر؟

پُتلی: پھر کیا۔ یہی دیکھ کر وکرمادتیہ نے راجکمار سے کہا کہ جس گھوڑے پر تو سواری کر رہا ہے۔ تو آج اسے نہیں بچا سکا، تو جس پرجا پر تم راج کرو گے، اُس کی حفاظت کیسے کرو گے؟ تم راج تخت پر بیٹھنے کے لائق نہیں ہو۔

بھوج: پھر کیا ہوا۔

پُتلی: ہونا کیا تھا۔ وکرمادتیہ کا سنگھاسن ہزاروں سالوں تک منوں مٹی کے نیچے دبا رہا۔ اور نتیجے کے طور پر جنتا کا جیون دُکھ درد سے بھرا رہا۔

بھوج: اب میں کیا کروں۔ بتاؤ۔

پُتلی: اپنے ملک میں سُکھوں کی بہار لاؤ۔ پوری دنیا میں امن کا ماحول بناؤ۔ یگوں یگوں تک راج کماؤ..... ورنہ

بھوج: ورنہ کیا۔

پُتلی: ورنہ سنگھاسن پھر پاتال میں چلا جائے گا اور پھر کسی کے ہاتھ نہیں آئے گا۔

''انگاں دے بُوٹے''

(جناب رتن سنگھ کی اردو، پنجابی شاعری سے مختصر انتخاب)

فاری شا (راولپنڈی)

پنجابی غزل

انگاں دے بُوٹے ہَولی ہَولی سَکّن لگ پئے نیں
اپنے ہڈ ہی اپنے تن وچ چبھن لگ پئے نیں

بالےسن یاداں دے دیوے، ہنیرے ہوئے کم آون گے
متر کالاں ویلے اِک اِک کر کے بجھن لگ پئے نیں

نانک وی ایہہ منداسی کہ''ہسنا کھیڈنا من کا چاؤ''
اپنے من توں خوشیاں کھیڑے رسّن لگ پئے نیں

ساری عمر پیار دیاں تنداں جس چرخے تے کتیاں سن
تنداں دھاگے اُس تکلے تے ٹٹن لگ پئے نیں

دِل دِیاں سجناں متراں تو ملیئے تاں کِدّاں ملیے
اونہاں دے ٹھور ٹھِکانے وی ہُن بھُلن لگ پئے نیں

سٹّاں پیاں دِسّن کدھرے، تاں اوہڑ کراں کجھ پوہڑ کراں
ہن زخماں ہی ہڈ تر لو مچھی، چُھن لگ پئے نیں

دوجے نُوں کی آکھن جاواں، اپنے تے اعتبار اُٹھ گیا
پھڑ پھڑ کردے ہتھاں دے طوطے اُڈن لگ پئے نیں

ہن تے مینوں کُوچ دا ویلا لاگے آیا لگدا اے
ٹری واس وی اپنے تنبو پٹّن لگ پئے نیں

گیت

آئی ملن دی رات
بُلیاں اُتے کمبنی لے کے
نیناں وچ برسات
آئی۔۔۔۔
جُگّاں لمّی پریت اساڈی
جُگّاں لمّی اڈیک اساڈی
برہوں کٹھے سمیاں پچھوں
اِک پیار دی جھات
آئی۔۔۔۔
عشق تے رُوپ نے پا گلوکڑی
ہکڑی دے نال لا کے ہکڑی
اِک دُوجے نوں بھٹیاں کیتی
ہنجواں دی سوغات
آئی۔۔۔۔
انگاں دے وِچ پیار دی تھرکن
دو دِلاں دی مِل گئی دھڑکن
دو جنداں رل اِکو ہوئیاں
پُورن رسِک ملاپ
آئی۔۔۔۔
ارماناں دے دیپ جلائی
وسلاں والی رات اے آئی
اج نہ ککڑ بانگاں دیوے
نہ ہووے پربھات
آئی ملن۔۔۔۔

نظم

۱
دوپٹہ اِسکا دھانی ہے
رنگ اصلی آسمانی ہے
جیون کی ڈالی پہ مہکی
یہ لڑکی رات کی رانی ہے

۲
تٹ پر پانی بھرنے آئی
ندی کا رک گیا پانی ہے
لہریں ٹھاٹھیں مار رہی ہیں
ایسی چڑھی جوانی ہے

۳
کبھی ہنسائے کبھی رلائے
کرتی پھرے منمانی ہے
مٹک مٹک کر گھوم رہی ہے
چال بڑی مستانی ہے

۴
مایا جال بچھایا اِس نے
سدا کاتتی تانی ہے
ساری دنیا سپنے دیکھے
یہ میری بن جانی ہے

۵
اُروشی اس کی باندی ہے
مینکا بھرتی پانی ہے
اِندر پر نگرانی رکھتی
لوگ کہیں اندرانی ہے

۶
کوئی نہ ٹھہرے اِس کے آگے
ایسی تیز روانی ہے
دلوں کی ساری دنیا جیتی
بن بیٹھی پٹ رانی ہے

۷
اِس کے حسن و عشق کا قصہ
وہ تو بہت طولانی ہے
لیلہ مجنوں ، سسی پُنوں
سب قصّوں کی بانی ہے

۸
کیا بتلائیں کون کون سی
الٹی ندی بہانی ہے
ساری دنیا پاگل ہوگئی
جب یہ ہوئی سیانی ہے

۹
دل کی دولت سب کی لے لی
خود تو بنی سیٹھانی ہے
پھر بھی کنجوس ہے ایسی
ہر دم آنا کانی ہے

۱۰
اِس کا پیچھا کرنا یارو
سب سے بڑی نادانی ہے
عشق و محبت کی باتوں میں
افلاطون کی نانی ہے

۱۱
ایک عمر گزار کے ہم نے
اتنی بات ہی جانی ہے
سب گاتھا ہے اِس کی گاتھا
اِس کی سبھی کہانی ہے

۱۲
تیرے میرے دل میں رہنا
اِس کی ادا پرانی ہے
نام جو تم نے پوچھا ہے تو
نام اِس کا زندگانی ہے

۱۳
دوپٹہ اِس کا دھانی ہے
رنگ اصلی آسمانی ہے
جیون کی ڈالی پہ مہکی
یہ لڑکی رات کی رانی ہے

سفنے والی دھرتی

اِک دھرتی میرے سُفنے اندر
کدی کدی آجاندی
جس دی مِٹھی اِک دید توں
روح میری نشیاندی

دھرتی جتھے پہلی واری
نین اپنے کھولے
اج اوہ میرے نیناں کولوں
ہائے! کیوں ہو گئی اوہلے

واہ ونڈ ایہہ وطن میرے دی
واہ راجنیتی چالاں
کی آکھاں ؟ کجھ وس نہ چلے
کِدھاں جوڑ بہالاں

دھرتی جتھے جمیا پلیا
تکیّاں کئی بہاراں
کھِدو کھونڈی ، گلی ڈنڈا
کھیڈیا رل کے یاراں

گُھمیاراں والے برنے جھتے
جھنڈے شاہ دا ڈیرا
ساڈے کھوہ دے پرلے پاسے
اسی والا میرا

ہرنے جتھی لہندی سی
اک پاشے والی ٹولی
ڈیرا جتھے کھیڈے سی نِت
چیچو چیچ کچولی

اسی جس توں انب توڑ دے
فضلے آ پھڑیا
میرا جتھے نِکے ہندے
ٹھونہاں سی اِک لڑیا

اج مینوں جد اوس دھرتی دی
یاد کدے آجائے
دِل میرا پھر اتھرو بن کے
نیناں تھیں ویہہ جائے

گلی گلی دی یاد اے
میرے سینے دے وچ وسّی
کہ طبیلہ ذیلداروں دا
کی چوہڑیاں دی ٹھٹّی

مل جاندا سی نیہرے ہوئے
جد کہ بابا ماکھا
کہندا سی اوہ ''گھر نہیں جاندا''
ہو کے لوہا لاکھا

''اللہ رکھے ، جوانی مانیں''
''عمراں دُون سلائی''
سِیاں دیندی تھکدی نئیں سی
بڈھی سراجاں دائی

نِکیاں نِکیاں یاداں جدوں
مٹھّیاں مٹھّیاں چھاواں
اِک اِک نِکی یاد دے بدلے
جیون بھلدا جاواں

سفنے دے وچ ڈورا بھَورا
اوس دھرتی تے گھُماں
رکھاں ٹُوں میں چھیاں پاواں
ڈھٹّیاں کندھاں چُماں

ٹُٹ ٹُٹ جاندے سفنے میرے
بُھل بُھل جاندیاں یاداں
جیوں جیوں دھیرج دل ٹُوں دیواں
تیوں تیوں پَین تراٹاں

ایس دھرتی دی ہک دے اُتے
لِیک کِسے نیں واہی
پتیراں کولوں راہ نیں نکھڑے
راہاں کولوں راہی

بیلیاں کولوں بیلی نکھڑے
ہانیاں کولوں ہانی
کِتھوں تیک میں دساں یارو
لمّی رام کہانی

اِک دھرتی میرے سُفنے اندر
کدی کدی آجاندی

دوہے

راجہ کے دربار میں کھڑا ہوں میں دلگیر
انصاف ملیگا کس طرح اونچی ہے زنجیر

جاتے جاتے شام کو ،اتنا کہہ گئی دھوپ
آدھی رات کو آؤنگی ،دھار چاندی روپ

ڈنک سہیں اور شہد دیں سارے بن کے پھول
رتی تو بھی کر کبھی ،ایسی میٹھی بھول

چل رتی اب اٹھ، چل ہو گیا تیرا کام
لہر سے مل کر لہر ہو گیا ،ریت سے لکھا نام

خانہ بدوشوں کی طرح ،سر پہ اٹھایا گھر
عزرائیل فرشتہ ڈھونڈھ رہا ہے در در

گر گر جائے اوڑھنی انگ انگ کرے فتور
بنجارن کا روپ ہے یا لڈو موتی چور

دریا بہتا جائے ہے اور رہتا بھی جائے
بہے بھی اور رہے بھی کوئی ایسا کرے اُپائے۔

توڑ کے پھول گلاب کے مالن بھر لی جھول
رتی پڑھ لے اسی سے نکاہ کے دو بول

کون کسی کا باپ ہے ،کون کسی کا پوت
سب کا تیں سنسار میں،اپنا اپنا سوت

تعبیر خوابوں کی

نند کشور وکرم (دہلی، بھارت)

کچھ حادثات وواقعات اور کردار وافراد ایسے ہوتے ہیں جو انسان کی زندگی پر اپنے نقوش اتنے گہرے ثبت کر دیتے ہیں کہ برسوں گزر جانے پر بھی انہیں اپنے دل ودماغ سے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ خصوصاً جب فرصت کے اوقات میں وہ تنہا ہوتا ہے تو وہ حادثے.....وہ افراد..... وہ کردار.....اس کے ذہن کے نہاں خانوں سے نمودار ہوکر اس کی یادوں کے پردے پر بائیسکوپ کی تصاویر کی مانند متحرک ہواُٹھتے ہیں۔ سنت رام کی زندگی میں بھی دو ایسے ہی کردار آئے تھے جنہیں زندگی کا طویل عرصہ گزر جانے پر بھی وہ اپنی یادداشت کی تختی سے مٹا نہیں پایا اور جب بھی وہ فرصت کے لمحات میں اکیلا ہوتا تھا تو وہ چپکے سے آکر اس کی یادوں کے گوشے سے باہر نکل کر اس کے دل ودماغ میں ہلچل مچا دیتے تھے۔ ان کرداروں میں سے ایک اس کے مڈل اسکول کے اُستاد ماسٹر رام سنگھ چودھری تھے اور دوسرا اُس کا بچپن کا ساتھی کھڑکو رام۔

رام سنگھ چودھری یوں تو اسکول میں ایک معمولی اُستاد تھے لیکن اُن کو سبھی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ شہر کے ایک معروف سوشل ورکر تھے اور شہر کے مسائل میں گہری دلچسپی لینے کے علاوہ ہر ایک کے دکھ سکھ میں شریک ہونا اور ان کی مدد کرنا اپنی زندگی کا ایک اہم فریضہ سمجھتے تھے۔ وہ ہمیشہ سفید کھدر کے کرتے پاجامے میں ملبوس نظر آتے جس میں سردیوں میں کالے رنگ کی جیکٹ کا اضافہ ہوجاتا تھا۔ بچوں سے انہیں خاص طور پر اُنس تھا اور انہیں پڑھا لکھا کر ان کے مستقبل کو سنوارنا انہوں نے اپنی زندگی کا منتہائے مقصود بنا رکھا تھا۔

آزادی سے پیشتر جب وہ آٹھویں کلاس کے طالب علم تھے کہ ۱۹۴۲ء میں گاندھی جی کی ''ہندوستان چھوڑو'' تحریک سے متاثر ہوکر وہ پڑھائی کو خیرباد کہہ کر ملک کو برطانوی سامراج کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے جنگ آزادی میں کود پڑے۔ اور اس پاداش میں انہیں کوئی ڈیڑھ دو سال قید بھی بھگتنی پڑی۔

جب ملک آزاد ہوگیا تو انہوں نے پرائیویٹ طور پر میٹرک، بی اے کے امتحان پاس کئے اور پھر دہلی یونیورسٹی سے بی ٹی کرنے کے بعد کوئی اور ملازمت اختیار کرنے کے بجائے اسکول کی ماسٹری کو سب پر ترجیح دی اور اسکول میں بطور استاد کام کرنے لگے کیونکہ اُن کی زندگی کا ایک ہی مشن تھا.....بچوں کی زندگی سے ناخواندگی کے اندھیرے کو دور کر کے انہیں روشن مستقبل کے کی منزل تک پہنچانا۔ ان کی بول چال اور طلباء سے ان کا برتاؤ اتنا اچھا تھا کہ وہ اسکول میں بے حد مقبول وہر دلعزیز تھے اور ان کی آدرش وادی ورانتہائی سادہ زندگی سے کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا تھا۔

اور کھڑکو رام.....؟ ابتدائی جماعت سے ہی سنت رام کا گہرا دوست تھا۔ کلاس میں وہ دونوں ذہین طلباء میں شمار ہوتے تھے اور اکثر وہی دونوں جماعت میں اول یا دوم آتے تھے، لیکن جب وہ چوتھی جماعت میں تھے تو ایک دن کھڑکو رام کے والد نے جو محلے میں صفائی ستھرائی کا کام کرتا تھا اسے اسکول سے اُٹھوا لیا۔ حالانکہ وہ پڑھائی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا اور اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر کسی دفتر میں کام کرے مگر اس کی اپنے باپ کے سامنے ایک نہ چلی اور اسے اسکول چھوڑنا پڑا۔

جب ماسٹر رام سنگھ جی کو معلوم ہوا کہ کھڑکو کے والد نے اسے اسکول چھڑوا کر اپنے کام میں لگانے کا فیصلہ کرلیا ہے تو انہوں نے اسے سمجھانے کے لئے اس کے گھر جانے کی ٹھان لی۔ اور شام کو جب اسکول میں چھٹی ہوئی اور سنت رام بستہ اُٹھا کر گھر جارہا تھا تو ماسٹر رام سنگھ نے اسے آواز دی۔ ''سنت رام رک جاؤ۔''

سنت رام ٹھٹک کر وہیں رک گیا۔ اس نے سوچا۔ معلوم نہیں آج کیا غلطی ہوگئی ہے جو ماسٹر جی نے چھٹی کے بعد اسے روک لیا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ان کے پاس پہنچا اور بولا۔ جی ماسٹر جی!

کیا تم کھڑکو رام کا گھر جانتے ہو؟

''جی''

تو چلو میرے ساتھ۔ مَیں اس کے پتاجی سے ملنا چاہتا ہوں۔

''جی چلیے''

پھر وہ دونوں کھڑکو رام کے گھر کی طرف چل پڑے جو شہر کی ایک بیرونی بستی میں آباد چھوٹے چھوٹے مکانوں پر مشتمل ایک تنگ اور متعفن اور اوبڑ کھابڑ گلی میں واقع تھا۔ ماسٹر جی گلی میں داخل ہوتے ہی کچھ ہچکچا کر رک گئے شاید گلی کی گندگی اور سڑاند نے چند ثانیوں کے لئے ان کے قدم روک دئے تھے۔ پھر وہ سنت رام کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کھڑکو رام کے گھر کے سامنے پہنچ گئے جو صرف ایک چھوٹے سے کمرے پر مشتمل تھا اور جس میں گھر کے آٹھ افراد جانوروں سے بھی بدتر زندگی بسر کرتے تھے۔ کمرے کے باہر چھوٹے سے دالان میں کھڑکو کی ماں بیٹھی کھانا بنا رہی تھی اور پاس ہی چارپائی پر بیٹھا اس کا باپ حقہ پینے میں منہمک تھا۔ ماسٹر جی کو دیکھ کر وہ کھڑا ہوگیا اور جلدی سے انہیں چارپائی پر بٹھا کر خود پاس ہی ایک پرانے شکستہ حال اسٹول پر بیٹھ گیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''ماسٹر جی کیسے آنا ہوا؟

ماسٹر جی نے کہا۔ بھئی نیکو رام! مَیں نے سنا ہے کہ آپ نے کھڑکو رام کو اسکول بھیجنا بند کروادیا ہے؟''

''جی ماسٹر صاحب''

''پر کیوں؟''

''ماسٹر جی ہماری پڑھانے کی حیثیت نہیں''

''حیثیت؟ اسکول میں کون سی فیس لگتی ہے۔ سرکاری اسکول ہے۔ اور پھر غریب بچوں کی مالی امداد بھی کی جاتی ہے۔''

نہیں جی۔ہم نہیں پڑھا سکتے۔اور پھر پڑھ لکھ کر یہ کرے گا بھی کیا؟۔ کام میں ہاتھ بٹائے گا تو گھر میں چار پیسے آئیں گے اور گزر بسر اچھا ہو جائے گا۔''

ماسٹر جی کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اسے سمجھانے کی کوشش کرتے رہے۔انہوں نے نیکورام کو سمجھایا کہ نیکورام تم بہت خوش قسمت ہو کہ آج آزاد اور جمہوری ہندوستان میں سانس لے رہے ہو ورنہ انگریزی راج میں تمہاری کیا حالت تھی۔آج بنا کسی تفریق کے ہر ایک کو آگے بڑھنے کے مساوی حقوق حاصل ہیں۔سرکار مفت تعلیم دیتی ہے اور تم تعلیم حاصل کر کے بڑے سے بڑا عہدہ اور مرتبہ حاصل کر سکتے ہو جو انگریزی راج میں ممکن نہیں تھا۔تمہارا بیٹا بہت ہوشیار ہے۔اچھے نمبر لیتا ہے، پڑھ لکھ کر اچھی ترقی کر جائے گا۔مگر نیکورام نے ماسٹر جی کی ایک نہ سنی۔''ارے ماسٹر جی! ہم غریبوں کی قسمت میں یہی کام لکھا ہے۔ہمارے باپ دادا بھی یہی کام کرتے تھے اور آگے ہمارے بچوں کے نصیب میں بھی یہی کام ہے۔باقی رہی برابری کی باتیں، بس دل بہلانے کے لئے اچھی ہیں۔غریب کی حالت ایسی ہی رہے گی۔''

جب ماسٹر جی کے لاکھ سمجھانے پر بھی نیکورام کسی طرح بھی کھڑکو کو آگے پڑھانے کے لئے راضی نہ ہوا تو وہ بے نیل و مرام اس کے گھر سے لوٹ آئے اور اس کے چند دن بعد کھڑکو کے والد نے اسے اپنے کام پر لگا دیا۔تاہم کبھی کبھار سنت رام اور کھڑکو رام کی سرِ راہ ملاقات ہو جاتی اور وہ سڑک پر کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہتے۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد سنت رام مزید تعلیم کے لئے انبالہ کے جی ایم این کالج میں داخل ہو گیا اور چار سال بعد گریجویشن کر کے سنٹرل سیکریٹریٹ نئی دہلی میں ملازم ہو گیا تب اس کا جگادھری جانا اور کھڑکو رام سے ملنا جلنا بہت کم ہو گیا۔ہاں اسے اتنا معلوم ہوتا رہتا تھا کہ کھڑکو کی شادی ہو چکی ہے اور اس کے دو بچے بھی ہیں۔کبھی کبھار سنت رم اپنے والدین سے ملنے جاتا تو وہ اپنے بچوں کو انگلی سے لگائے بازار میں نظر آ جاتا۔مگر اب وہ اس سے نظریں چرانے لگا تھا شاید سنت رام کو سوٹ بوٹ پہنے دیکھ کر اسے احساس کمتری ہوتا تھا کہ سنت رام تو سرکاری دفتر میں بڑا بابو بن گیا ہے اور وہ اپنے باپ کی ضد اور نادانی کی وجہ سے اپنے خوابوں کو حقیقت کا روپ نہیں دے سکا اور ایک پھٹی پرانی قمیض اور پاجامہ پہنے گلیوں میں صفائی ستھرائی کے حقیر دھندے میں لگا ہوا ہے۔

ایک دن ایسے ہی راستے میں اچانک دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا۔کھڑکو اگر سنت رام دور سے آتا دکھائی دے جاتا تو شاید وہ راستہ بدل لیتا لیکن وہ تو اچانک بازار کا موڑ کاٹتے ہی دونوں کی مٹھ بھیڑ ہو گئی اور ایسی صورتِ حال میں بات چیت کرنے کے سوا چارہ ہی نہ تھا۔تب سنت رام نے اسے بڑی سنجیدگی سے مشورہ دیا۔''کھڑکو رام تو تو نہیں پڑھ سکا مگر تم وہ غلطی نہ کرنا جو تیرے پتا جی نے کی ہے تم اپنے بچوں کو اچھی سے اچھی تعلیم دینا۔''

یہ سُن کر کھڑکو کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے، جیسے کسی نے اس کے پرانے زخموں کو پھر سے کرید دیا ہو۔اسے سنت رام کی بات سے بڑا بھاری دھکا لگا، کچھ ثانیے خاموش رہنے کے بعد اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔'' بھائی! مجھے بھی احساس ہے کہ تعلیم کی کیا قیمت ہے۔اب آپ ہی دیکھو۔آپ ایک دفتر میں بابو ہو اور مَیں سڑکوں پر جھاڑو دیتا ہوں۔لیکن مَیں اپنے بچوں کے ساتھ یہ زیادتی نہیں ہونے دوں گا۔میری خواہشوں اور آرزوؤں کے آئینے ریزہ ریزہ ہو کر ضرور بکھر گئے ہیں لیکن اب میرے بچے ہی میرا مستقبل .....میرے خوابوں کی تعبیر ہیں۔مَیں انہیں اچھی سے اچھی تعلیم دینے کی کوشش کروں گا۔چاہے اس کے لئے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔

پھر وقت کے پہیے کو مہ و سال کے اردگرد چکر لگاتے طویل عرصہ بیت گیا۔سنت رام کی بھی شادی ہو گئی اور اس کے کچھ مدت بعد اس کا تبادلہ پونہ ہو گیا جہاں سے اس کا اپنے آبائی شہر آنا جانا لگ بھگ نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔دو تین سال کے وقفے سے وہ چند دن کے لئے کسی شادی بیاہ میں جاتا تو مشغولیت اتنی زیادہ ہوتی کہ کسی سے ملنے کا موقع ہی نہ ملتا۔اور پھر خانگی زندگی میں وہ اتنا اُلجھ گیا کہ تیس سال کی لمبی مسافت میں زندگی کے نشیب و فراز کو طے کرتے کرتے وہ بوڑھاپے کی دہلیز کے قریب پہنچ گیا۔اس کے چہرے پر جھریاں نمودار ہونے لگی تھیں اور بالوں کی سیاہی سفیدی میں بدلنے لگی تھی۔اور اس کی سبکدوشی میں بھی سال ڈیڑھ سال کی مدت ہی رہ گئی تھی۔

ملازمت کے دوران اس نے پونے میں ہی تین بیڈ روم کا ایک فلیٹ لے لیا تھا۔اس کے دونوں بیٹے بھی پڑھ لکھ کر اپنے اپنے کام دھندوں میں لگ گئے تھے۔صرف ایک بیٹی سمرتی شادی کے قابل تھی جو وکالت کی ڈگری لینے کے بعد شہر کی کورٹ میں پریکٹس کر رہی تھی۔

سنت رام اپنے کام کا اور وقت کا بڑا پابند تھا۔وقت پر دفتر پہنچنا اس کے معمول میں شامل تھا۔کیونکہ اس کہنا تھا کہ اگر افسر وقت پر نہیں پہنچے گا تو اس کے ماتحت کام کرنے والا اسٹاف بھی وقت پر نہ آنے کا معمول بنا لے گا اور دفتر کا ڈسپلن خراب ہو جائے گا۔لیکن ایک دن کسی وجہ سے اسے دفتر پہنچنے میں ایک گھنٹے کی تاخیر ہو گئی۔اور جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو اس کے چپراسی نے اسے اطلاع دی کہ نئے ڈائرکٹر صاحب کے پی اے کا ٹیلی فون آیا ہے۔وہ آپ کو بلا رہے تھے۔

اچانک صبح صبح ڈائرکٹر صاحب کے بلانے پر سنت رام سوچ میں پڑ گیا۔جانے کیا غلطی ہو گئی جو صاحب نے ڈیوٹی جوائن کرتے ہی بلاوا بھیج دیا ہے۔وہ فکر و تردد میں ڈوبا پی اے کے پاس پہنچا تو پی اے نے انہیں فوراً صاحب سے ملنے کے لئے اندر جانے کی تلقین کی۔اور کہا۔''ارے اگروال صاحب جلدی جایئے۔صاحب صبح سے دو تین بار آپ کو پوچھ چکے ہیں۔''

سنت رام نے ڈائرکٹر صاحب کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی تو اندر سے آواز ''یس کم اِن'' سنت رام بڑی آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر پہنچا

باقی: صفحہ ۴۹ پر ملاحظہ فرمائیں

''بلیک ہول''

عذرا اصغر

(کراچی)

یہ پُل کم وبیش پینتالیس برسوں پر استوار ہے۔اور ہیڈ برج اور اس کے اس پہلے کنارے پر کھڑا یہ تناور درخت..... میری زندگی سے جُڑے استمرار ہیں لیکن یہ دونوں اب اتنے کہنہ' خستہ اور اجاڑ ہو چکے ہیں کہ کسی کے لیے بھی قابل توجہ نہیں رہے۔ میرے سوا..... میرے تو یہ سنگی ساتھی ہیں۔ دکھ سُکھ کے شریک۔کبھی اس پُل پر مثالی چہل پہل رہتی تھی۔اور اس پیڑ کے سائے میں کتنی ہی زندگیاں سُکھ کے سانس لیتی تھیں۔مگر اب یہاں کی فضا سونی ہے اس پل نے اپنی بساط سے بھی بڑھ کر بوجھ اٹھایا مگر اب یہ اپنے پرائیوں سب کے لئے ناکارہ ہو چکا ہے۔اس پر کوئی توجہ نہیں دیتا۔سب اپنوں نے اپنے رستے بدل لئے ہیں۔لیکن دوسرے ضرور اس کے جلد نابود ہونے کے دکھ کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ یا پھر میں ہوں۔ میں اس پر شب و روز چلتی رہتی ہوں اس سرے سے اُس آخری سرے تک۔تمہاری تلاش' تمہاری کھوج مجھے بیقرار رکھتی ہے۔ لیکن ہر مرتبہ مایوس لوٹ آتی ہوں۔ میں موسم سے بے نیاز ہوں۔ چلتے چلتے تھک جاتی ہوں تو درخت کے سائے میں بیٹھ جاتی ہوں۔ اس کی چھدری شاخوں سے دھوپ مجھے جھلساتی ہے مگر..... مگر میں تو موسم سے بے نیاز ہوں۔ میں غور سے اس کی سوکھی ٹہنیوں کو دیکھتی ہوں۔جس کی ہر ٹہنی ہر شاخ پر تمہاری یاد کی کونپلیں پھوٹتی نظر آتی ہیں۔ میں اس کی چھدری چھاؤں میں بیٹھ کر اپنا پنڈورا بکس کھولتی ہوں۔ بکسا کھلتے ہی یادوں کی بے شمار رنگ برنگی دھجیاں بکھر جاتی ہیں۔میں ایک ایک کتر کو اٹھا کر دیکھتی ہوں۔ ہر کتر میں کوئی نہ کوئی کہانی مجھے لپٹی ملتی ہے۔ سب واقعات اور کہانیاں یکے بعد دیگرے مجھ سے بغلگیر ہوتی ہیں 'میرے ساتھ ہنستی ہیں' روتی ہیں' ان دھجیوں میں بہت سی کترنیں ابھی تک خوش رنگ ہیں۔اور کئی ایک اپنا رنگ روپ کھو چکی ہیں۔لیکن مجھے ان کے سب گنگا جمنی رنگ یاد ہیں اور ان کے وجود میں آنے کا ہر ہر لمحہ بھی۔ میں کترنوں کو یادوں کی پوٹلی میں لپیٹ کر بیقراری سے پھر چل پڑتی ہوں۔پُل کے اس آخری سرے تک۔ جہاں اس کا مضبوط سرا جھک کر غار میں اتر گیا ہے۔ جانے یہ غار کتنا گہرا ہے؟ اس کے پرے کیا ہے؟ تم آخر کہاں ہو؟ میں جاننا چاہتی ہوں۔مگر میں کچھ بھی جان نہیں پاتی۔ کچھ بھی دیکھ نہیں پاتی۔ بے بسی مجھے واپس کھینچ لاتی ہے۔ لاچاری کا گھیرا میرے گرد تنگ ہونے لگتا ہے۔

دل نہیں مانتا کہ تم واپس نہیں آؤ گے؟

تم میری زندگی میں خود بخود کسی خوشگوار' جذباتی حادثے کے طور پر تو نہیں آ گئے تھے ندیم.....! اور اگر یہ حادثہ تھا بھی تو ایک اجتماعی فیصلے کے تحت تھا جو بزرگوں کے درمیان طے پایا تھا۔ وقتی طور پر بھی یہ مجھے ناگوار نہیں لگا تھا کہ میری زندگی تو کورے کاغذ جیسی تھی جس پر نہ کوئی لکیر تھی نہ حرف اور نہ کوئی نقش..... اس پر پہلا نقش تمہارا ہی ابھرا تھا۔ پہلا حرف تمہارے نام کا ہی لکھا گیا تھا اور پھر یہ حرف' یہ نقش میری شخصیت پر کندہ ہو گیا' ثبت ہو گیا اور میری زندگی کا جزو بن گیا۔ اگرچہ ہماری سوچ کے بہت سے رستے متوازی سمتوں کو جاتے تھے۔مگر کہیں نہ کہیں' کسی نہ کسی موڑ پر آ ملتے تھے اور ہم سیدھی سڑک پر رواں دواں ہو جاتے۔ ایک دفعہ ایک خوشنما موڑ دیکھ کے تم ٹھٹھکے تھے ندیم..... تمہیں یاد ہے نا.....؟ تب میں مزاحم ہو گئی۔ ہم نے کتنی بحثیں آپس میں کیں اور تم واپس آ گئے۔ موڑ مڑ آئے اور ہم پھر ایک ہی سمت میں روانہ ہو گئے۔ میرے لئے تمہارے بغیر ایک دن..... ایک لمحہ گزارنا بھی کتنا دوبھر تھا۔ اکیلے رہنے کی مجھے عادت کب تھی؟ میں نے تو اپنی ساری توجہ تم پر مبذول کر دی تھی۔ اپنی تمام چاہتیں تم پر لٹا دی تھیں۔تم دفتر جاتے تو میں گھر داری میں مصروف ہو جاتی۔ گھر کو سجاتی' سنوارتی' کھانا پکاتی۔ بچوں کے کاموں میں لگی رہتی۔ تم بھی فائلوں سے سر اٹھاتے تو فون کر کے خیریت پوچھتے۔ بچے ذرا ذرا سمجھدار ہوئے تو تمہاری اس عادت کا مذاق اڑانے لگے۔مگر تمہیں اس کی پرواہ کب تھی.....! ایک دفعہ تم وقت سے کچھ پہلے گھر آ گئے۔ میں کام میں اتنی مگن تھی کہ مجھے تمہاری آمد کا قطعی علم نہ ہو سکا۔ میں پلٹی تو تم سامنے کھڑے تھے۔ حیرت سے میری چیخ نکل گئی اور پھر بے اختیار تم سے لپٹ کر میں رونے لگی۔

تم نے بڑے پیار اور نرمی سے پوچھا۔

''کسی کو چھپایا ہوا ہے جو گھبرا گئی ہو''۔

تمہارے ہونٹوں کے کونوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں شرارت تھی۔ میں نے ایک مُکّا تمہاری پیٹھ پر لگایا۔ پھر ہم دونوں کتنی دیر ہنستے رہے تھے؟ اور وہ بات تو ذرا سی تھی مگر ہمارے اوپر قیامت بن کے ٹوٹ گئی تھی ہموار' گزرتی زندگی میں جیسے بھونچال آ گیا تھا۔ تمہارا صرف تبادلہ ہی تو ہوا تھا دوسرے شہر؟ یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ پھر جانے کیوں ہمیں ایسا لگا جیسے کسی نے موت کا حکم سنا دیا ہے۔کیا کیا منتیں نہیں تھیں جو میں نے مانیں۔کتنا گڑگڑائی تھی میں اللہ کے حضور۔مگر سب دعائیں رائیگاں گئیں۔تمہارا تبادلہ منسوخ نہ ہو سکا اور تم چلے گئے اور اب بھی تو تمہیں روک لینے کی میری سب دعائیں۔تمام تدبیریں' سب بے اثر ہوئیں۔تم چلے گئے اور بے بسی سے میں تمہیں دیکھتی رہی۔

دیکھنے والوں کو تم کتنے سیدھے لگتے تھے ندیم۔لیکن تم کس قدر ضدی تھے یہ تو صرف میں جانتی ہوں۔تم کوئی فیصلہ کر لیتے تو پھر دنیا کی کوئی

طاقت اسے بدل نہیں سکتی تھی۔اب بھی تم چلے گئے اور تب بھی تم نہیں رکے تھے مجھے بیٹی کی شادی تک اسی شہر میں رہنا تھا۔اس کی شادی جو ٹھہر گئی تھی۔ مجھے اپنی اور تمہاری مشترکہ ذمہ داری نبھانا تھا۔بہرطور تمہارا روزی کا معاملہ تھا۔

تم اتنے مصروف تھے کہ بیٹی کو وداع کرنے بھی ٹور (Tour) بنا کے آنا پڑا۔مہمانوں کی طرح..... ہر ویک اینڈ پر تو تم آتے ہی تھے۔ جمعہ کا دن ڈھلنے لگتا تو میری نظر گیٹ پر جا ٹکتیں۔کان ہر رکشہ گاڑی کی آواز پر کھڑے ہو جاتے۔ میں جلدی جلدی رات کا کام نمٹا کے سرِ شام ہی لان میں آ بیٹھتی اور بچے بھی۔کتنی بے چینی سے ہم تمہارے منتظر ہوتے۔تمہیں پہنچنے میں دیر ہوتی تو ہم سچ مچ گیٹ پر آ کھڑے ہوتے۔اور پھر ہر پیر کی صبح' پَو پھٹے سے ہم بس کے اڈے پر کھڑے تمہیں الوداع کہہ رہے ہوتے۔ بیٹی کو اس کے سسرال رخصت کر کے میں اور بھی اکیلی ہوگئی۔وہی تو میرا کھلونا تھی' میری سہیلی تھی' میری دل بستگی کا سبب تھی۔تمہارے دوسرے شہر چلے جانے کے بعد ہم تینوں میں اور میرے بچے ایک ہی کمرے میں سمٹ آئے تھے۔ بیٹی بیاہ دینے کے بعد ہم دو رہ گئے تھے۔ وحشتیں مجھ پر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ایسے میں بمشکل میں خود کو سنبھال پاتی۔ جانے کونسی قوت تھی جو ڈھارس بندھاتی تھی' سہارا دیتی تھی۔ میں تو تنہا رہنا جانتی ہی نہیں تھی۔

ایک دن گھر کے سب لوگ کہیں چلے گئے تھے۔میں گھر اکیلی رہ گئی تھی۔گھنٹہ پل کی ہی تو بات تھی میں ڈرتی تھی۔اماں نے ڈانٹ کر کہا تھا''کیا ہوا گھڑی دو گھڑی اکیلی رہ لوگی تو اپنا ہی گھر ہے نا۔اتنی بڑی ہوگئی ہے۔کل کو دوسرے گھر جا کر اکیلے دو کیلے رہنا پڑا تو کیا کروگی؟''

میں منہ بسور کے چپ ہوگئی تھی۔اُن سب کے جاتے ہی میں نے سب کمروں کے دروازے مقفل کر دئے تھے اور خود انگنائی میں پلنگ بچھا کے آ بیٹھی تھی۔میرے اندر بار بار کوئی میری ڈھارس بندھاتا تھا اور اب بھی وہی ان دیکھا' میرا اپنا کوئی میری ہمت بندھا رہا تھا۔ میں بڑی ہوگئی تھی۔ میں ماں تھی۔ میرے اوپر بہت سی ذمہ داریوں کا بوجھ تھا۔اور اب مجھے بھی رختِ سفر باندھنا تھا۔

گھر کا سامان ٹھکانے لگایا۔کچھ اونے پونے بیچا۔کچھ نوکروں میں بانٹا اور اپنا بچھونا کمرے کے ایک کونے میں ڈال لیا۔ان دنوں میں عجیب کیفیت میں مبتلا تھی۔ دل اُتھل پتھل ہو رہا تھا۔تمہارے پاس جانے کی خوشی تھی۔شہر چھوڑنے کا رنج تھا۔ بیٹی سے دور جانے کا دکھ تھا۔ میں خاصی سراسیمہ تھی۔عجیب کشمکش تھی مگر میری الجھن' میری تشویش سب بے سود تھی۔سب کچھ یونہی ہونا تھا۔وقت کا تسلسل یونہی رہتا ہے۔ جاننے کو ہم بہت کچھ جانتے ہیں مگر ہم اس جاننے پر اختیار نہیں رکھتے۔تب تو تم نے مجھے بلا لیا تھا ندیم۔لیکن اب.....؟ نہ تمہیں کچھ اختیار ہے بلانے کا اور نہ مجھے جانے کا.....بس انتظار.....انتظار.....

یوں تو میں ہمیشہ با اختیار سمجھی گئی لیکن ندیم کچھ حقیقتیں کتنی پوشیدہ رہتی ہیں؟ میری روانگی قریب ترین آ پہنچی تھی۔ بیٹا مجھے رخصت کرنے سے پہلے ہی اپنی منگیتر سے ملنے دور کے شہر چلا گیا تھا۔ٹرک میں سامان میں نے خود لدوایا اپنی نگرانی میں.....اور بھلا سامان تھا ہی کیا۔ایک فرج' ایک چوبیس انچ کا ٹی وی سیٹ' سو دو سو پھولوں کے گملے اور کتابوں کے ان گنت کارٹن.....

میں ان دنوں بیشک اکیلی تھی مگر تم تھے نا۔دوسرے شہر میں سہی۔۔ پر تھے تو نا.....یہی طمانیت میرے لئے کافی تھی۔فون پر تم سے رابطہ تھا۔ ہر طرح کا مشورہ تھا۔تمہاری ہدایات مجھے حاصل تھیں ملنے کی آس تھی۔ اکیلی ہوتے ہوئے بھی میں اکیلی نہیں تھی۔لیکن اب.....؟ نہ آس نہ امید.....اب یہ کیسا اکیلا پن ہے ندیم.....؟ کیسی جان لیوا تنہائی ہے۔ ملنے کی ہر آس ٹوٹ چکی ہے۔ سب راہیں مسدود ہیں۔امید کی ڈوری کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ چکی ہے۔اور میں ماضی کی کترنوں سے حال کی لیر لیر چادر میں یادوں کے پیوند لگاتی رہتی ہوں۔

پینتالیس پچاس برس پرانا یہ پُل اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا۔ اس کا سریا زنگ آلود ہو کر غار کے منہ پر جھک گیا ہے۔کسی انجانی امید سے بندھی میں ہر روز اس پر چل کے آخری سرے تک جاتی ہوں لیکن وہاں مہیب اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔تمہیں نہ پا کر مایوس.....شکستہ دل' میں تھکے قدموں واپس اس پیڑ کے نیچے آ کھڑی ہوتی ہوں جس کی چھدری شاخیں مجھے وقت وقت کی تمازت سے بچانے میں ناکام رہتی ہیں مگر اس کی جڑ سے اُگے پودے جواب تناور درخت بن رہے ہیں مجھ پر سایہ فگن ہوتے ہیں۔ مجھے وقت کی جھلسا دینے والی دھوپ سے بچاتے ہیں مگر جانے کیوں اس پیڑ کی چھاؤں کی متلاشی ہوں جس پر اب نئے بگ وبار آنے کی کوئی امید نہیں۔اور میں ان بہت سے نوزائدہ پیڑوں کے نیچے کھڑی اس رستے کو تکتی ہوں جس پر چل کے تم دفتر جاتے تھے اور دن کے مخصوص وقت پر دروازے پر لگی برقی گھنٹی تمہاری انگلی کی پور سے دب کر جھنجھنا اٹھتی تھی۔ یہ تمہاری آمد کی اطلاع ہوتی تھی۔کبھی تمہیں دیر ہو جاتی تو ادھر سے فون کھڑکنے لگتے۔

''کیا ہوا بھئی۔کب پہنچو گے۔کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے''۔

ندیم..... اب کھانے کی میز پر تمہارا انتظار نہیں ہوتا۔ رات کو تمہاری نیند میں خلل پڑنے کی وجہ سے مجھے اپنے کمرے کی بتی جلدی بجھانی نہیں پڑتی اور میں جب تک چاہوں کتاب پڑھتی ہوں۔تمہیں جگائے بغیر صبح کی چائے بھی میں اکیلی ہی پی لیتی ہوں اور تمہارے حصے کا دوسرا مگ بھی۔اس میں بس میرے چند قطرے آنسو ہی تو گھلتے ہیں۔

میں تمہارے نقشِ پا ڈھونڈتے ہوئے تم تک آنا چاہتی ہوں مگر راستہ دھند میں اٹا پڑا ہے اور نقشِ پا معدوم..... پُل کے اس آخری سرے پر مہیب اندھیرا ہے۔

میرے دل کی طرح تاریک.....مہیب غار ہے۔بلیک ہول۔

بالغ عورت ..... شکیلہ رفیق (کینیڈا)

آخر دنیا والوں کو چین کیوں نہیں پڑتا؟ جب زندگی کا ساتھی ہمراہ تھا' جب بھی کچھ نہ کچھ کہتے رہتے تھے.....میاں کی دولت کا غرور ہے.....اپنے حسن پر بڑا گھمنڈ ہے.....میاں کے پیار پہ اتراتی ہے۔

پھر جب میاں کی موت ہوگئی تو وہ کچھ نہ کچھ' بہت کچھ میں تبدیل ہوگیا.....ہنسی کیوں؟.....اٹھی کیوں؟.....بیٹھی کیوں؟.....باہر کیوں نکلی؟..... فلاں سے بات کیوں کی؟.....نامحرم کے سامنے کیوں آئی؟ تیس برس کی عمر میں سولہ برس کے لڑکے سے بات کرنے پر بھی سوالات کی بوچھاڑ اٹھتی' کہانیاں بنتیں.....شک کے بادل منڈلاتے۔

تب ہی .....اس نے ایک دوسرا راستہ اپنا لیا.....اپنے اندر کے تمام تقاضوں کو کچل کر ایک نیا راستہ ڈھونڈ لیا.....خود کو ڈھک لیا کہ.....کسی کی بھی نگاہ اس پر نہ پڑے.....نماز پڑھنے کے ساتھ اس کی پابندی کی بھی کوشش کرنے لگی.....اس نے سب سے قطع تعلق کر لیا.....بس اپنی محدود دنیا میں رہتی.....

پھر بھی دنیا والوں کو چین نہ آیا.....الزامات کی بارش تو ہنوز جاری تھی مگر انداز بدل گیا تھا..... جب کسی صورت چین کا کوئی کونہ نظر نہ آیا.....تب اس نے ملک چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور ان سب سے بہت دور چلی گئی۔

مالی طور پر مستحکم تھی وہاں ایک لگژری اپارٹمنٹ میں رہنے لگی۔اس کی بلڈنگ کے مقامی لوگوں کو تو اس کی قطعاً فکر نہ تھی کہ وہ کون ہے یا کہاں سے آئی ہے.....مگر.....اس کی اپنی طرف کے لوگوں کا تجسس یہاں بھی بعنیہ وہی تھا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آئی ہے؟ کسی سے ملتی جلتی کیوں نہیں؟ بس کبھی کبھی گھر سے باہر نکلتی ہے مگر کسی سے ہیلو ہائے نہیں کرتی۔

وہ.....کبھی کبھی باہر نکلتی تھی۔گروسری کے ساتھ چند اور دکانیں دیکھتی..... یا پھر کبھی ڈاکٹر کے کلینک جانا ہوتا.....واپسی پر پھر گھر میں بند ہو جاتی۔البتہ چند خواتین اسے مسجد میں ضرور دیکھتی تھیں۔

ایک روز ڈاکٹر کے یہاں سے اپوائنٹمنٹ کی یاددہانی کے لیے کئی بار فون آیا مگر اس نے نہ اٹھایا نہ ہی پیغام کا جواب دیا.....تب ڈاکٹر نے بلڈنگ کی سیکورٹی کو فون کیا (یہ اسی کی ہدایت تھی کہ ایمرجنسی میں ان سے رجوع کریں) سیکورٹی والے 19ویں فلور پہ گئے' دروازے کا تالا توڑا.....اور دیکھا.....کہ وہ.....ساکت پڑی تھی.....حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب اس کی موت واقع ہوگئی تھی.....

پر.....

لوگوں کو اب بھی چین نہ تھا.....وہ مر چکی تھی۔

مگر.....

لوگ اب بھی اس تحقیق میں لگے ہوئے تھے کہ.....آخر.....اس جیسی نمازی پرہیزگار خاتون کی موت Adult Video دیکھتے ہوئے کیوں ہوئی؟.....

جہاں کوئی بھی پل میرا نہیں ہے

یہ کس موڑ پہ آ پہنچی میں؟
جہاں کوئی سڑک ہے نہ گلی
گلیارہ۔۔۔نہ پگڈنڈی!
مجھے جانا کہاں ہے؟
یہ کیسا موڑ ہے؟
جو.....چاہوں
آنکھیں موند کے اپنی
کسی بھی سمت چل نکلوں
ہر اک سمت
معدوم ہوگئی ہے
اور
ایک انجانے سے خوف نے
مجھ کو باندھ لیا ہے
مضمحل جسم و جاں
سوچ رہے ہیں کیا کیا
تمام عمر.....؟ زمین پہ
ایک بوجھ کی صورت
یونہی کھڑی رہوں گی؟
اسی موڑ پر
جہاں
کوئی بھی پل میرا نہیں ہے

شکیلہ رفیق (کینیڈا)

عجیب حادثہ ہے یہ!

ڈاکٹر یوگیندر بہل تشنہ

(دہلی، بھارت)

اس وقت میں دہلی کے مشہور ESCORT ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کے باہر زندگی کے انتہائی کرب انگیز لمحات بتا رہا ہوں۔ موت اور زندگی کی جنگ سے میرا دوست مدن ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ میں دو چار ہے اور میں بے بسی کے احساس، بے کسی کے ملال اور بے حسی کے وبال سے قبر میں دھنستا جا رہا ہوں۔۔۔۔!

زندگی میں ایسا بہت کم ہوتا ہے جب کوئی شخص دوسرے کی جانب مائل ہو جاتا ہے۔ اور اپنی ذات اور جسم و جاں سے متاثر ہو کر کسی دوسرے شخص میں خود کو دیکھنے کا خیال ذہن میں اُبھارنے لگتا ہے۔ اور سوچتا ہے کہ اُسمیں اور میرے میں کیا فرق ہے، کیا الگ ہے، جدا ہے۔ اور پھر ایسا ہونے لگتا ہے کہ اُسے اپنی دنیا پلٹ آنے میں کچھ ہچکچاہٹ سی محسوس ہوتی ہے اور اسکا کچھ اور دیر کے لیے اسی خیال میں الجھے رہنے کو جی چاہنے لگتا ہے اور اُسکو محسوس ہوتا ہے کہ اس دوسرے شخص اور میرے میں کچھ ذرا سا، نا معلوم سا فرق ہے۔ مدن کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا۔ جین صاحب کے گھر سے نکلتے ہی ایک بھکاری پر اُسکی نظر پڑی اور اُسکو اپنے ذہن میں بیٹھا لیا اور کچھ دیر اسی خیال میں الجھا رہا کہ اُسمیں اور اس بھکاری میں کیا فرق ہے۔ کہ اسکو لبِ سڑک، زیرِ آسمان زندگی بسر کرنا ہے اور مجھے ایک ایسے گھر میں جہاں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہے۔ اور اس شخص کی زندگی زیرِ آسمان رہ کر اپنے سے شروع ہوتی ہے اور یہیں پر ختم ہو جاتی ہے اور میری زندگی گھر ہوتے ہوئے بھی بکھری بکھری منتشر سی ہے۔ ایک لاوارث کی مانند۔ جسکی اب اتنی بھی وقعت نہیں رہی کہ کوئی اُسکی جانب متوجہ ہو۔

لبِ سڑک کا بھکاری گزر بسر کے لیے ہاتھ پسارتا ہے کہ کوئی سخی داتا گزرے اور اسکی ہتھیلی پر چند سکے رکھ دے کہ وہ اپنے پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کر سکے۔ اور میں بھی بھکاری کی مانند دل پسارے بیٹھا ہوں کہ زندگی کرنے کے لیے کوئی اپنے پن کی ذرا سی بھیک دے دے کہ وہ اُسی خیال میں غرق اپنی آتما کو زندگی دے سکے۔ اُسکی پیاس بجھا سکے۔ دونوں ہی محتاج ہیں۔ اس لئے دونوں میں کچھ بھی فرق نہیں ہے بس اُسکے پیٹ کی آگ ہے اور میری آتما کی پیاس، ہم دونوں بھکاری ہیں۔

اسی سوچ میں گم صم اُسکے پاس کئی تھری وہیلر آئے اور گزر گئے مگر اسکا دھیان تو اپنے خیال میں الجھا رہا۔

مدن، مدن کسی نے پاس سے گزرتے ہوئے پکارا۔ مگر اُس نے اُن سنا کر دیا۔ پھر اُس شخص نے پاس آ کر جھنجھوڑا اور ہمکلام ہونے کی کوشش کی۔ مگر وہ کہتا رہا۔ ''نہیں نہیں۔ میں وہ نہیں ہوں۔ اُسکو گزرے ہوئے بہت دن ہو چکے ہیں''۔

''مگر مجھے تو تم مدن ہی لگتے ہو۔ تمہاری چال ڈھال، چہرہ مہرہ ویسا ہی ہے''۔

''مگر میں وہ نہیں ہوں۔ اُسکو گزرے تو ایک عرصہ ہو چکا ہے میں تو ایک سایہ ہوں اُسکا ہم شکل، ہمزاد جس میں اسکا کچھ بھی نہیں۔ وہ تو کب کا انتقال کر چکا''۔

کیسے! اُس دوسرے شخص کے منہ سے معاً نکلا۔

''ہوا یوں کہ اُسکا قتل ہو گیا تھا اُسکے اپنے ہی ایک قریبی کے ہاتھوں جسکو وہ دل و جان سے چاہتا تھا، ویسے تو ہر کسی کو ٹوٹ کر چاہتا ہے وہ ہر کسی کو اسی طرح چاہتا ہے۔ ہر کسی کی روح میں اُتر جاتا ہے۔ شاید اُسکو ماسوا پیار کے اور کوئی کام ہی نہیں تھا۔ اور یہ ضروری نہیں کہ دوسرا بھی اُسی طرح اُسکو چاہے۔ بس یہی اُسکے قتل کا سامان بن گیا۔ اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُس آتما سے پیار کی متلاشی آتما کو الوداع کہہ گیا۔ اور اپنا بے جان سا جسم، بے حسوں کے درمیان چھوڑ گیا۔ جہاں اب وہ ہر طرح سے بے یار و مددگار اکیلا، تن و تنہا جینے کی کوشش کر رہا ہے۔

''مگر ایسا کیونکر ہوا، وہ تو ایک سادہ طینت بندہ تھا۔ اُس کے ساتھ کسی کی کیا رنجش ہو سکتی تھی''۔

''رنجش، نہیں نہیں رنجش نہیں، اُس کے قتل کی وجہ رنجش نہیں بلکہ یہ سن کر آپ یقیناً حیران ہو گے کہ اُس کا قتل اسی شخص کے ہاتھوں ہوا جسکو وہ بے پناہ چاہتا تھا اور عزت کیا کرتا تھا۔

ویسے تو اُس پر کئی بار قاتلانہ حملے ہوئے۔ اسکی آتما لہولہان بھی ہوتی رہی۔ مگر سخت جان تھا۔ بار بار بچتا رہا مگر اس مرتبہ جو حملہ آور تھا وہ اس کا اپنا ہی عزیز تھا اُسکے جگر کا ٹکڑا۔ اس لئے اُس نے سیدھا دل پر وار کیا اور اس طرح جاں بحق نہ ہو سکا۔ اُسکو اس کا خود بھی بے حد افسوس ہے کہ وہ دل پر قاتلانہ حملے کی وہ تاب نہ لا سکا۔ اور کئی دن تک ذہنی طور سے بے حال و پریشان رہا۔ آخر اُسکی آتما اُسکو داغِ مفارقت دے گئی اور بے حس و بے جان یادِ خدا میں ڈوب گیا۔ مگر سب سے افسوس ناک بات یہ ہوئی جسکا اُسکو بھی سخت صدمہ پہنچا کہ آفرین ہے کہ اس واردات کو نہ تو کسی نے دیکھا اور نہ ہی کسی کو افسوس ہوا۔ کسی کو بھی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ بس ایک عجیب سی خاموشی کے ساتھ وہ از خود اس جہانِ ہست و بود سے کُوچ کر گیا۔ اور ایک بے حس، ہم شکل، ہمزاد سا چھوڑ گیا جسے زندگی کے اعتبار سے آپ کہہ سکتے ہو کہ وہ ہے، مگر حقیقت یہی ہے کہ وہ نہیں ہے، سانس لینا زندگی کی دلیل ضرور ہے مگر احساس و جذبات سے وہی جیسے کسی شخص پر کوما COMA کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور وہ محض ایک سبزی Vegetable کی طرح ہو کر رہ جاتا ہے اور وہ زندگی سے موت تک کا سفر احساس و جذبات سے عاری کرنے لگتا ہے پگلا کہیں کا!

اور اس طرح زندگی کا کاروبار اپنی اُسی رفتار سے جاری رہا جیسے کوئی

حادثہ روح پذیر ہوا ہی نہیں۔اور اس طرح نت دن اُسکی روح میں نشتر اُترے اور وہ مسلسل گھائل ہوتا رہا۔

آج پھر دنیا کی نگاہوں میں ESCORT ہسپتال میں دل کے سیکشن میں پڑا ہے اور یہی سوچ رہا ہے کہ آخر یہ ڈاکٹر لوگ میرے دل کا By-Pass کیوں کرنا چاہ رہے ہیں۔جس کے لیے مدن کو اینجیوگرافی Angiography کے لیے ESCORT ہسپتال میں داخل کروادیا ہے۔جسمیں دیر تک تفتیش کے بعد یہ نتیجہ اخذ ہوا کہ دل کی تینوں خون کی نالیاں قریب قریب بند ہیں اور ماسوا Bypass کے اور کوئی چارہ نہیں ہے۔دواؤں نے جس قدر کام کرنا تھا ہو چکا۔چنانچہ آج صبح مدن کا By Pass کا آپریشن ہوا اور چار گھنٹے بعد اُس کو I.C.U میں لایا گیا۔اور وہ دنیا اور مافیہا سے بے نیاز بے حس سا بستر پر پڑا ہے۔مانیٹر Moniter سے دل کی کیفیت کا اندازہ لگایا جا رہا تھا۔یہ سب کچھ اس جہان کے بندوں کے لیے ہے جو مدن کو زندہ دیکھ رہے ہیں مگر وہ تو بہت دن پہلے ہی اس دنیا کے بندوں کے لئے خود کو جان بخش کر چکا ہے سانس چل رہی ہے۔اہلِ خانہ و دیگر ہمدرد کی نگاہوں میں وہ زندہ ہے۔مگر حقیقت تو یہ ہے کہ بہت دن پہلے ہی اُسکا قتل ہو چکا تھا۔

بقیہ
تعبیر خوابوں کی

اور ڈائرکٹر صاحب کے سامنے انتہائی مودبانہ انداز میں کھڑے ہو کر بولا۔''جی صاحب۔حکم؟''

''ڈائرکٹر صاحب نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''تشریف رکھیے۔

سنت رام ان کے سامنے بچھی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور بڑی دھیمی آواز میں بولا۔

''جی فرمایئے؟''

ڈائرکٹر صاحب نے پوچھا۔''اگروال صاحب! کیا آپ جگادھری کے رہنے والے ہیں؟

''جی، مگر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''دراصل میں بھی وہیں کا رہنے والا ہوں۔''

انسان کو دُور دراز کسی جگہ اپنا ہم وطن .....اپنا جان کار.....اپنا یار دوست.....مل جائے تو اس کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔یہی حال سنت رام کا بھی ہوا۔وہ ہکا بکا انہیں غور سے دیکھنے لگا اور سوچنے لگا یہ تیس پینتیس سال کا نوجوان کون ہو سکتا ہے؟ مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔تب اس نے اپنی حیرانی کا اظہار کرتے ہوئے کہا.....

ایک جانب میرے دل کے کسی پوشیدہ گوشے سے مدن کی صحت یابی اور خوش باش زندگی کے لیے دعا نکلتی ہے۔اس دعا میں ایک طرح سے میری خود غرضی کا عنصر بھی شامل ہے۔مدن زندہ ہے تو میں زندہ ہوں، مدن خوش ہے تو میں خوش ہوں۔مگر! دل کے ایک اور گوشے سے یہ آواز بھی میرے کانوں کو صاف سنائی دے رہی ہے کہ اگر مدن اوپر والے کی مہربانی، ڈاکٹروں کی کوشش اور میری دعاؤں یا یوں کہنا چاہیے خود غرض دعاؤں کے طفیل صحت یاب ہو بھی گیا تو کیا وہ اس زندگی کو پا کر خوش ہوگا؟ کیا اُسے وہ حادثات و واقعات افسردہ و ملول نہیں کریں گے جو مدن جیسے زندگی سے بھرپور شخص کے قتل کا ایک سے زائد بار باعث بنتے رہے ہیں؟ مدن کو اگر نئی زندگی مل بھی گئی تو مول، مایا کے پجاری مدن کے یہ خود ساختہ اپنے، مدن کی اس نئی زندگی کو کس طرح خوش آمدید کہہ سکے گے؟

اس دنیا میں کئی مدن آئے اور چلے گئے۔بہت سے یوگی بھی آئیں گے اور چلے جائیں گے۔بات پریشانی کی، مدن اور یوگی کی موت نہیں، پریشانی کی بات انسانیت کی موت ہے۔۔۔۔!!!

☆

''صاحب! آپ کہاں رہتے تھے۔اور آپ کے پتا جی.....''

تب ڈائرکٹر صاحب کھڑے ہو گئے۔دیکھیے اگروال صاحب! آپ مجھے صاحب مت کہیے آپ میرے بزرگ ہیں اور میرے پتا جی آپ کے بچپن کے دوست۔''

'بچپن کے دوست.....کون ہیں آپ کے پتا جی؟''

کھڑکو رام جی.....جو بچپن میں آپ کے کلاس فیلو تھے۔

''اچھا؟'' حیرت و استعجاب سے سنت رام کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''تو کیا آپ کھڑکو رام کے بیٹے ششی پال ہیں؟''

''جی انکل'' آپ شاید مجھے بھول گئے ہوں مگر مَیں آپ کو نہیں بھولا۔آپ ہی تھے جن کے کہنے پر پتا جی نے مجھے اسکول میں داخل کروایا تھا۔اگر آپ ان کی ہمت نہ بڑھاتے تو شاید آج مَیں بھی انہی کی طرح صفائی ستھرائی کے کام میں لگا ہوتا۔'' اور پھر اُٹھ کر ششی پال نے پہلے سنت رام کے قدموں کو چھوا اور پھر بڑی گرم جوشی کیساتھ ان سے لپٹ گیا اور اس رقت آمیز صورتِ حال سے سنت رام کی آنکھوں میں آنسو چھلچھلانے لگے۔اور ان چھلچھلاتی آنکھوں کی دھندلاہٹ میں اس کے سامنے بائیسکوپ کی متحرک تصاویر کی طرح کھڑکو رام کی تصویر گھوم گئی جس نے ایک بار بازار میں ملنے پر اس سے کہا تھا۔''سنت رام مَیں تو اپنے پتا جی کی ضد اور نادانی کی وجہ سے تعلیم سے محروم رہ گیا مگر مَیں اپنے بچے کے ساتھ یہ انیائے نہیں ہونے دوں گا اور اس کی تعلیم میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھوں گا چاہے اس کے لئے مجھے کتنی بھی مشکلوں اور دشواریوں کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔

التت بلتت

طاہرہ اقبال
(فیصل آباد)

ہنزہ ویو ہوٹل کے استقبالیہ میں منگولی نقوش والے ٹورسٹ گائیڈ وقارالدین نے دونوں ماں بیٹی کو اعزازی سلیوٹ جھاڑا، اور شستہ انگریزی میں کہا: ''میم آج ہم ہنزہ ویلی کے تاریخی مقامات کا وزٹ کریں گے، مجھے اُمید ہے آپ اس سیر سے لطف اندوز ہوں گی۔''

چست جین اور کرکراتے کالروں والی سفید شرٹ میں ملبوس وقارالدین کے سراپے میں اسماعیلی فرقے کی ساری شائستگی اور تہذیب گھلی تھی، جیسے ہنزہ کی شفاف فضاؤں میں خوبانی اور چیری کی خوشبوئیں رچی ہوں۔ گاڑھی گاڑھی مگر لطیف تر۔۔۔ لال رنگ پراڈو جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے وقارالدین نے پیشہ ورانہ انداز میں گفتگو کا آغاز کیا۔

''میم! ہنزہ ویلی کئی قصبات مثلاً علی آباد، حیدرآباد، عطا آباد، ناصرآباد، نگر، گلمت، گنش جیسے قصبات سے مل کر بنی ہے جس کا صدر مقام کریم آباد ہے۔ یہ وادی کوہِ قراقرم کے برف پوش سلسلوں میں گھری ہے جس کے دامن میں دریائے ہنزہ بہتا ہے، جس میں برف پگھلتے آبشار اور رواں چشمے گرتے ہیں اور جہاں چیری اور خوبانی کے کھیت پھل سے لدے مہکتے ہیں۔ اس وادی کی تنظیم، صفائی، سکون اور خوشگوار ماحول کا موازنہ یورپ کے صحت افزاء تفریحی مقامات سے کیا جاسکتا ہے۔''

مہینہ جولائی کا تھا خوبانیاں ابھی پک رہی تھیں، اور چیری عنابی موتیوں کی سی آب کے ساتھ سبز پتوں میں سے جھلملاتی تھیں، جیسے سچے رُوبی سرسبز تھالوں میں سجے ہوں جن میں سے روشنیاں پھوٹتی ہوں۔ شفاف پہاڑی سڑکوں کے بل کھاتی لال پراڈو جیپ کے گرد پھیلا لینڈ اسکیپ جیسے دریائے ہنزہ کے زمردیں پانیوں میں سجا ہوا کوئی رواں بجرا۔۔۔ ہنزہ ویلی جیسے ڈیکوریشن پیسز کی کوئی دُکان اور اس سجی ہوئی دُکان کا سب سے خوبصورت پیس خود وقارالدین تھا۔ راکاپوشی کی کسی چٹان سے تراشا ہوا کوئی مجسمہ، جس کی پشت پر برف پوش چوٹیاں ایستادہ ہوں جس کے پہلوؤں سے جھرنے گنگناتے ہوئے اُترتے ہوں، جس کے قدموں میں چیری کے عنابی یاقوتوں سے جڑے باغات بچھے ہوں۔

سمل کا جی چاہا وہ ان شاداب کھیتوں کے شفاف دمکتے سرخ یاقوتوں کی مٹھیاں بھر بھر سمیٹ لے۔ جھرنوں کے برفیلے پانیوں میں پوری پوری بھیگ جائے اور برف پوش چوٹیوں پر چڑھ کر پوری قوت سے چلائے ''میں نے پالیا'' اور بازگشت ہنزہ کی شفاف فضاؤں کو چیرتی ہوئی لاہور کی گرم ہواؤں میں گونج جائے۔ بچے سکولوں سے واپس آرہے تھے۔ سرخ سبز نیلی ٹائیاں جرابیں چمکتے ہوئے بوٹ اور دمکتے چہرے جیسے اسکول ٹیچر نے تازہ سیبوں پر پنسل سے نقوش کھینچ کر چہرے بنادیئے ہوں اور پھر انھیں اسمارٹ سے یونیفارم پہنادیئے ہوں۔ وقارالدین گائیڈ کے فرائض یکسوئی سے نبھا رہا تھا۔

''میم اس وادی میں literacy rate 100% ہے یہاں لوگ غریب تو ہیں لیکن محتاج ہرگز نہیں یہاں آپ کو نہ کوئی گداگر نظر آئے گا اور نہ ہی کوئی اَن پڑھ۔ نہ کوئی ضعیف اور بیمار پالوشن فری اس ویلی میں سکولوں اور ہسپتالوں کی بہتات نے بیماری، ضعف اور جہالت کو کہیں دور بھگا دیا ہے۔''

دونوں ماں بیٹی نے سڑکوں پر منظم انداز میں چلتے سکولوں کے بچوں کے صاف ستھرے لباسوں اور چیری سے دمکتے یاقوتی چہروں کی جوانی میں وقارالدین کے سراپے کو دیکھا جو کہہ رہا تھا۔

''اس وادی میں پالوشن ہے نہ جرائم کسی تھانے میں برسوں بعد بھی کوئی رپورٹ درج نہیں ہوتی۔ اسی لیے آپ کو یہاں نہ کوئی پولیس چوکی نظر آئے گی اور نہ ہی کوئی سیکیورٹی گارڈ۔ میم یہاں سب انتہائی خالص شفاف اور اوریجنل ہے۔''

''مسٹر وقارالدین کیا یہاں کی نسل بھی ابھی تک خالص ہنزیائی ہے۔'' سمل کی ماما نے برف پوش چوٹیوں سے اترتی خوبانیوں اور چیری کے پیڑوں سے گزرتی مشکبار ہواؤں سے گہرے گہرے گھونٹ بھرے جیسے پوری فضا پیور منرل واٹر کی بوتل ہو جیسے آکسیجن کے سیلنڈر رکھے دھرے ہوں جو پھیپھڑوں کو اسفنج کرتے اور مزاجوں میں تازگی بھرتے ہوں۔

''جی میم! ہر لڑکے لڑکی کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وہ لاہور کراچی لندن امریکہ کہیں بھی تعلیم حاصل کرے لیکن واپس اسی وادی میں آکر اپنے لوگوں کی سروس کرے۔ ہماری پہلی ترجیح اپنی ہی وادی میں ملازمت حاصل کرنا ہے۔''

''اور شادی؟''

یہ لفظ سمل کے منہ سے یوں نکلے جیسے کسی اچانک جھٹکے سے دل کلیجہ اُچھل کر منہ میں آگیا ہو۔ کسی خطرناک موڑ پر پراڈو جیپ کی بریکیں سیاہ رغنی چمچماتی سڑک پر دور تک ٹائروں کو گھسیٹتی چلی گئیں۔ ماما نے سمل کے چہرے کو حیرت سے دیکھا جس کے گالوں اور ہونٹوں پر چیری کے یاقوت دمکنے لگے تھے۔ گولڈن پیک کی سنہری برف پر آگ سی لگی تھی۔

''جی میم! شادی تو امیر آف ہنزہ کی طے شدہ تاریخ پر ہی منعقد ہوتی ہے جو بالعموم دسمبر کی کوئی تاریخ رکھی جاتی ہے اور جمعرات کا دن مقرر ہوتا ہے جس میں امیر آف ہنزہ خود شرکت کرتے ہیں اس دن کے علاوہ پوری ہنزہ ویلی میں کوئی شادی منعقد نہیں ہوتی۔''

''مسٹر وقارالدین کیا آپ خود بھی یہیں کسی ہنزیائی لڑکی سے شادی کرنا پسند کریں گے جب کہ آپ تو لاہور کی ایک اعلیٰ یونیورسٹی سے

انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کررہے ہیں۔''

مما نے ٹورسٹ گائیڈ کے سراپے کو پہلی بار نظروں میں تولا۔ برف پوش چوٹیوں کا وقار، اخروٹ کے پیڑوں سی گمبھیرتا، سیبوں، خوبانیوں چیریوں کی مٹھاس تازہ تازہ رسیلا ذائقہ۔

''یس میم اگر ایسا نہ ہوتو ہمارا کلچر پیور نہیں رہے گا۔''

اب وہ اپنے منگول النسل ہونے کی ہسٹری بیان کررہا تھا۔ کتنے سلسلے اور رشتے جڑ گئے تھے یہ ہسٹری بھی صدیوں قرنوں کے گھونٹ بھرتی رواں چشموں میں آمیز ہوتی رہتی ہے۔ سمل نے آدھی رانوں پر چڑھی کیپری پر منے سے فراک کو کھینچ کر درست کیا۔ بات بات میں ہسٹری لمحے لمحے میں ہسٹری جیسے اس وادی کا ہر فرد اور ہر ذرہ ہسٹری کی کتاب کا کوئی باب ہو۔

''مسٹر وقار! کوئی ایسا خطہ یا باشندے ایسے نہ ہوں گے جو کسی ہسٹری یا بیگ گراؤنڈ کلچر سے نہ جڑے ہوں۔ دنیا کے ہر علاقے ہر فرد کی ہسٹری اور کلچر ہوتا ہے لیکن ہسٹری کی بھی ہسٹری یہی ہے کہ وقت اور حالات اُسے تبدیل کردیتے ہیں پھر بعد میں یہی تبدیلی ہسٹری ہوجاتی ہے۔ ہاں بحیثیت گائیڈ آپ کے لیے علاقے کی ہسٹری اور روایتی کلچر بہت اہمیت رکھتا ہے۔

ورنہ مسٹر وقار الدین اس اکیسویں صدی میں پیور کلچر کا مطلب شدت پسندی اور بنیاد پرستی تصور ہوتا ہے۔ آج ایک یونیورسل کلچر بڑھ رہا ہے۔ آپ نے جو لباس پہن رکھا ہے جو گلاسز اور گھڑی لگا رکھی ہے۔ ان بچوں نے جو یونیفارم پہن رکھا ہے جو تعلیم حاصل کررہے ہیں کچھ بھی پیور نہیں ہے ۔ یہ طرزِ تعمیر یہ برتن، فرنیچر ضرور ہسٹوریکل ہیں، جو میوزیم میں رکھے جاسکتے ہیں لیکن انسان قدیم ہسٹری رکھتے ہوئے بھی ہر عہد کے ساتھ جیتے ہیں ۔ مسٹر وقار کیا آپ کو کسی میوزیم کی الماری میں سجایا جاسکتا ہے؟''

''میم آپ کا آٹھ روزہ قیام انتہائی یادگار اور ہسٹریکل رہے گا۔'' وقار الدین معزز خواتین کے ساتھ کسی بحث میں اُلجھنا نہ چاہتا تھا کہ گائیڈ بحث نہیں کرتا محض معلومات دیتا ہے۔

''سامنے ملاحظہ کیجیے کوہ قراقرم کے پہاڑی سلسلے فلک بوس چوٹیاں ، ادھر بائیں طرف راکاپوشی، نانگا پربت، ادھر لیڈی فنگر، سامنے گولڈن پیک، سنہری برف سے ڈھکی ہوئی۔ یہ برف پوش چوٹیاں پھلوں کے باغات پر شور جھرنے چشمے، آبشاریں اور گلیشئر اور پہاڑی دریا آپ کو کئی اور پہاڑی علاقوں میں بھی مل جائیں گے لیکن میم یہ تنظیم، تعلیم، ترتیب، صفائی اور سکون اور کسی پہاڑ پر نہیں ملے گا۔ ہنزہ ایک ایسی جنت ہے جس کی یادیں ہمیشہ آپ کے ساتھ رہیں گی یہ یادیں اور گزرے ہوئے دن حافظے کی ہسٹری بنتے جائیں گے۔ قدرت کی فیاضی کو یہاں کے باشندوں نے بہت سنبھال کر رکھا ہے۔''

''کیا ان یادوں میں آپ خود شامل ہونا پسند نہ کریں گے مسٹر وقار الدین؟''

پہاڑوں پر بچھے کارنی فورس ٹریز آسمانوں تک بلند قطار اندر قطار اُٹھتے چلے گئے تھے۔ جیسے ہزاروں فوجی مارچ پاسٹ کے لیے تیار کھڑے ہوں۔ میلوں بلندی سے اترتی آبشاریں، انتہائی رفتار اور شور سے سڑک عبور کرتی نیچے دریا میں گر رہی تھیں۔ لال پراڈو نے پوری سپیڈ کے ساتھ سڑک پر بہتے گلیشئرز کے رواں دریا کو پار کیا۔

''آف کورس میم میں آپ کا گائیڈ۔''

دریائے ہنزہ کا بہاؤ تیز تھا۔ جس میں اُبھرتی ڈوبتی چٹانوں کے سلسلوں پر آبشار اور رواں چشمے میلوں بلندیوں سے اُترتے اس قوت سے گرتے کہ بات سمجھنے کے لیے کان ایک دوسرے کے منہ کے قریب لانے پڑتے۔ چٹانوں کی کہانوں پر اُترتے چڑھتے جھاگ اُڑاتے برفیلے پانیوں کے تیز گام سلسلے سڑک کے ساتھ ساتھ رواں تھے۔ وہ تینوں خاموشی سے گاڑی میں بجتے بروشسکی گیت سنتے رہے۔ شفاف ہواؤں میں رچی چیری اور خوبانی کی خوشبو میں لپٹے ہوئے سڑک سے نیچے ڈھلان اُترنے لگے۔

''میم ہم جس گاؤں میں داخل ہورہے ہیں یہ گنش کہلاتا ہے جس رستے پر ہم چل رہے ہیں یہی رستہ کبھی سلک روٹ یا شاہراہ ریشم تھا، یہ بھاری پتھروں والی دیواروں کے ساتھ جو لوہے کے کھونٹے ٹھنکے ہیں انہی کے ساتھ ادھر چین اور آزربائیجان سے آنے والے تاجر اپنے گھوڑے باندھتے اور قافلے یہاں قیام کرتے تھے۔ یہاں ہر مکان صدیوں پرانا تاریخی ورثہ ہے۔ یہاں کے باشندوں نے اپنی ثقافت اور کلچر کو ابھی تک قائم رکھا ہوا ہے۔ یہ بروشسکی بولتے ہیں جبکہ انگریزی اور اُردو پر کمانڈ رکھتے ہیں۔''

کلچر روایات ماضی سے جڑے رشتے اور ثروت مند ورثہ عام سیاح تو یہی دیکھنے یہاں آتا ہے لیکن سمل کو لگتا یہ لفظ اُسے چرانے کے لیے بولے جارہے ہیں۔ سیاہ پتھروں والے مکانوں کے دروازوں میں سے لڑکیوں کے چہرے جھانکنے لگتے تھے۔ باریک مینا کاری اور کھدائی والے سیاہ دروازوں کی درزوں میں جیے چیری کے یاقوت جڑے ہوں۔ ہر علاقے کی اجناس اور پھلوں کی تاثیر وہاں کے باسیوں کی رنگت اور جلد میں جھلکنے لگتی ہے۔ جیسے پنجاب میں گہنوویں رنگے، سوات کشمیر میں سیبوں سے خوش رنگ چترال کوہستان کے سنگلاخ پہاڑوں میں اخروٹ بادام چلغوزے کے چھال سے کرخت چہرے اور یہاں چیری جیسے یاقوتی رسیلے ہونٹ سیبوں سے گال منگولی و یونانی نقوش کا ست نچوڑ کر ہنزہ کی لڑکیوں کو گھڑت دے دی گئی تھی۔ سیاہ پتھروں سے چنے تین منزلہ مکانوں کے بیچ پھیلے تالاب میں نوعمر لڑکے چھلانگیں لگاتے اور ڈوب کے تیرنے لگتے جس پر اخروٹ کے بوڑھے چھتنار سایہ کیے ہوئے تھے اور پہلوؤں میں پتھر کی نشستیں بنی ہوئی تھیں۔ ٹورسٹ گائیڈ اب اس تالاب کی ہسٹری شستہ انگریزی میں بیان کررہا تھا۔

''دریائے ہنزہ کے اُس پار نگر کا قصبہ ہے۔ گنش اور نگر کے حکمران سگے بھائی ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے دُشمن تھے لیکن دونوں کی فیصلہ کن

جنگ کے بیچ یہ دریا حائل تھا۔ اسی لیے گنش کے نوجوانوں کو اس تالاب میں تیراکی کی تربیت دی جاتی تھی جو بپھرا ہوا دریائے ہنزہ رات کی تاریکی میں تیر کر پار کرتے اور نگر پر حملہ آور ہو کر فجر تک واپس بھی آ جاتے۔

مکانوں کے دروازوں سے جھانکتی لڑکیاں اب باہر نکل آئی تھیں۔ پیشانی تک اسکارف باندھے میٹھی مسکان اور مخصوص ہنزیائی خوش اخلاقی سے سمل کو دیکھتی تھیں جیسے کہتی ہوں ہماری تاریخ ہے کہ ہم ہر سیاح کو اپنا مہمان سمجھتے ہیں اور خوش اخلاقی ہمارے کلچر کا حصہ ہے۔ سمل کو لگا جیسے وہ ساری اپنے چہرے آبشاروں کے برف چور سے دھونے کے بعد چیری کا غازہ مل کر آئی ہوں اور اب کلچرڈ مسکان لیے اُسے چرا رہی ہوں۔ سمل کا جی چاہا ان میں سے ہر ایک سے پوچھے کیا وہ اس گائیڈ کو پسند کرتی ہے اور اگر وہ اقرار میں سَر ہلائے تو اسی قلعہ میں بند کر دے جس کے بارے میں وہ بتا رہا تھا ''نگر اور گنش میں چونکہ دیرینہ دُشمنی چلی آ رہی تھی۔ اس لیے یہ دفاعی قلعہ بنایا گیا تھا رات کے وقت گنش کی پوری آبادی یہاں محصور ہو جاتی اور اکلوتے دروازے پر پہرے دار نیزوں، تلواروں کے ساتھ مسلح رہتے۔ اس قلعے کا بس ایک ہی دروازہ ہے نہ کھڑکی نہ روشندان۔''

قلعے کی وحشت اور سنگینی سے دونوں ماں بیٹی گھبرا گئیں، جیسے وہ اُس تہ خانے والی ڈھائی تین فٹ اُونچی کوٹھڑی میں محصور کر دی گئی ہوں جہاں برف کے موسموں میں پوری بستی کے مویشی بند ھتے ہیں اور جس کے فرش پر لوہے کے جنگلے بچھے ہیں۔ وہ انھی سیاہ کھردرے پتھروں والی کلچرڈ دیواروں میں چن دی گئی ہوں اندر ہی اندر نکلتے چھوٹے چھوٹے اندھیرے کمرے جیسے کسی پہاڑ کو کاٹ کر سرنگیں بنا دی گئی ہوں۔ گہری تاریک اور طویل سرنگیں جن کا دور کہیں ایک ہی دھانہ تھا۔ سمل نے سوچا سرنگ جتنی بھی طویل، تاریک اور گہری ہو اُس کا کوئی ایک دھانہ تو ضرور ہوتا ہے۔ جس میں سے ہوا آتی ہے، گزرا جا سکتا ہے۔ گائیڈ اس قلعے کی جنگی حکمتِ عملی پر روشنی ڈال رہا تھا۔ قلعے کے اکلوتے دروازے کی دفاعی تکنیک بیان کر رہا تھا۔

سمل نے سیاہ بھاری پتھروں کی ہیبت کو دیکھا۔ حملہ آور طاقت ور ہو تو کیا دفاعی تکنیکیں کامیاب ہو سکتی ہیں۔

سمل اس گاڑھے ثقیل کلچر کے گریس جیسے چیچپے سیال میں جیسے لتھڑی ہوئی چڑیا جو ڈیزل بھرے ڈرم میں گر گئی ہو اور اب بھیگے پروں کے ساتھ بھاری بھاری اُڑان بھرتی ہو سرنگ نما قلعے کے دھانے کی سمت کھیتوں میں مرد کام کر رہے تھے۔ کچھ درختوں سے پکے ہوئے پھل اُتار رہے تھے۔ اُنھوں نے سکول سے پلٹتے پینٹ شرٹس میں ملبوس تر و تازہ پھلوں جیسے بچوں کے ہاتھ اُن کے لیے تازہ پھل بھجوائے، جیسے پھلوں، خوشبوؤں اور رنگوں سے بھری اس بستی میں مہمانوں کو اپنی روایات کے تحت خوش آمدید کہہ رہے ہوں۔

''میم! کھیتوں میں کام کرنے والے یہ سبھی لوگ پڑھے لکھے ہیں کوئی انجینئر ہے، کوئی اُستاد تو کوئی ڈاکٹر تو کوئی کسی ہوٹل کا مالک، لیکن اپنا آبائی پیشہ کھیتی باڑی کسی نے نہیں چھوڑا۔''

یہ بھی تمہارے کلچر کا حصہ ہو گا یہ کلچر ہے کہ بستر ہے سرھانہ ہے کہ کھانا ہے۔ کروٹ بھی بنا کلچر کے نہیں بدلنی نوالہ بھی بنا کلچر کے نہیں توڑنا۔

وقارالدین یہ تم لوگ کیا ہو۔ تمہیں نوکروں، مزدوروں جیسے کام کرتے ہوئے کوئی کمپلیکس محسوس نہیں ہوتا۔ عجب تہذیب ہے جس میں کوئی طبقاتی امتیاز ہی نہیں۔ کوئی کیسے زندہ رہے، وہاں جہاں کوئی احساسِ برتری محسوس کرنے کا جواز ہی باقی نہ رہے۔

''میم یہاں نوکر مالک آجر اجیر کا کوئی تصور نہیں یہاں کسی معاشی معاشرتی تفریق پر اسٹیٹس قائم نہیں ہوتا۔ یہاں نہ ہی کوئی باہر سے آ کر جائیداد کی خرید و فروخت کر سکتا۔ نہ سرمایہ کاری اسی لیے نہ افراطِ زر پیدا ہوتا ہے نہ کلچر میں کوئی آمیزش نہ بیگانگی نہ نفسانفسی۔ یہ قناعت پسند اور مطمئن لوگ اپنے ہاتھ سے خود اپنا کام کرتے ہیں۔ مثلاً ہماری مائیں بہنیں اسکول کالجوں میں پڑھتی پڑھاتی بھی ہیں لیکن اپنی باری پر اپنے گاؤں کی گلیوں اور طویلے کی صفائی بھی کرتی ہیں اور سلائی سنٹر میں سلائی کڑھائی بھی، یہاں بزرگوں کی تنظیم انتہائی فعال اور کارآمد ہے جو سارے معاملات کو بخوبی چلاتی ہے ہر بستی یا گاؤں کا ایک روایتی تنظیمی ڈھانچہ ہے۔''

سمل نے اپنے شانوں سے نیچے سٹریٹ کیے سنہری رنگے بالوں کی جھالر کو گھما کر بکھیرا۔ مسئلہ تو یہ تھا کہ کلچر، تہذیب، ثقافت، تاریخ، رسم و روایات میں سر سے پیر تک لتھڑا ہوا یہ شخص اُس سے ٹکرا گیا تھا جو یورپین لباس پہنتا اور یورپی لہجے میں انگریزی بولتا تھا لیکن اس خول کے اندر سب کلچر بند تھا۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ وہ گنش کی چیری ایسی لڑکیوں جیسی حسین نہ تھی لیکن کوہِ قراقرم کی کسی برف پوش چٹان سے تراشا ہوا یہ اساطیری مجسمہ مقابل تھا جو کہتا تھا ''میم ہمارا کلچر بڑا'' Rich ہے ہم اسے سنبھال کر رکھنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے تو ہم دُنیا کی اعلیٰ یونیورسٹیوں سے تعلیم حاصل کرنے کے باوجود ملازمت اپنی وادیٔ ہنزہ میں ہی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور شادی بھی امیرِ ہنزہ کی اجازت سے اپنی ہی کسی لڑکی سے کرتے ہیں۔''

گویا اب مقابلہ ٹھہرا تھا ہنزہ کی قدیم اور مضبوط تہذیب کا لاہور کی گلوبلائزیشن سے اور ماما کہتی تھیں یہ لوگ اپنی تہذیب سے بہت جڑے ہوتے ہیں یہ بہت راست گو، سادہ اور مخلص لوگ ہین جو کہتے ہیں وہی ان کے دِل میں ہوتا ہے اور جو دِل میں ہوتا ہے وہی کر گزرتے ہیں۔ اسی لیے یہ اپنے ہی جیسے لوگوں میں فٹ رہتے ہیں۔

سمل گولڈن پیک کی سنہری برف کو اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں اُتارتی۔

''ماما یہی خصوصیات تو کمزوری ہوتی ہیں مقابل کی کہ جو وعدہ کر لے وہ پورا کرے، جو تعلق بنا لے اُسے سنبھال کے رکھے، جو بولے وہ دِل سے

بولے۔ مدِمقابل کا سچا اور دوٹوک ہونا دوسرے فریق کے لیے دفاعی حکمتِ عملی بنانا آسان کر دیتا ہے۔''

''لیکن بے وقوف لڑکی یہ یاقوتی رنگت یہ شرمیلی مسکان، یہ گھڑا گھڑا ناک نقشہ وادیٔ ہنزہ کے خوب صورت مناظر اور موسموں سے کشید کی ہوئی ہنزیائی لڑکیوں کا مقابلہ تو کیسے کرے گی۔''

''ماما یہ سانولی رنگت ہی تو میرا ہتھیار ہے بنا مرچ مصالحے والا چائنز فوڈ کوئی کب تک کھا سکتا ہے، پھر خوب صورتی نقوش کی بناوٹ میں نہیں اسٹائل میں ہے۔ رنگ رُوپ معصومیت میں نہیں حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور سمارٹ نس میں کھلتا ہے یوں بھی افراط سے دِل بھر جاتا ہے۔ پرانا ذائقہ چاہے کیسا ہی خوش گوار ہو، نیا ذائقہ اچھا لگتا ہے۔''

''ترتیب، تنظیم، اصول، ضابطے توڑنا اِک اپنا تھرل رکھتا ہے۔''

''لیکن یہ تھرل حاصل کرنے والی بے قاعدگی ان کے مزاج کا حصہ نہیں ہے۔''

''ایسے سادہ مزاج کو بدلنا ہی تو آسان ہوتا ہے۔ بھید بھاؤ والے مزاج کی کروٹوں کو سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ شیشے سی شفاف فطرت سے آر پار سب دِکھائی دیتا ہے، جب کوئی اوٹ کوئی پوشیدگی نہ رہے، تو پلاننگ آسان ہو جاتی ہے۔''

ہوٹل کے کمرے میں دونوں ماں بیٹی اس اچانک اُٹھ کھڑے ہونے والے ایشو پر گھنٹوں بحث کرتیں۔

آخر ماں زِچ ہو جاتیں۔ ''ساری دُنیا میں تمہیں یہی تہذیب، تاریخ، کلچر، ثقافت پکارتا اسماعیلی ٹورسٹ گائیڈ ہی نظر آیا تھا۔''

''سمل کھڑکی سے گولڈن پیک کی سنہری برف کو آنکھوں میں اُتارتی۔ ٹورسٹ گائیڈ نہیں ماما۔ اِک بڑے ہوٹل کے مالک کا اکلوتا بیٹا کیمیکل انجینئر ہنزہ کا یہ دیدہ زیب ماڈل سچا کھرا دِل کے کھونٹے سے بندھا ہوا ناک کی سیدھ میں چلنے والا سدھایا ہوا بیل۔ آپ کی بیٹی کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتی ماما۔''

پگھلتے گلیشیرز کی ٹھنڈک میں نہائی خوبانی اور چیری کی مہکاریں ہوٹل کے بے شمار زینے چڑھتیں اور سمل کی سانولی رنگت میں عنابی رس بھر دیتیں جیسے یہاں کی فضاؤں میں کوئی سنہری گلابی غازہ بھرا ہو۔

''رات ڈھائی بجے ہوٹل میں اِک شور اُٹھا، جو دریائے ہنزہ کے جلترنگ کو لپیٹ گیا۔ ماحول، موسم اور مناظر کی شدت آوازوں کی کھنک، قدموں کی چاپ اور بیگوں کی گھسٹ میں بھر گئی تھی۔ لڑکیوں کی چہکار اور دریائے ہنزہ کی گنگناہٹ کے ہنگامے سے دھکا کھا کر سمل باہر نکل آئی۔ کاؤنٹر پر وقارالدین بکنگ میں مصروف تھا اور ان گنت شہد کی مکھیاں چیری کے اس پھول پر بھنبھنا رہی تھیں جو پروں کی جھنکار میں ہوٹل کے استقبالیہ پر سجا تھا۔

سمل لابی میں تتلی سی چکر لگانے لگی، جس کی دیواروں پر ہنزیائی سوغات و نوادرات سجے تھے۔ پیروں میں بچھے ہنزیائی غالیچے ٹیرس پر رکھا بانس کی تیلیوں سے بنا ہوا ٹوکرا جو یہاں ہر روایتی گھر کے گرمائی کمرے کی چھت پر دھرا ہوتا ہے۔ موتی جڑی لڑیوں والی ہنزیائی ٹوپیاں، کرتے، مردانہ واسکٹ اور کھڑاویں کلچر کے طور پر سجے تھے۔

وقارالدین چابیوں کے بہت سے گچھے پکڑے جو سرخ، سبز، نیلے گہرے رنگ موتیوں سے جھمکوں کی ساخت میں بنے تھے۔ لڑکیوں کو کمرے دِکھانے کے لیے کاؤنٹر سے نکلا تو اُس کے پیچھے دائیں بائیں لڑکیوں کا آبشاری ریلا تھا موجیں مارتیں۔ چہلیں کرتیں بہانے بہانے اس سے ٹکراتیں جیسے پگھلتا ہوا کوئی گلیشیر گرتا ہوا لینڈ سلائیڈ اُترتا ہوا آبشار طویل راہداری کے بیچوں بیچ سیاہ شال میں لپٹی ہوئی سمل کھڑی تھی۔ وقارالدین جیسے لیڈی فنگر کی چوٹی سے ٹکرا کر سنبھلا، چوٹی کے سر پر دھری برفیں کھنک کھنگ چور چور ہو بکھریں جیسے آسمانوں کے کناروں میں شگاف پڑ گئے ہوں۔

''میم آپ تشریف رکھیے میں آپ کے لیے چائے بھجواتا ہوں۔''

ویٹنگ روم کا دروازہ کھولا اور سَر کے تعظیمی اشارے سے جیسے کسی غلطی کی معذرت طلب کی ہو۔ وہ سوت سے بنے باریک نقش و نگار والے اٹیک کاؤچ پر تتلی سی منڈلائی، نیچے اُترتی موڑ کاٹتی سڑک کے اطراف خوبانی اور چیری کے پھل دار درختوں سے سجے تھے۔ دائیں ہاتھ ہوٹل کے لان میں انگور کے چھتنارے تلے دیودار کے تنے کاٹ کر بنائی گئی نشستوں پر اس وقت بھی سیاح بیٹھے تھے۔ نیچے جھاگیں اُڑاتا رات کے سکوت میں غراتا بپھرا ہوا دریائے ہنزہ مہیب چٹانوں کو پایاب کرتا، جیسے چاندی کی گاگریں برف سے بھرتی اور اندھاتی رہٹ میں چکرا رہی ہوں۔ دُور پیچھے اس مشکبار وادی کو قراقرم کی بلند فصیل حصار کیے ہوئے تھی۔ راکاپوشی، نانگا پربت، لیڈی فنگر کی برف آخری تاریخوں کے چاند میں کترنیں سی بکھری تھی۔ گولڈن پیک کی سنہری برف پر زرد چاند آ کر ٹھہر گیا تھا۔ اُوپر کی منزل میں وقارالدین لڑکیوں کو اُن کے کمرے دِکھا رہا تھا۔ قدموں کی ڈگر ڈگر اور قہقہوں کی جلترنگ سے پورا ہوٹل چہک اُٹھا تھا۔ دریائے ہنزہ میں گرتی آبشاروں کا شور قیامت اُٹھا رہا تھا۔ دیودار کے دراز قد پیڑوں نے سنگِ مرمر کے پہاڑوں کے سیاہ مہیب سایوں میں تاریک گپھائیں بنا دی تھیں۔ سمل کا جی چاہا، راکاپوشی کے اس سنو مین کو سیاہ نقاب سے ڈھک کر اس گپھا میں چھپا دے۔

چاقو سے اُنگلیاں کٹوانے کا حق وہ کسی کو نہ دینا چاہتی تھی۔ اس وقت وہ ٹرپ کی ہر حسین لڑکی کو اپنے ہاتھوں قتل کر سکتی تھی۔ اس وادی میں جس کے کسی تھانے میں قتل کا کوئی پرچہ درج نہ تھا۔

اگلے روز سمل کی ماما کے اصرار پر ہنزہ کا یہ گائیڈ اُنھیں اپنا گھر دِکھانے لے گیا۔ وادیٔ ہنزہ ملکی و غیر ملکی سیاحوں سے چھلکتا تھا۔ رات پہنچنے والے ٹرپ کی لڑکیاں شدید میک اپ کیے چھ چھ اِنچ کی باریک ہیلیں پہنے دریائے ہنزہ کی چٹانوں سے پھسلتی اور چیخیں مارتیں ہنزہ کے اس گائیڈ کو ہاتھ ہلاتی تھیں، اور غیر ملکی سیاح جو گرز اور جین پہنے ہاتھوں میں ہنزہ کی تاریخ والے

کتا بچے پکڑے دُوربین اور کیمرے لٹکائے ذرّے ذرّے کی ہسٹری اور کلچر کو محفوظ کر رہے تھے لیکن ہنزہ کا یہ سب سے خوبصورت گائیڈ صرف ان ماں بیٹی کو گائیڈنس دے رہا تھا۔

''میم یہ کمرہ برف کے دِنوں میں استعمال ہوتا ہے۔'' بہت نیچی چھت والے سیاہ پتھروں سے بنے اس کمرے کے وسط میں ہر وقت آگ جلتی رہتی ہے۔''

کمرے کے چہار اطراف بنے چبوترے پر ہنزیائی دریاں بچھی تھیں۔ دونوں ماں بیٹی پیر لٹکا کر بیٹھ گئیں۔ سیاہ اسکارف اور چادروں میں لپٹی ہوئی وقارالدین کی ماں اور بہنیں آئیں اور ان سے معذرت کرنے لگیں کہ آج ان کی باری باڑے کی صفائی اور گنش گاؤں کی گلیوں میں جھاڑو لگانے کی تھی۔ لیکن گھر میں مہمانوں کی خبر پاتے ہی وہ لوٹ آئیں اور اب اُوپر رسوئی میں اُنھوں نے چائے چڑھا رکھی ہے اور خوبانی کا شربت تو تیار ہی تھا۔

ماما نے جھرجھری لی۔ باڑے کی صفائی اور گلیوں میں جھاڑو اور اس گُھٹے ہوئے سیاہ پتھروں کی سرنگ میں چائے پینے کے خوفناک تصور کی شدت کو سمل کے چہرے پر کھوجا جو وقارالدین کی ماں کی رواں انگلش کو حیرت سے سن رہی تھی جو مقامی ہائی اسکول میں ہیڈ مسٹریس تھیں اور بہن زریں اسلام آباد کی ایک یونیورسٹی سے ایم ایس سی کر رہی تھی۔ تعلیمی درجات کے حوالے سے تو دونوں ماں بیٹی اُن سے آگے تھیں لیکن جو تراش خراش گلوبلائزیشن کی دَین تھی وہ گلیمر بھی کلچر کے رکھ رکھاؤ نے دبا لیا تھا۔ ان نفیس نقوش اور چیری سے دمکتے چہروں کی منکسر المزاجی جیسے کوئی عجوبہ ہو۔

وقارالدین گائیڈ کے فرائض نبھا رہا تھا۔

''میم سائیڈ میں یہ جو کوٹھڑی ہے۔ برف کے موسموں میں جانور ذبح کر کے اس کے پارچے رسّی میں پرو کر یہاں لٹکا دیئے جاتے ہیں۔ برف کے اختتام پر ہر گھر میں بچ رہنے والا گوشت پرانے گھی میں پکا کر پورے گاؤں کی ضیافت تیار کی جاتی ہے اور موسم بہار کی آمد کا جشن منایا جاتا ہے اور یہ جو کمرے کے اندر چھوٹی کوٹھڑی ہے یہ ہمارا اسٹور ہے جس میں اناج بھر کر محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ اب برف کا سارا موسم اسی بند کمرے میں اسی اناج اور گوشت پر بسر کیا جاتا ہے۔ باہر ساری وادی برف سے اٹ جاتی ہے۔ راستے رابطے اور ٹرانسپورٹ ختم، لیکن پتھروں کے اس برفانی اگلیو میں زندگی چلتی رہتی ہے۔''

اس سیاہ پتھروں کے بند کمرے میں ماما کا دم گھٹنے لگا۔ پتھریلے زینے چڑھ کر وہ سب اُوپر آ گئے۔ اُوپر کھڑکیوں والا ہوادار کمرہ تھا جس میں موسمِ بہار گزارا جاتا تھا۔ بلند چوٹیوں پر پگھلتے گلیشیرز اور آبشاروں کے برفیلے پانیوں کی ٹھنڈک کے کئی گھونٹ اُنھوں نے بھرے۔ چیری اور خوبانی کے عطر سے معطر اس کمرے میں کرسیاں اور میز بھی موجود تھا جہاں اُنھیں خوبانی کا گاڑھا گاڑھا شربت پیش کیا گیا اور پھر ایک نئے ٹی سیٹ میں چائے پلائی گئی۔ اس کمرے کے اُوپر گرمائی کمرہ تھا۔ کئی ستونوں پر کھڑا جیسے اُونچی چھت والی بارہ دری جس کی چھت کے بیچوں بیچ تقریباً آٹھ فٹ کے سوراخ پر بانس کی تیلیوں سے بنا بڑا سا ٹوکرا اوندھے منہ دھرا تھا۔ گرمیوں کے دِنوں میں یہ بارہ دری رات سونے کے لیے استعمال ہوتی تھی۔

برف سے بچنے کے لیے کلچر، گرمی سے بچاؤ کے لیے کلچر، موسم بہار سے لطف اندوز ہونے کے لیے کلچر۔ یہ عجب لوگ ہیں انگریزی انگریزوں کی طرح بولتے ہیں۔ اُردو اہلِ زبان کی طرح بولتے ہیں۔ لیکن بروشسکی کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں۔ جدید ماڈرن ہوٹل بنا لیے لیکن رہتے انھی کلچرڈ گھروں میں ہیں۔

اس کلچر کی افراط سے جی متلانے لگا۔ وہ واپس ہوٹل کے کمرے میں آ گئیں، جو غیر ملکی سیاحوں سے بھرا رہتا، جو یہاں کی تہذیب، ثقافت، تاریخ، کلچر دیکھنے کو اُمڈے چلے آتے تھے۔ یہ وادی ہے کہ کلچرڈ میوزیم۔

اگلے روز قلعہ التت اور قلعہ بلتت کا وزٹ تھا جس کی طویل چڑھائی کا ذِکر سن کر ماما نے ہوٹل کے کمرے میں ہی رہنا پسند کیا اور سمل لال پراڈو کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہنزہ کے بازاروں کو دیکھتی تھی۔ جہاں وال ہینگنگز ہنزیائی دریاں، غالیچے، ٹوپیاں اور واسکٹس دُکانوں کے باہر لٹک رہی تھیں جن کی قیمتیں ڈالروں میں لکھی تھیں، جہاں چینی انجینئرز اور مزدور برمودے پہنے مقامی افراد سے یوں گھلے ملے ہوئے تھے جیسے وہ بھی صدیوں سے اسی کلچر کا حصہ رہے ہوں۔ سلک روڈ پر جاری اُن کے آباؤ اجداد کا صدیوں پرانا سفر یہاں بے شمار کلچرل رِشتے بنا گیا تھا۔ نقوش اور زبان کے رِشتے روایات اور تاریخ کے رشتے جب وہ طویل چڑھائی چڑھتے چڑھتے ہانپ گئی تو ہنزہ کے اس گائیڈ نے اُس کا حوصلہ بڑھایا۔

''میم! وہ سامنے بلتت فورٹ ہے۔ بلتستان کی شہزادی گل ریز جب یہاں کے ایک شہزادے سے بیاہ کر آئی۔ تو اپنے ہمراہ دو سو کاریگر لائی اور اُن سے کہا یہاں وہاں اِدھر اُدھر اُوپر نیچے دو محل بناؤ یوں قلعہ التت اُدھر نیچے سردائی محل بنا اور یہ اِدھر اُوپر گرمائی قلعہ بلتت بنایا گیا۔ التت بلتت کا مقامی زبان میں مطلب ہے اِدھر اُدھر، اُوپر نیچے، یہاں وہاں، بس اُس کے منہ سے نکلے ان لفظوں کے معنی پر غور کیے بغیر ان فورنس کا نام ہی قلعہ التت قلعہ بلتت مروج ہو گیا۔''

اِدھر اُدھر، اُوپر نیچے، یہاں وہاں۔

سمل نے لکڑی کے نقش و نگار والے انٹیک زینوں پر قدم قدم رکھتے ہوئے خود سے ایک زینہ آگے چلتے ہوئے اپنے گائیڈ کے مضبوط قدموں اور باڈی بلڈرز سے جسم کو دیکھا۔ التت بلتت یہ ہنزیائی شہزادہ لاہور کی تیز رفتار سڑکوں پر پراڈو جیپ چلاتا کیسا لگتا ہو گا۔ جیسے دیودار کا درخت اکھاڑ کر کسی میدانی علاقے میں گاڑ دیا جائے۔

مسٹر وقارالدین۔ التت بلتت اِدھر اُدھر تو ہوتا رہتا ہے۔ آپ کبھی لاہور کی ماڈرن یونیورسٹی میں جدید تعلیم حاصل کرتے ہیں تو کبھی اس کلچرل سپاٹ ہنزہ ویلی میں ٹورسٹ گائیڈ ہوتے ہیں۔ اُوپر نیچے، اِدھر اُدھر، یہاں وہاں یعنی التت بلتت ہی تو کلچر کی حقیقت ہے۔

قلعے کا گائیڈ اُنھیں اس قلعے کی ہسٹری اور اس کے باسیوں امیر آف ہنزہ کے خاندانی سلسلے اور یہاں ہونے والے اہم واقعات بتا رہا تھا۔ دیواروں پر سجے شاہی خاندان کے فوٹو گراف دِکھا رہا تھا۔ وقارالدین کے اپنے گھر جیسی طرزِ تعمیر والا یہ محل جو پورے پہاڑ پر پھیلا تھا، جس میں ایک رقص گاہ بھی تھی جہاں نوجوان لڑکے ڈھول کی تھاپ پر رقص کر رہے تھے۔ بروشسکی گیت بج رہے تھے۔ کئی منزلہ شاہی محل میں شاہی ظروف فرنیچر اور ملبوسات تک محفوظ تھے۔ کئی خواب گاہیں، نشست گاہیں، دیوانِ عام، دیوانِ خاص، زنداں خانے، منزل در منزل، اندر ہی اندر گھومتے باون کمرے ایک دوسرے میں کھلتے چلے گئے تھے، جن کا صدر دروازہ ایک ہی تھا۔ لیکن خود مکین یہاں سے جا چکے تھے۔ کچھ اِدھر لاہور، اسلام آباد میں تھے تو کچھ اُدھر امریکہ، یورپ یعنی الَتت بلتت، اِدھر اُدھر تو ہوتا رہتا ہے۔ سمل سب سے اُوپر والی چھت کی بارہ دری میں لگے مارخور کے بڑے بڑے سینگھوں والے سر کے نیچے رکھے آسمانی رنگ کے شاہی وضع کے صوفے پر بیٹھ گئی۔ پورا محل چکنی خاکستری مٹی سے لپا ہوا جیسے گولڈن پیک کی سنہری برف لپٹی ہو۔

''امیر آف ہنزہ یہاں کیوں نہیں رہتے۔ اپنے پُرکھوں کا محل چھوڑ گئے اب یہ محض ایک میوزیم ہے۔ سیاحوں کے لیے ہنزہ کی تہذیب و کلچر کا ایک قدیم نمونہ۔'' وہ آتے رہتے ہیں ہماری شادیوں اور تہواروں میں ہمارے ساتھ شریک ہوتے ہیں اِدھر نیچے ماڈرن محل موجود ہیں اُن کی نئی رہائش گاہیں۔

''ہاں وقارالدین شادی، مرگ، تہوار پر آتے رہنا چاہیے اپنے کلچر اپنی زمین کا اِتنا سا حق تو ادا کرتے رہنا چاہیے۔ گرمیوں کی چھٹیاں تفریح کے دِن گزارنے کو اس سے خوبصورت جگہ دُنیا میں اور کہاں ہوگی۔ یہ کلچرل، ورثہ یہ حسین مناظر اور پالوشن فری خوشگوار موسم تفریح کے دِن گزارنے کو، بہت خوب ہے۔''

سمل کا آٹھ روزہ قیام بڑھتا چلا جا رہا تھا ایک بار ساری وادی دیکھ چکنے کے بعد ماما تو دریا کے کنارے ہوٹل کے لان یا اُوپر ٹیرس سے دریائے ہنزہ میں بھیگتی چٹانوں پر بیٹھے سیاحوں کی انجوئے منٹ سے محظوظ ہوتیں اور سمل لال پراڈو جیپ میں ہنزہ کے سب سے خوبصورت گائیڈ کے ہمراہ علی آباد، نگر حیدر آباد، قصبات میں اِتنا گھومی کہ لاہور والی میم پورے ہنزہ میں مشہور ہو گئی۔ کتنے ٹرپ آئے، ٹورسٹ آئے لیکن وقارالدین بس ایک ہی ٹورسٹ کو گائیڈنس دیتا تھا۔ ہنزہ دربار ہوٹل کی نیچی چوکیوں پر بیٹھ کر دونوں نے کئی بار کھانا کھایا درختوں سے چیریاں اور خوبانیاں توڑیں۔ دریائے ہنزہ میں بھیگتی چٹانوں پر بیٹھے برف پوش چوٹیوں کا نظارا کیا۔ سرنگ بنے گلیشیرز کے اندر ٹارچ جلا کر دُور تک گئے۔ پلٹے تو سمل برفیلے پانیوں میں نچڑتی، کپکپاتی ہوئی۔ لال پراڈو میں بیٹھی تو ہنزہ کے اس گائیڈ نے ہر موڑ پر اتنی بریکیں لگائیں کہ گیلے کپڑوں سے نچڑتا پانی ڈرائیونگ سیٹ کو بھی بھگو گیا۔

وقارالدین کے گھر دعوت کھائی تو اُس کی ماں نے شرماتے ہوئے بتایا کہ اُنھوں نے وقارالدین کی شادی کے لیے گھی اکٹھا کرنا شروع کر دیا ہے۔ گنش کی بستی کے بیچوں بیچ تالاب کناروں ہر گھرانے کا قدرتی فریج موجود ہے۔ یعنی ڈیڑھ دو فٹ گڑھا کھود کر اندر درخت کی چھال میں مکھن لپیٹ کر دبا دیا جاتا ہے۔ مکھن مہینوں برسوں جمع ہوتا رہتا ہے اور پھر بستی میں کسی بھی شادی پر ہر گھر کے اس قدرتی فریج سے کئی کئی کلو دیسی گھی نکل آتا ہے جس سے شادی کی ضیافت تیار کی جاتی ہے۔ اب وقارالدین کی شادی کے لیے گھی جمع ہو رہا تھا۔

وقارالدین کی والدہ نے کہا تھا۔

''گھی تو بہت جمع ہو گیا ہے۔ بس اب دسمبر کی کسی جمعرات کو امیر ہنزہ شادی کی تاریخ دے دیں گے۔''

زریں نے پرانے گھی میں پکے بریانی کباب اُن کے سامنے رکھے۔ یوں قالین پر بیٹھ کر کھانا دونوں ماں بیٹی کو مشکل لگ رہا تھا۔

دونوں میزبان خواتین کبھی اُن کی پیچھے گاؤ تکیے رکھتیں، کبھی زیادہ نرم اور بڑی گدیاں، کبھی سنہرے کیلوں سے سجی باریک کھدائی والی سوت سے بنی پیڑھیاں۔

وقارالدین کی ماں نے معذرت خواہانہ انداز میں دسترخوان پر کھانا چنتے ہوئے شستہ اُردو میں کہا۔

''اِدھر علی آباد میں نیا گھر تقریباً مکمل ہونے کو ہے۔ اگلی بار آپ کو وہیں کھانا کھلائیں گے۔ وقارالدین تو اپنی دولہن کے ساتھ وہیں رہے گا۔''

زریں نے انگریزی میں کہا:

''وہ بڑی خوش قسمت لڑکی ہوگی میرا بھائی انتہائی کلچرڈ شخص ہے۔''

سمل ہنس دی۔

''یہ ہنزہ ویلی کلچر میں بہت خود کفیل ہے۔ ہر ذرّے، ہر شئے، ہر انسان میں سے کلچر بہے چلا آ رہا ہے۔''

دریائے ہنزہ کے ساتھ ساتھ بل کھاتی سڑک کو چینی انجینئرز اور مزدور کشادہ بنا رہے تھے۔ تعمیراتی مشینری کی رکاوٹ کے سبب لال پراڈو کو بار بار رُکنا پڑ رہا تھا۔ وقارالدین کو گلمت پہنچنے کی جلدی تھی جہاں اک بڑا اجتماع تھا اور وہ ہنزہ کے اس کلچر کو بھی اپنی ٹورسٹ کو دِکھانا چاہتا تھا، جہاں روایتی ملبوسات میں عورتیں مرد جمع تھے۔ موتیوں جڑی شوخ رنگ ٹوپیوں کی بہار ہنزہائی عورتوں کے پُرمشقت چہروں پر کھل رہی تھی۔ سامنے اسٹیج پر مختلف عمر کے مردوں کے رقص جاری تھے۔ ڈرامے کھیلے جا رہے تھے۔ خوشی کے گیت گائے جا رہے تھے۔ مختلف کارناموں پر ایوارڈ دیئے جا رہے تھے۔ وہیں وقارالدین کی بڑی بہن کو ملکۂ حسن کا خطاب دیا گیا تھا جو مقامی کالج میں باٹنی کی لیکچرر بھی تھیں۔ سمل نے سوچا صرف وادیٔ ہنزہ ہی کیوں یہ تو مس یونیورس کے لیے بہترین انتخاب ہیں۔ دراصل آج اسماعیلی فرقے کے پیشوا کی سالگرہ پورے ہنزہ میں منائی جا رہی تھی۔ شام ہوتے ہی ہر قصبے کے باسیوں نے اپنے اپنے پہاڑوں کو سجا لیا تھا۔ ہر پہاڑ پر چراغاں تھا جیسے جہاز کی کھڑکی سے کسی بڑے شہر کی روشنیاں دِکھائی دیتی ہیں۔

آج کا دِن اہلِ ہنزہ کے لیے جشن کا دِن تھا۔ اس روز دُور دراز شہروں اور ملکوں میں پھیلے اسماعیلی واپس ہنزہ پہنچتے ہیں۔ ہر بستی کے نوجوان نمازِ فجر کے بعد پہاڑوں پر چڑھنا شروع کرتے ہیں۔ ٹرک، بس، گاڑیوں کے ٹائر، رسے اور پیٹرول کے کین اُٹھائے اُوپر چڑھتے ہیں اور پھر جس قدر بلندی پر رسوں سے باندھ کر ٹائر پھینک سکتے ہیں پھینکتے ہیں اور مغرب کے بعد اُنھیں آگ لگا دیتے ہیں دُور سے ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے فلک بوس پہاڑوں پر بجلی کے قمقمے جھلملا رہے ہوں۔ کسی پر سالگرہ مبارک لکھا ہے کہیں تم جیو ہزاروں سال، کہیں ''Happy Buirthday to you''

جتنے خوبصورت سلوگن بنتے ہیں جتنی دیر تک یہ روشنیاں نمایاں رہتی ہیں اُتنے ہی نمبر زیادہ ملتے ہیں۔ اس وقت بھی جیوری فیصلے کے لیے بیٹھی تھی۔ جب کوئی جلتا ہوا ٹائر نیچے لڑھکتا تو محسوس ہوتا جیسے کوئی ستارہ ٹوٹ کر گرا ہو۔ اُس کی جگہ نیا ٹائر پھینکا جاتا تاکہ لکھے ہوئے لفظوں کا کوئی سپیلنگ مٹ نہ جائے۔ برف پوش چوٹیوں کی آغوش میں یہ چراغاں جیسے برف میں آگ لگی ہو پوری ہنزہ ویلی جگمگا رہی تھی۔ گولڈن پیک پالش شدہ سونے کی مانند دمکتی تھی۔ ماما ہوٹل کی چھت پر بیٹھی اس خوبصورت منظر سے لطف اندوز ہوتی تھیں اور سمل اپنے گائیڈ کے ساتھ علی آباد، حیدرآباد کے سجے ہوئے پہاڑوں کا نظارہ لال پراڈو جیپ کے کھلے شیشوں سے کرتی تھی جن کا جھلملاتا ہوا عکس دریائے ہنزہ کی تند خیز روانی میں یوں پڑتا تھا، جیسے پانیوں پر ستاروں بھرا آسمان بچھ گیا ہو۔ سمل نے شور مچا دیا گاڑی روکو۔۔۔ رُک جاؤ۔۔۔ رُک جاؤ۔۔۔ جگمگاتے پہاڑوں کا عکس پانیوں میں اُتر آیا تھا۔

وہ دونوں نیچے اُترنے لگے۔ ان پہاڑی دریاؤں کا بھی عجب ویہار ہے۔ بظاہر لگتا ہے جیسے سڑک کی سطح سے ذرا نیچے ہوں لیکن اُترتے چلے جاؤ دریا کی سطح نیچے ہی نیچے دھنستی چلی جاتی ہے۔ دریا مزید پرشور اور جوشیلا ہوتا جاتا ہے لیکن قریب نظر آنے کے باوجود دُور نیچے کہیں پاتال میں اُترتا چلا جاتا ہے۔

ماما کہتی ہیں یہ پہاڑوں کے رہنے والے بھی اِتنے ہی گہرے اور دُور دُور ہوتے ہیں۔ ان کی جڑیں انھی دریاؤں میں کہیں اُتری ہوتی ہیں۔ ان کے دِل انھی پہاڑوں جیسے سخت اور کشادہ ہوتے ہیں کہ زمین کے موسم اور فیچر اپنے باسیوں کے مزاج متعین کیا کرتے ہیں۔ پانی میں ڈوبتی اُبھرتی چٹانوں پر قدم قدم رکھتے ہوئے وہ دونوں ایک مہیب پتھر پر دریا کے بیچ بیٹھ گئے۔ پیر برفیلے پانیوں میں بھگوئے سمل پہاڑوں پر بچھے چراغاں کے عکس کو پانی میں ہاتھ ڈال ڈال جیسے پکڑنے لگی۔

''وقارالدین لاہور کے لیے دو سیٹیں کنفرم کروادو۔''

وقارالدین نے پانی میں بچھے قمقموں کے عکس کو چلّو میں بھرتی سمل کو ہڑبڑا کر دیکھا کئی جلتے ہوئے ٹائر ڈھلان سے لڑھک کر کہیں پاتال میں گم ہو گئے اُن کی جگہ پر کئی اور ٹائر فی الفور پھینکے گئے کچھ اپنی جگہ پر ٹک گئے کئی پھر گر گئے۔

''لیکن آپ کو تو ابھی نہیں جانا تھا۔''

''یہ سوال تو کسی گائیڈ کا ہونا ہی نہیں چاہیے وقارالدین مسافروں کو تو واپس جانا ہی ہوتا ہے۔''

ہوٹلوں کی چھتوں پر بیٹھے سیاح چاروں اطراف پھیلے پہاڑوں پر جگمگاتے سلوگن دیکھ دیکھ تالیاں بجا رہے تھے۔

''لیکن آپ تو۔۔۔ آپ رُک سکتی ہیں۔''

''وہ کیسے وقارالدین۔''

''یہ ہوٹل میرا گنش والا قدیمی گھر، علی آباد والا نیا بنگلہ اور یہ ساری وادی کھڑکیاں دروازے کھولے آپ کی منتظر ہے۔'' کئی ٹائر یکبارگی شعلوں میں لپٹے اِک قطار میں بھڑکے۔

''وقارالدین تمہارا ہوٹل گنش والا میوزیم گھر اور علی آباد والا جدید بنگلہ چھٹیاں گزارنے کے لیے بہترین ہیں۔''

سمل دریا میں گرتی چوڑے دھانے والی آبشار میں اُبھری چٹانوں پر پیر جما جما کر واپس پلٹنے لگی۔ نجانے اس دریا کا منبع کہاں ہوگا۔

کسی برفانی چوٹی سے نکل رہا ہوگا نجانے کتنے میلوں کا سفر طے کر کے کتنے پہاڑی سلسلوں سے اُترتا کتنے نشیب و فراز سے گزرتا اس دریا میں گرنے کو کتنا بے تاب اور پرشور۔

وقارالدین وہیں بیٹھا رہ گیا تھا۔

اردگرد پھیلے پہاڑوں پر جلتے قمقمے آہستہ آہستہ بجھ رہے تھے جس پہاڑ کے قمقمے پہلے بجھ جاتے، مقابلے سے خارج ہو جاتا تھا۔ وقارالدین کی دلچسپی تو گنش گاؤں کے سجائے گئے پہاڑ سے تھی جو ابھی پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا، جس کے نوجوان ہر بجھتے ٹائر کی جگہ نیا جلتا ہوا ٹائر فی الفور پھینک رہے تھے۔

''میم ٹھہریے! کیا آپ ہوائی جہاز سے جانا پسند کریں گی یا لال پراڈو جیپ کو لاہور کی سڑکوں پر دیکھنا چاہیں گی؟''

''دائیں بائیں، یہاں وہاں، اُوپر نیچے، اِدھر اُدھر، التت بلتت۔'' یہی تو کلچر کی حقیقت ہے۔

جگمگاتے پہاڑ روشنیوں کا ہالہ معلوم ہوتے تھے، جیسے برقی کرنٹ بھر گیا تھا۔

سمل کو لگا وہ لاہور کے گھر میں لگی اُس کال بیل کی طرح تن ن تن ن بجنے لگی ہے، جس پر کسی مہمان نے اُنگلی دھر دی ہے۔ اُس کے چہار اطراف پھیلے پہاڑی سلسلے جگمگا رہے تھے جن کے قمقموں کا عکس وقارالدین کی منگولی آنکھوں کے عزم اور سچائی میں دہکتا تھا۔

گولڈن پیک کی سنہری برف ان قمقموں کے عکس سے سونا بن گئی تھی۔ خوبانی اور چیری کی مہکاریں ساری وادی کو بھر چکی تھیں جنھیں لاہور کے بازاروں میں جا کر بکنا تھا۔

''وردِ زباں''

نعت رسول ﷺ

صابر عظیم آبادی

(کراچی)

ہر ابتدا سے پہلے ہر اک انتہا کے بعد
ذکر رسول کرتا ہوں ذکر خدا کے بعد

جو خلق میں عظیم ہو الفت میں بے مثال
ایسا بشر نہ پیدا ہوا مصطفٰے کے بعد

نکلے جو روح جسم سے میرے تو اس گھڑی
وردِ زباں دردو ہو حمد و ثنا کے بعد

ان کا خلوص ان کی محبت تو دیکھئے
دشمن کو بھی گلے سے لگایا جفا کے بعد

آئی جو ان کے نام کی آواز کان میں
نکلا نہ کچھ زبان سے صلِ علیٰ کے بعد

سارے نبی ہی قابل تعظیم ہیں مگر
اعلیٰ مقام آپ ﷺ ہی کا ہے خدا کے بعد

ہو گی دعا قبول خدا کے حضور میں
پڑھ لیجئے درود کوئی ہر دعا کے بعد

بس اتباع سرور ﷺ کونین شرط ہے
ہوگا کرم خدا کا نبی ﷺ کی رضا کے بعد

سب کچھ ملا ہے مجھ کو دیارِ رسول ﷺ میں
کیا مانگنے کو رہ گیا ہے صابر عطا کے بعد

○

نعت

خورشید انور رضوی

(اسلام آباد)

جہاں تیرا قدم آقاؐ وہیں سر اپنا خم آقاؐ
تمہیں ظل الٰہی ہو تمہیں میرا امم آقاؐ

تمہیں میر عرب ٹھہرے تمہیں میر عجم آقاؐ
نہیں ساری خدائی میں تجھ ایسا محترم آقاؐ

ہم ایسے عاصیوں پر بھی ترا فیضِ کرم آقاؐ
ازل سے تا ابد تک تُو لکھے کیا کیا قلم آقاؐ

رقم تو صیف کیسے ہو گرہ میں لفظ کم آقاؐ
بہت ہم تجھ سے شرمندہ دلوں میں ہیں صنم آقاؐ

کدھر دیکھیں کدھر جائیں مصیبت میں ہیں ہم آقاؐ
رہے گر یوں ستم ہر دم نکل جائے گا دم آقاؐ

ہمارے پاس اب کیا ہے بجز اک چشم نم آقاؐ
کسی سے کیا گلہ شکوہ عدو خود اپنے ہم آقاؐ

بس اب درکار ہر پل ہے تری چشم کرم آقاؐ

○

''چاند سا چہرہ''

سید مشکور حسین یاؔد (لاہور)

اعتبارِ عالم کی ہم وہی شہادت ہیں
جو بشر بشر پہنچے ہم وہی بشارت ہیں

وقت سے ذرا پہلے آ گئے ہیں ہم ورنہ
جس کا آنا برحق ہے ہم وہی قیامت ہیں

ہم کو دُور تک دیکھو اور دیکھتے جاؤ
انتظار ہے جس کا ہم وہی شباہت ہیں

مہربان ہوتے ہیں عجز و معجزہ کے ساتھ
جو اَنا کی ضامن ہے ہم وہی عنایت ہیں

دیدہ و شنیدہ میں جو ہے رازِ پُرکاری
سادگی کی ساعت میں ہم وہی ساعت ہیں

ہم سے بات کرنے میں ذکر کیوں خزاں کا آئے
باغ باغ جو کردے ہم وہی بغاوت ہیں

ایک ایک سورج کو ہم نے ضوفشاں رکھا
مہر مہر جو پہنچے ہم وہی مہارت ہیں

جس کا چاند سا چہرہ ہر گھڑی ہے روشن یاؔد
طلعتِ تراوت میں ہم وہی تلاوت ہیں

○

نقشبند قمر بھوپالی
(ٹلسا، امریکہ)

اتنے چپکے سے جو آئی ہے صدا دیکھ تو لو
ہو نہ وہ ماہ جبیں ، جان و فا دیکھ تو

فکرِ منزل میں بچھڑ جاؤں نہ خود سے ہی کہیں
قافلے والو میں کس سمت گیا، دیکھ تو لو

لوٹ کر آ ہی گئی ہو نہ جوانی میری
یہ جو در پر مرے دستک ہے ذرا، دیکھ تو لو

اس نے ہی فلسفۂ زیست کی تفسیر لکھی
شاخ سے ٹوٹ کے جو پتہ گرا، دیکھ تو لو

زورِ طوفاں کا نتیجہ تو بنا دوں گا مگر
ناخدا ساتھ چلا ہے کہ خدا، دیکھ تو لو

فیصلہ اب مرے حق میں ہی کیا جائے گا
بے سبب تو نہیں یہ ناز و ادا ، دیکھ تو لو

کیسا یہ شور قیامت ہے سرراہ وفا
کیا کوئی اور بھی ہے میرے سوا، دیکھ تو لو

یہ قمر نقوی حجابات کا شکوہ کیسا
پردۂ حسن ازل خود ہے اٹھا، دیکھ تو لو

○

امین راحت چغتائی (راولپنڈی)

اب ہے کوئی جو اُس کا کہا مانتا نہیں!
یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ خدا نہیں

اک آدمی ہو اور ہو دعویٰ خدائی کا!
پھر وہ بساطِ دہر پر دیکھا سدا نہیں

ممکن اگر ہو سیرِ گریباں ہی کیجیے
ہم کیا کہیں کہ شہر میں کیا کچھ ہوا نہیں

ہر لمحہ حیات کی اُس کو خبر رہے
اِک اپنے آپ ہی پہ نظر ڈالتا نہیں

کیا عہد ہے کہ سانس بھی لینا محال ہے!
اب ہم نہیں یا بامِ کشادہ فضا نہیں

آنکھیں جھکی رہیں بھی تو آنسو چھلک پڑے
منظر وہ اَن کہی کا کبھی بھولتا نہیں

آخر کو زخم تھے جو چھپائے نہ چھپ سکے
ہم نے یہ کب کہا ہے کہ اپنی خطا نہیں

کوئی تو بات ہے جو ہوئے اجنبی سے ہم
کیوں آئینہ بھی اب ہمیں پہچانتا نہیں

بکھری پڑی ہے صحن میں ہر شے مکان کی
لیکن کوئی بھی اپنی خطا مانتا نہیں

چہرہ بھی دل کا آئینہ ہوتا ہے دیکھ لو
ہم کیا کہیں کہ دل میں ہے کیا اور کیا نہیں

جب سے مصاحبین کے زمرے میں آ گیا
راحت تو اب کسی کو بھی پہچانتا نہیں

جمیل یوسف (مری)

فسونِ لفظ سے شعر و بیاں تخلیق کرتے ہیں
جہانِ آرزو میں گلستاں تخلیق کرتے ہیں

یہی دھوکا ہمیں امکان کی دنیا میں لاتا ہے
فریبِ حسن سے اک آسماں تخلیق کرتے ہیں

ترا مکھڑا نئے آہنگ کے سُر چھیڑ دیتا ہے
تری صورت سے معنی کا جہاں تخلیق کرتے ہیں

تری آنکھیں طلسم لفظ و معنی بخش دیتی ہیں
ترے لب سے شرابِ ارغواں تخلیق کرتے ہیں

غموں کی چلچلاتی دھوپ ہم تک آ نہیں سکتی
تری زلفوں سے ایسا سائباں تخلیق کرتے ہیں

یہ دنیا آدمی سے حسنِ نیت چھین لیتی ہے
نئی دنیا نئے کون و مکاں تخلیق کرتے ہیں

زمیں کہنہ ہے اور ہے آسماں سختی پہ آمادہ
نئے ڈھب کے زمین و آسماں تخلیق کرتے ہیں

حسن کی ساکت و جامد فضا سے دل گرفتہ ہیں
ترے پیکر سے اک سروِ رواں تخلیق کرتے ہیں

ابھی تک تشنۂ تعبیر ہے جو خواب دیکھا تھا
اُسی خوابِ حسیں سے اک جہاں تخلیق کرتے ہیں

○

ملک زادہ منظور
(لکھنؤ، بھارت)

صبح کی نرم دھوپ میں اس کے سوا بہت ہوا
دل کی کلی نہ کِھل سکی رقصِ صبا بہت ہوا

پہنی زرہ ہوس کی پھر سوچ کے میں نے آخرش
مقتلِ راہِ شوق میں کارِ وفا بہت ہوا

ہوگی ہر اِک دعا قبول قبلہ بدل کے دیکھ لو
کعبۂ شہرِ یار میں سجدہ ادا بہت ہوا

پھرتی رہی برہنہ سر بانوئے شہرِ حریّت
کوئی مگر نہ لا سکا ذکرِ ردا بہت ہوا

اُس کے بدن کی چاندنی فکر میں میرے ڈھل گئی
نازشِ فن کے واسطے رنگِ قبا بہت ہوا

یہ بھی خدا کی شان ہے رزم گہہ حیات میں
زخم تو مجھ کو کم لگے حشر بپا بہت ہوا

○

سرورانبالوی (راولپنڈی)

تخیّلات نے یہ وقت بھی دکھانا تھا
وہ پھر سے تازہ ہوا زخم جو پرانا تھا

چراغِ بزم کی لو میں بھی ڈھل گئے ہیں ہم
ہمیں خبر بھی تھی اُس کو کبھی نہ آنا تھا

رہِ حیات میں ہر سمت تیرگی ہے بڑی
رُخِ حیات سے پردہ ذرا اٹھانا تھا

مقدروں کے اندھیرے کبھی تو چھٹنے تھے
اُسے بھی بام پہ آخر کبھی تو آنا تھا!!

یہ میری بستی کے باسی بھی کتنے ناداں ہیں
کسی کے واسطے اپنا ہی گھر جلانا تھا؟

ہوائے تُند میں گھر سے نکل پڑے ہیں ہم
وفا و مہر کا ہم کو دیا جلانا تھا

وہ شہرِ سیلِ حوادث میں جو ہُوا ہے کھنڈر
اُسی خرابے پہ اِک محل پھر اُٹھانا تھا

قدم قدم پہ اب احساس اِس کا ہوتا ہے
کہ بچپنے کا زمانہ بھی کیا سہانا تھا

بڑی ہی دیر میں جا کر یہ راز کھُلتا ہے
کہ زندگی تو حقیقت میں اِک فسانہ ہے

○

ڈاکٹر شباب للت (شملہ،بھارت)

اک گُلبدن کے پیار کو آزار لکھ دیا
کیسا یہ جھوٹ تُو نے ستم گار! لکھ دیا

ہم جانتے تھے اِسکی ملے گی سزا ہمیں
اعلانِ حق مگر سرِدیوار لکھ دیا

دنگوں کی آگ جس نے بجھائی تھی شہر میں
ہم نے اُسی کو غازیٔ کردار لکھ دیا

زلفوں کی باسلیقہ تراش خراش تھی
کچھ مسخروں نے اُس کو ہی مشتِگار لکھ دیا

جھوٹی گواہیوں نے دئے باندھ اُسکے ہاتھ
منصف نے بے گُنہ کو گُنہ گا ر لکھ دیا

اب موت بھی مٹا نہ سکے گی میرے حبیب!
دل پر جو تیرانام ہے اک با رلکھ دیا

منصب کے اہل کب تھا میں اُسکی نگاہ میں
نذرانہ لے کے مجھ کو بھی حقدار لکھ دیا

لکھتا تھا میرے نام کے آگے بھی کچھ ضرور
چپکے سے اُس نے لفظ گُنہ گار لکھ دیا

بیٹی کے جنم لینے سے پہلے ہی باپ نے
بیٹی کو ماردینے کا اقرار لکھ دیا

ہوگا وہ بے ضمیر مؤرّخ کوئی شبابؔ
جس نے شہید قوم کو غدّار لکھ دیا

○

آصف ثاقب

(ایبٹ آباد)

کوئی نامہ پرانا آرہاہے
کبوتر کازمانہ آر ہاہے

دماغ ودل کھڑے ہیں پھول لے کر
خیالِ شاعرانہ آ رہا ہے

مرے آنسو میں دنیا ڈوب جائے
یہ دریا بیکرانہ آرہا ہے

مرے لب پر دعا ہے آنے والی
کہ حرفِ عاشقانہ آ رہا ہے

گیا وہ شیر بن کر گھر سے باہر
پلٹ کر بزدلانہ آ رہا ہے

نظرخلقت کی اُس جانب ہے کب سے
فلک سے آب ودانہ آ رہا ہے

اُسے محسوس ہی کرنا ہے ثاقبؔ
یہاں وہ غائبانہ آرہاہے

○

خالدحمیدشیدا
(یو۔ایس۔اے)

جب سے محفل میں وہ آ کر رُوبرُو ہونے لگی
اُسکی شہرت ملک بھر میں سُو بسُو ہونے لگی

اور جب کرنے لگی جلوہ گری وہ بام پر
دیکھ کر دنیا کو اُسکی آرزو ہونے لگی

دیکھ جو چہرہ لیا خطبے میں اُسکا شیخ نے
اُس سے تشبیہہ حوریوں کی ہُو بہ ہُو ہونے لگی

ہے شناسائی یہ کیسی ' دیکھتے ہی دیکھتے
میری رسوائی شہر میں کُو بہ کُو ہونے لگی

لوگ ہم کو دیکھ کر محوِ تماشا ہوگئے
میری جب غیروں کی اُس سے گفتگو ہونے لگی

میں نے جب پوچھا رقیبوں سے ہے کیوں رغبت اُسے
سن کے برہم وہ ہوئی اور تُو بہ تُو ہونے لگی

ترک کی شیدؔا جوانی میں تھی الفت تُو نے جب
وقتِ پیری پھر یہ کیسی جستجو ہونے لگی

○

ڈاکٹر صابر آفاقی
(مظفرآباد)

موسم آیا ہے جواب سرد کہاں جائے گا
رنگ ہے باغ کا جو زرد کہاں جائے گا

قصر بلقیس کی ہر خشت ہے رشک خورشید
تو مسافر ہے لئے گرد کہاں جائے گا

کھیل بچوں کا نہیں کوئے بتاں میں جانا
مرد ہی جائے گا نا مرد کہاں جائے گا

تو چلا ہے کہ مٹے درد مداوا ہوجائے
بڑھ گیا اور اگر درد کہاں جائے گا

اختیار اتنا جماعت کو نہ دینا ہرگز
فرد کی فکر کرو فرد کہاں جائے گا

تیرا جانا تو نہیں مسئلہ کوئی صابرؔ
مسئلہ درد کا ہے درد کہاں جائے گا

○

غلام مرتضیٰ راہی
(فتح پور، بھارت)

لوگ ہر احسان کا اپنے گماں رکھتے ہوئے
میں تمازت سے پریشاں سائباں رکھتے ہوئے

پتھروں میں تھا کوئی خودبیں تو خود آرا کوئی
میں رہا بے فکر شیشے کا مکاں رکھتے ہوئے

اے مرے پایاب دریا، تجھ کو لے کر کیا کروں
ناخدا، پتوار، کشتی، بادباں رکھتے ہوئے

ہم کناروں کی طرح اک دوسرے کے سامنے
پاٹ دریائے انا کا درمیاں رکھتے ہوئے

کر رہی ہے نوعِ انساں ٹکڑے ٹکڑے پر گُزر
اک زمیں رکھتے ہوئے اک آسماں رکھتے ہوئے

○

غالب عرفان
(کراچی)

سوچتا ہوں آج میں وہ کس طرح کی بھول تھی
آنکھ جس کو دیکھنے میں مدتوں مشغول تھی

کچھ خطوط اور دائروں میں مختصر تحریر بھی
ریت پر دریا کنارے ادھ مٹی منقول تھی

مسئلے کے حل نہ ہونے کا سبب کچھ اور تھا
گفتگو تو اُس کی مجھ سے ہر طرح معقول تھی

اُس نے تاریکی میں حسنِ کہکشاں سمجھا جسے
میرے سرتاپا سفر کی جھلملاتی دُھول تھی

صرف شہرِ جسم و جاں پرکھا تو آیا ہے یقیں
ساتھ گزرا تھا کیا؟ جو زندگی معزول تھی

ایک اس کی ہی نظر میں ناپسندیدہ تھی کیوں؟
ذات میری جب کہ ہر ماحول میں مقبول تھی

جستجوئے لمحہ عرفانؔ میں دیکھا تو کھُلا
فاصلوں کو پاٹنے میں آگہی مشغول تھی

○

مہندر پرتاپ چانؔد

(انبالہ بھارت)

ہر چیز کا جب طے ہے اک روز فنا ہونا
بندوں کو بھی لازم ہے راضی بہ رضا ہونا

دہشت کے یہ ہنگامے اِس دور کی بخشش ہیں
اِس دور میں واجب ہے ہر قہر بپا ہونا!

اُن تلخ پلوں کی بھی یادیں ہیں بہت شیریں
ہر بات پہ وہ تیرا ' بے وجہ خفا ہونا!

یہ شرط محبت میں اوّل بھی ہے' آخر بھی
تسلیم کی خُو رکھنا ۔ پابند وفا ہونا

مولا کی عطاؤں پر ہم لاکھ کریں سجدے
ممکن ہی نہیں پھر بھی' اِس حق کا ادا ہونا

باتوں کی حلاوت ہی کافی نہیں رشتوں میں
انسان کو لازم ہے' نیّت کا کھرا ہونا

آنکھوں کے یہ آنسو بھی ہیں کتنے سکوں پرور
دیتا ہے عجب لذّت زخموں کا ہرا ہونا!

اس کرب کو لفظوں میں کس طور بیاں کیجیے؟
اِک طرفہ قیامت ہے' اپنوں کا جُدا ہونا!

اُس جذبہ دل کا اب' اے چانؔد! خدا حافظ
ہو جس کے مقدر میں' شاعر کی اُنا ہونا!

تشنہ بریلوی

(کراچی)

اپنا جہاں بنائیں گے ہم تو جہاں سے دور
اک کہکشاں سجائیں گے اس کہکشاں سے دور

ملتے ہیں چھپ کے عاشق و معشوق کی طرح
کہتا ہے کون ہے یہ زمیں آسماں سے دور

انساں تو درکنار فرشتے بھی آ نہ پائیں
ہم اک مکاں بنائیں گے اب لامکاں سے دور

یہ کائنات بیچ میں حائل ہے کس لئے؟
جائے مَرے یہ تیرے مرے درمیاں سے دور

دعویٰ ہے عشق کا تو بتاؤ ہمیں کہ تم
رہتے ہو کیوں وفا کے ہر اک امتحاں سے دور؟

ساقی ہو پُر شباب تو پیتا ہوں میں شراب
میخانۂ وصال میں پیرِ مغاں سے دور

ہے دوستی کا نا م فقط ' دوستی کہاں
رہتا ہوں خوش میں انجمن دوستاں سے دور

○

صفوت علی صفوت
(منروٗامریکہ)

اشرف الخلق خدارا ہوں فرشتہ تو نہیں
فردِ واحد میں ادارہ ہوں فرشتہ تو نہیں

آتش و مادّہ و نور سبھی ہیں مجھ میں[1]
تیری وحدت کا اشارہ ہوں فرشتہ تو نہیں

مجھ کو معلوم اطاعت و بغاوت ہی نہیں
میں ترے عشق کا مارا ہوں فرشتہ تو نہیں

تجربہ گاہ قیامت کی ہے قائم مجھ سے
تختۂ مشق تمہارا ہوں فرشتہ تو نہیں

زندگی، موت ہے، خلیوں میں گھڑی[2] ہے
میرے
خون میں وقت کا دھارا ہوں فرشتہ تو نہیں

وسوسوں اور توہّم سے لڑا کرتا ہوں
اپنے ہی نفس سے ھارا ہوں فرشتہ تو نہیں

میں ترے جوشِ بلاغت کا ہوں قائل صفوتؔ
اپنی تعریف پہ وارا ہوں فرشتہ تو نہیں

پروین کمار اشک
(پٹھان کوٹ، بھارت)

میں تیرے پاؤں میں بیٹھا ہوا ہوں
خدا کی چھاؤں میں بیٹھا ہوا ہوں

مرا کنبہ تو سارا شہر میں ہے
مگر میں گاؤں میں بیٹھا ہوا ہوں

نیا اِنسان راس آیا نہ مجھکو
پرانے گاؤں میں بیٹھا ہوا ہوں

خدا ہی اب اُٹھائے تو اُٹھائے
دعا کے پاؤں میں بیٹھا ہوا ہوں

یہ سورج کا سفر تمکو مبارک
میاں! میں چھاؤں میں بیٹھا ہوا ہوں

میں کیوں خوشبو کا دریا چھوڑ آیا؟
میں کیوں صحراؤں میں بیٹھا ہوا ہوں؟

عجب نشہ ہے میٹھے زہر میں اشکؔ
میں ''روش کنیاؤں'' میں بیٹھا ہوا ہوں

○

نیاز جیراجپوری
(اعظم گڑھ، بھارت)

اے نیازؔ آنکھوں کو شہرِ آب ساون کر گیا
ہجر میں اسکے ہمیں بے تاب ساون کر گیا

جھیل میں تنہائیوں کی ساتھ سورج کے ہمیں
چھین کر سب روشنی غرقاب ساون کر گیا

تیرتے ہیں آنکھوں میں منظر چتائیں جلنے کے
کشتیوں کو قیدیٔ گرداب ساون کر گیا

کتنے ہی گُلرنگ چہرے ہوگئے بے رنگ سے
وصل کی ہر آس کو زہراب ساون کر گیا

دیکھتے تھے اوٹ سے پیپل کے پنگھٹ پر جنہیں
شہر میں ان چہروں کو نایاب ساون کر گیا

ریگزاروں میں خیال وخواب کے اب کے برس
اے نیازؔ اک ماہیٔ بے آب ساون کر گیا

○

ضیاءؔ شبنمی
(ملتان)

مجبورِ حادثہ تھی مگر بے وفا نہ تھی
تعبیر اُس کے خواب کی مجھ سے جدا نہ تھی

چپ ہوگیا ہوں ترکِ تعلق پہ اس طرح
صدیوں سے جیسے میرے لبوں پر صدا نہ تھی

عریانیٔ سحر کا اڑاتے رہے مذاق
دیکھا جو خود کو اپنے بدن پر قبا نہ تھی

دستک نہ دے سکی ترے دل کے کواڑ پر
بزدل ہوا مری طرح زور آزمانہ تھی

یہ دن بھی اے بہار مجھے دیکھنے پڑے
دستِ شجر میں مثلِ برگِ صبا نہ تھی

دہلیزیں میں نے کتنی ہی دیکھی ہیں صبح وشام
ماں کی طرح کسی کے بھی لب پر دعا نہ تھی

ہم بھی تنک مزاج بہت تھے ضیاؔ مگر
شاخِ گلاب بھی تو صبا آشنا نہ تھی

○

پی۔پی سریواستورند
(نوئیڈا، بھارت)

یادوں کی روشن قندیلیں، سوچوں کی سوغات لئے
خوابوں کی دہلیز پہ آیا دیوانہ بارات لئے

بارسفر سے چور ہے لیکن، دھندھلے سے اُجیارے میں
غم کا مسافر آ پہنچا ہے، پہلے سفر کی رات لئے

دیواریں، کھڑکی دروازے، سب گونگے بہرے سے ہیں
کوئی کیسے گھر میں بیٹھے، دل میں دل کی بات لئے

مردہ خواہش رکھ آیا ہے، دھوپ بھرے تابوت میں وہ
پھر بھی بیساکھی پر آیا، چل کر زخمی رات لئے

اک خاکی کشکول میں ڈالا اس نے اَنا کا سکہ بھی
غم کے ہجرے میں بیٹھا ہے جو اپنی ہی ذات لئے

غم کی صلیبوں کے سائے میں گم صم سا بیٹھا ہے کوئی
ماضی کا شمشان جلا کر، رشتوں کی سوغات لئے

کس کے در پر دستک دے اب، رندؔ کہاں ہاتھ پھیلائے
شہروں شہروں بھٹک چکا ہے، افسردہ حالات لئے

○

سید سعید نقوی
(یو۔ایس۔اے)

بات دل تک پہنچ تو جاتی ہے
بس اَنا اپنی اڑے آتی ہے

قد اچانک نکل بھی آئے تو
آتے آتے ہی عقل آتی ہے

جس سے دل ہو ذہن پر حاوی
عمر بھر وہ گھڑی رلاتی ہے

ہو وسائل کی لاکھ محتاجی
زندگی پھر بھی کٹ ہی جاتی ہے

گزرے دنوں کی وہ اک کسک اب تک
دل کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے

آئینہ چاہے جھوٹ بول بھی دے
عمر باتوں سے پکڑی جاتی ہے

ذہن شہری تو بن گیا ہے سعیدؔ
دل مگر آج تک دیہاتی ہے

○

قسمت کا فیصلہ

کرشن نندہ (چندی گڑھ، بھارت)

شام لال اپنی بیٹی کے ساتھ تیار ہو کر وقت سے پہلے ہی ریلوے اسٹیشن پر آ گیا۔ دونوں باپ بیٹی کی سیٹیں محفوظ تھیں اُنکو جگہ بھی آرام سے مل گئی۔ سامان کے نام پر دونوں کے پاس ایک پُرانا سا تھیلہ اور ایک عدد بریف کیس ہی تھا۔ جس میں غالباً کچھ کپڑے اور ضروری کاغذات تھے۔

''تم نے اپنے سرٹیفکیٹ وغیرہ تو سنبھال لئے ہیں نا بیٹی؟'' شام لال نے اپنی بیٹی رتنا سے پوچھا۔

''آپ گھبرائیں نہیں پاپا' میں نے سب کچھ سنبھال لیا ہے۔ کھانے کا ڈبہ میرے پاس اس تھیلے میں ہے۔ آپ کو جب بھوک لگے بتا دینا میں کھانا نکال دوں گی''

''ارے کھانا تو بارہ بجے کھانا ہے۔ ابھی تو فقط نو ہی بجے ہیں'' شام لال نے جواب دیا گاڑی پوری رفتار سے دوڑی جا رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے سٹیشن پیچھے چھوٹتے جا رہے تھے رتنا نے کوئی کتاب نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ ڈبے میں کوئی خاص بھیڑ نہیں تھی۔ شاید ریزو ڈبہ ہونے کی وجہ سے کم لوگ ہی سوار تھے۔ سامنے والی سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر کا آدمی کچھ الگ تھلگ سا لگ رہا تھا۔ پہناوے سے تو کوئی امیر آدمی معلوم ہو رہا تھا قیمتی کپڑے، ہاتھوں میں سونے کی انگوٹھی' اور ویسے بھی امیر آدمیوں کی شکلیں غریب انسانوں سے نہیں ملتیں۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر یہ واقعی اتنا امیر ہے تو اسکو کسی AC یا اوّل درجہ میں سفر کرنا چاہیے تھا۔ یہ یہاں کیا کر رہا ہے' اونہہ ہوگا اب ہمیں کیا کرنا ہے۔ رتنا نے اپنے بالوں کو جھٹکا دیا اور ساتھ ہی اُس امیر آدمی کے بارے میں سوچنے کی بات بھی جھٹک دی۔

گاڑی بھاگتی رہی۔ سیٹھ جی نے اپنا ہاتھ اُٹھا کر اوپر والی برتھ سے پانی کی بوتل اُٹھانی چاہی۔ بوتل شاید کسی تھیلے میں تھی اور وہ دسترس سے بعید تھی۔ اسلئے سیٹھ جی نے خود اٹھنا چاہا تا کہ کھڑے ہو کر بوتل نکال سکیں۔

''رکیئے انکل' میں نکال دیتی ہوں' رتنا کتاب رکھ کر کھڑی ہوگئی اور بوتل تھیلے میں سے نکال دی اور گلاس میں بھر کر سیٹھ جی کو پیش کیا۔ ''لیجیے انکل پانی''

''جیتی رہو بیٹی'' سیٹھ جی نے آشیرواد دیا۔ رتنا نے بوتل واپس تھیلے میں رکھی اور تھیلا اوپر والی برتھ پر رکھ دیا۔ اور دوبارہ کتاب پڑھنے میں مشغول ہوگئی سامنے سیٹھ جی اب کنکھیوں سے کبھی کبھی رتنا کو دیکھ لیتے۔ بڑی اچھی لڑکی لگتی ہے شاید دونوں باپ بیٹی لگتے ہیں۔ سامان تو ان کے پاس کچھ ہے نہیں۔ ہوسکتا ہے کسی نزدیک کے سٹیشن پر اُترنا ہوگا۔ ویسے لڑکی پڑھی لکھی خوبصورت سادہ اور شریف گھرانے کی لگتی ہے۔ اُونہہ ہوگی اب مجھے کیا لینا ہے ان لوگوں سے۔ سیٹھ جی کے خیالات کا تانتا ٹوٹ گیا۔ وہ پھر اپنے آپ سے مخاطب ہوا۔ تُو اپنا دھیان رکھ، تُو دل کا مریض ہے۔ ارے ہاں!! تم نے دوائی وقت پر لی یا نہیں؟'' سیٹھ جی اب اپنے آپ سے اُلجھ رہے تھے دیکھو! تم نے اگر بروقت دوائی نہ لی تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ ڈاکٹر کی نصیحت یاد ہے نا؟'' ارے بھئی یاد ہے ڈاکٹر کی نصیحت بھی' اُنکا تو کام ہی مریضوں کو ڈرانا دھمکانا ہے۔ لیکن اب پانی کیلئے دوبارہ اس لڑکی سے درخواست کرنی پڑے گی۔

''بیٹا تمہارا نام کیا ہے؟'' سیٹھ جی نے سوال کیا۔

''جی' رتنا'' لڑکی نے بہت سعادت مندی سے جواب دیا۔

''بیٹا تم کو ایک بار پھر تکلیف دینی ہے۔ میں دوائی لینا بھول گیا تھا اسلئے دوبارہ پانی کی ضرورت ہے'' سیٹھ جی نے کچھ لجاتے ہوئے کہا

''تکلیف کیسی انکل'' میں تو آپ کی بیٹی جیسی ہوں۔ آپ کو اس سفر میں کسی بھی چیز کی ضرورت محسوس ہو آپ مجھے بلا تکلف کہیے گا۔ اس میں تکلیف کی کوئی بات نہیں''۔

رتنا نے دوبارہ پانی کا گلاس بھر کر دیا۔ سیٹھ جی نے دوائی لی اور پانی اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ چند لمحوں کے بعد رتنا نے محسوس کیا کہ شاید سیٹھ جی کو کچھ پریشانی سی ہو رہی ہے وہ کروٹ بدل بدل کر بیٹھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ رتنا جو اب سیٹھ جی سے کچھ کھُل کر بات کرنے لگی تھی اُس نے پوچھ لیا ''انکل آپ ٹھیک تو ہیں؟''

''ہاں بیٹا ٹھیک ہوں!'' سیٹھ جی نے بہت دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ''آپ فکر نہ کریں'' لیکن بات شاید اس سے کچھ زیادہ سنگین تھی۔ رتنا کے والد شام لال نے نزاکت بھانپ لی تھی اور فوراً اُٹھ کر سیٹھ جی کے پاؤں کے تلوے اور ہاتھوں کی مالش کرنے لگا دریں اثنا سیٹھ جی اپنی چھاتی ملنے لگے جیسے اُن کو سانس لینے میں کچھ دشواری ہو رہی تھی۔

رتنا تمام شرم' جھجک اور تکلف کو بالائے طاق رکھ کر سیٹھ جی کی چھاتی پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگی۔ لیکن بجائے کسی فائدہ کے سیٹھ جی کی سانس ڈوبنے لگی اور وہ بے ہوش ہو کر لڑھک گئے۔

''باپو یہ تو بے ہوش ہوگئے ہیں۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے ان کی حالت خطرناک ہے اسلئے مزید وقت ضائع کرنے کی بجائے اگلے سٹیشن پر جیسے ہی گاڑی رکے' انکو ریلوے حکام کے حوالے کر دیا جائے تا کہ ان کو فوراً طبی امداد مل سکے۔ ان کو سنبھالنا اب ہمارے بس کی بات نہیں ہے''۔

''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ انکو ریلوے عملہ کے حوالے کر دینے سے شاید انکی جان بچ جائے'' اگلے سٹیشن پر گاڑی رکتے ہی اُنہوں نے سٹیشن ماسٹر سے رابطہ قائم کر کے سیٹھ جی کو اُنکے حوالے کر دیا۔

''ان کے ہمراہ کون ہیں؟'' سٹیشن ماسٹر نے پوچھا۔

''کوئی نہیں ہے۔ ابھی تک تو ہم لوگ ہی انسانیت کے ناطے دیکھ بھال کر رہے تھے لیکن اب آپ مناسب انتظام کر کے انکو ہسپتال بھجوائیں۔ ہم لوگوں کو تو آگے جانا ہے'' رتنا نے معاملے کی وضاحت کی۔

''دیکھئے'' سٹیشن ماسٹر نے ہاتھ جوڑ دیئے ''میں سمجھتا ہوں آپ کی

بے لوث خدمت کی وجہ سے ہی یہ زندہ ہیں۔ انکی نبض ابھی تک چل رہی ہے۔ آپ اگر دوسری گاڑی سے چلے جائیں تو یہ بڑا ثواب کا کام ہوگا۔ آپ جیسے انکو فسٹ ایڈ دیکر یہاں تک لے آئی ہیں۔ اگر تھوڑی سی مزید مدد کرسکیں تو شاید یہ بچ جائیں'' سٹیشن ماسٹر نے درخواست کی۔

رتنا نے اپنے باپو کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال کیا کہ اب کیا کیا جائے دونوں تذبذب کی حالت میں کچھ بھی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کیونکہ وہاں رکنا اشد ضروری تھا لیکن اپنی منزل کی طرف بڑھنا بھی از حد اہمیت رکھتا تھا۔ رتنا کا پریوار کافی تنگدستی کے دور سے گذر رہا تھا۔ رتنا کافی پڑھی لکھی ہونے کے باوجود بیکار تھی۔ خُدا خُدا کر کے کسی بڑی کمپنی سے انٹرویو کیلئے بلاوا آیا تھا۔ بڑی اُمیدیں باندھ رکھی تھیں اگر نوکری مل گئی تو گھر کی گاڑی چل نکلے گی۔ گھر میں ماں باپ کے علاوہ ایک چھوٹا بھائی تھا۔ باپ کسی پرچون کی دُکان پر کام کرتا تھا اب اگر گاڑی چھوڑ دیں تو ساری امیدیں خاک میں مل جائیں گی۔ اور اگر آگے گئے تو شاید رتنا کو نوکری مل جائے گی لیکن سیٹھ جی کا بچنا مشکل تھا۔

رتنا نے فوراً فیصلہ لیا۔ وہ گاڑی چھوڑ دیگی اور انسانی جان بچانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھائے گی۔

گاڑی چلی گئی سیٹھ جی کو ہسپتال داخل کرا دیا گیا۔ رتنا ہمہ تن تیمار داری میں لگ گئی جیسے سیٹھ جی کوئی اجنبی نہ ہوں بلکہ کوئی اپنے ہی سگے سمبندھی ہوں۔ ڈاکٹروں نے بھی پوری کوشش کی۔ اچھی سے اچھی دوائیاں دی گئیں۔ رتنا نے نرسوں سے بھی بڑھ کر خدمت کی۔ ساری ساری رات جاگتی رہی۔ ڈاکٹر لوگ سرگوشیاں کرتے تھے کہ ہم تو سمجھتے تھے کہ یہ ان کی بیٹی ہے۔ مگر ان کا تو کوئی آپس میں رشتہ ہی نہیں ہے۔ دوسرا ڈاکٹر کہتا ''اتنی خدمت تو سگی بیٹی بھی نہیں کر سکتی جناب'' تیسرا ڈاکٹر یہ کہتے ہوئے سنائی دیا کہ ''بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ اگر یہ جناب بچ گئے تو فقط ان محترمہ کی وجہ سے یا پھر پروردگار کی رحمت کی بدولت'' تین دن گذر گئے سیٹھ جی کے گھر والے بھی وہاں پہنچ گئے۔ اب سیٹھ جی مکمل طور پر شفایاب ہو چکے تھے۔ ڈاکٹروں نے چھٹی دے دی۔ ڈاکٹروں نے سیٹھ جی کو رتنا کی دل سے کی گئی تیمارداری کے بارے میں بتایا۔

''میں جانتا ہوں ڈاکٹر صاحب اگر یہ دونوں گاڑی میں میرے ساتھ نہ ہوتے تو شاید میں گاڑی میں ہی دم توڑ دیتا۔ رتنا کی گاڑی میں موجودگی خدا کی رحمت تھی ورنہ کچھ بھی ہوسکتا تھا''۔ پھر وہ رتنا سے مخاطب ہو کر بولے ''رتنا بیٹی اُس دن تمہاری گاڑی چھوٹ گئی تھی آج ہم تمہیں اپنی گاڑی میں تمہاری منزل تک پہنچا دیں گے۔

''اب کوئی فائدہ نہیں ہے انکل'' اب تو ہمیں واپس اپنے گھر ہی جانا ہوگا'' رتنا نے مایوس ہو کر جواب دیا۔

''کیوں؟ کیوں؟'' ایسا کونسا کام تھا جو تب ہوسکتا تھا اور اب نہیں ہوسکتا'' سیٹھ جی نے متحیر ہو کر پوچھا۔ رتنا اور اُسکا والد خاموش تھے اور فقط ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''دیکھو، تم میری بیٹی جیسی ہو، جو بھی بات ہو بلا تکلف بتاؤ۔ شاید کوئی موزوں حل نکل آئے'' سیٹھ جی نے بہت پیار سے پوچھا ''انکل آپ پریشان نہ ہوں۔ معمولی بات ہے اور وہ کام پھر کبھی ہو جائیگا۔ آپ کو مکمل آرام کی ضرورت ہے'' رتنا نے پھر پردہ ڈالنے کی کوشش کی لیکن رتنا کے والد نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے سب کچھ کہہ دیا کہ نوکریاں تو پھر بھی مل سکتی ہیں۔

''اچھا تو یہ بات ہے'' سیٹھ جی نے اطمینان کی سانس لی۔ اور پھر بولے ''ذرا وہ اپنا انٹرویو کا لیٹر تو دِکھاؤ'' رتنا نے انٹرویو کا پروانہ سیٹھ جی کے حوالے کر دیا۔ سیٹھ جی نے اپنے بیٹے وجے کو جو اُنہیں لینے اپنی گاڑی میں آیا تھا، پڑھ کر سنانے کیلئے کہا وجے پڑھ کر مسکرانے لگا اور اپنے والد کے ہاتھ میں تھما دیا۔ سیٹھ جی اپنا لیٹر ہیڈ دیکھ کر زور سے ہنسے اور بولے بیٹی تمہاری نوکری کہیں نہیں جائیگی۔ آپ بے شک دو تین دن بعد آرام کرنے کے بعد ان کے دفتر چلی جانا۔ وہ لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں آپ یہ میرا کارڈ دِکھانا۔ آپکا کام ہو جائے گا۔

رتنا اگلے ہفتے اپنے والد صاحب کے ہمراہ اُنکے دفتر پہنچ گئی۔ جب اُس نے Reception کاؤنٹر پر انٹرویو لیٹر دِکھایا تو جواب ملا۔ ''میڈم آپ نے آنے میں تاخیر کر دی ہے۔ یہ آسامی تو دو دن قبل ہی بھری جا چکی ہے'' رتنا نے سیٹھ جی کا دستخط شدہ کارڈ دکھایا تو ریسپشنسٹ نے اُن کو کمپنی کے چیئرمین کے دفتر کیطرف لے گئی۔ وہاں وہ سیٹھ جی اور وجے کو ایک ساتھ دیکھ کر حیران رہ گئی۔ کچھ بھی بول نہ پائی۔

''گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بیٹی'' پھر وہ کچھ رک کر بولے پہلے تو یہ کمپنی میں ہی چلاتا تھا اب میں نے اسکو وجے جو میرا اکلوتا لڑکا ہے کے حوالے کر دی ہے۔ تم لوگوں سے مل کر میرے خیالات اور حالات بھی بدل گئے ہیں۔ یہ دو دن میں نے وجے اور اسکی ماں کو سمجھانے اور منانے میں ہی لگائے ہیں۔ اُن کو یہ قائل کرا دیا ہے کہ ہمیں رتنا سے بہتر بہو شاید کبھی نہیں مل سکے گی۔ وہ بہو جو وجے، ہمارے گھر اور ہمارے بزنس کا یکساں طور پر خیال رکھ سکے۔ ہمارے گھر میں اب سب لوگ مان گئے ہیں۔ اب اگر آپ لوگوں کی اجازت مل جائے تو بیٹھائی منگوالی جائے''۔

رتنا کا شرم کے مارے بُرا حال تھا۔ اُس نے خواب و خیال میں یہ نہیں سوچا تھا کہ اتنے نشیب و فراز سے بھرپور راستے اچانک منزل میں تبدیل ہو جائیں گے۔ وہ بڑی مشکل سے کہہ پائی میرے پاپا میرے ساتھ ہیں۔ میرا کچھ بھی کہنا درست نہیں ہوگا اسلئے وہ جیسا چاہیں فیصلہ کریں۔

''شاباش'' مرحبا بیٹی مجھے تمہارے اسی طرح کے فیصلے کا انتظار تھا۔ تمہارا فیصلہ قابل تعریف ہے۔ رتنا کے پاپا کو تو کچھ بھی کہتے نہیں سنا۔ بس پُرنم آنکھوں کے ساتھ سیٹھ جی کے بغلگیر ہو گئے جو پہلے ہی سے بانہیں پھیلائے تیار کھڑے تھے اور اسطرح دونوں پریواروں نے قسمت کے اس فیصلے پر مُہر لگا دی۔

دوسرا ہار

حمید قیصر (اسلام آباد)

کمرشل مارکیٹ میں عموماً گرمیوں کی شاموں میں شاپنگ کرنے والوں کا رش قدرے بڑھ جاتا ہے۔گرمی اور لوڈشیڈنگ کے مارے لوگ گھروں سے باہر نکلنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔اس شام بھی نئے شاپنگ مال پر گاہکوں کا رش دھیرے دھیرے بڑھتا جارہا تھا۔جیولرز، کراکری، گارمنٹس، ٹیلرنگ، کلاتھ مرچنٹ، بیکری، الیکٹرونکس، جنرل سٹور اور کھانے پینے کی تمام دکانیں آنے جانے والوں کی چہل پہل سے مصروف ہوگئی تھیں۔

ہل ویو الیکٹرونکس کی نئی دکان کو کھلے ابھی بمشکل ایک ماہ ہوا تھا مگر انہوں نے آتے ہی مارکیٹ میں رونق لگادی تھی۔شام ہوتے ہی وہ بڑی ٹی وی سکرینیں شوروم سے باہر نکال کر گاہکوں کی دلچسپی کے لیے ان پر مختلف ٹی وی چینل بیک وقت آن کردیتے۔جنہیں دیکھنے کیلئے راہ چلتے شائقین بھی رک جاتے۔انکے شوروم کے سامنے تماشائیوں کا ہجوم یوں جمع ہوجاتا جیسے کوئی مداری یا کھیل تماشا ہورہا ہو۔اکا دُکا گاہک دکان میں آجارہے تھے۔اسی اثناء میں ایک سفید رنگ کی کرولا شوروم کے سامنے آرکی جس میں سے ایک میم اور صاحب برآمد ہوئے۔خاتون کی عمر کوئی چالیس کے لگ بھگ ہوگی جبکہ صاحب کوئی پچاس کے پیٹے میں تھے۔دونوں کے ملبوسات خاصے شاندار اور قیمتی تھے اور انکی شخصیات بھی رعب دار تھیں۔وہ دونوں باہر آویزاں بڑی سکرینوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے ہوئے اک شان بے نیازی سے چلتے ہوئے اندر کاؤنٹر پر آئے۔جہاں میاں صاحب اور انکے سیلز مینوں نے خوش دلی سے ان کا استقبال کیا۔

''جی فرمایئے سر۔۔۔۔آپ کی کیا خدمت کی جائے؟'' میاں صاحب نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''دیکھئے چھتیس انچ فلپس ٹی وی کی کیا پرائس ہوگی؟''خاتون نے پوچھا:

''جی بیگم صاحبہ! آپ کے لیے راؤنڈ فگر میں پچاس ہزار ہوجائیگی''میاں صاحب نے جواب دیا۔

''بیگم فی الحال اکیس انچ سکرین والا ٹی وی لے لو''صاحب نے بیگم کو مشورہ دیا۔

''نہیں۔۔۔۔نہیں،مسز اکرام بھی چھتیس انچ والا ٹی وی لے کر گئی ہیں میں چھوٹا ٹی وی نہیں لے سکتی''خاتون نے حتمی انداز میں جواب دیا۔

''اور۔۔۔۔اکیس انچ ٹی وی کتنے کا ہے؟''اب کے ان صاحب نے اپنی بیگم کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

''جی صاحب! وہ آپ کو پینتس ہزار میں مل جائے گا'' میاں صاحب کا جواب سن کر وہ صاحب جیب سے نوٹ نکال کر گننے لگے۔

''میں نے آپ سے کہہ دیا ناں کہ میں چھتیس انچ سے چھوٹا ٹی وی ہرگز نہیں لوں گی'' خاتون نے صورت حال کو بھانپتے ہوئے پیش قدمی کی۔

''بیگم! اگلے ماں شکیل بیٹے کے باہر سے پیسے آجائیں گے پھر آپ بڑا ٹی وی لے لینا'' خاوند نے بیوی کو نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔میاں صاحب اور انکے سیلز مین خاموشی اور بڑی دلچسپی سے یہ تکرار دیکھ رہے تھے۔خاوند بیوی کو بازو سے پکڑ کر تقریباً کھینچتے ہوئے زبردستی کار میں لے آیا۔کار میں بیٹھے بیٹھے بھی دونوں میں کافی دیر سرد و گرم نوک جھونک جاری رہی۔تھوڑی دیر بعد خاتون کار سے اتر کر واپس میاں صاحب کے پاس آئی اور کہنے لگی۔

''دیکھئے یہ میرا قیمتی ہار ہے آپ ابھی اسکی قیمت لگوایئے اور بڑا ٹی وی پیک کردیجئے'' خاتون نے سونے کا ہار اتار کر میاں صاحب کے ہاتھ پر رکھ دیا۔میاں صاحب پہلے تو ہچکچائے مگر خاتون کے اصرار پر مطمئن ہوگئے۔

''ندیم! اس ہار کا سامنے آئیڈیل جیولرز سے وزن کراؤ اور آج کے گولڈ ریٹ کے مطابق اسکی مالیت ایک چٹ پر لکھوا کر لاؤ۔''میاں صاحب نے سیلز مین حکم دیا۔سیلز مین ہار لیکر جیولر کے پاس گیا اور دس منٹ کے بعد ہار کی مالیت ایک لاکھ پچیس ہزار روپے لکھوا کر لے آیا۔اسی دوران وہ صاحب گاڑی سے نکل کر دوبارہ بیوی کے ساتھ کاؤنٹر پر آکھڑے ہوئے۔ان کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ غصے،خجالت اور شرمندگی کے ملے جلے اثرات کے زیر اثر انتہائی کش مکش کا شکار ہیں۔میاں صاحب نے وہ چٹ خاتون کو دے دی۔

''جناب! یہ ٹھیک ہے،آپ بڑا ٹی وی پیک کردیں''خاتون نے جیولر کی چٹ بغور دیکھتے ہوئے دکاندار کو واپس دیتے ہوئے کہا۔

''مگر بیگم،یہ ہار ہماری شادی کی قیمتی نشانی ہے،آپ اسے نہیں بیچ سکتیں''ان صاحب نے بیگم کو ایک بار پھر روکنے کی کوشش کی۔

''آپ مجھے میری مرضی سے کیوں نہیں جینے دیتے،یہ ہار میرا ہے اور میں اسکا جو چاہوں کروں؟'' خاتون نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی خاوند اشتعال میں آگیا اور اس نے بیگم کو تھپڑ جڑ دیا۔خاوند نے میاں صاحب کے ہاتھ سے ہار لیا اور گاڑی کی طرف لپکا۔تھپڑ پڑتے ہی خاتون نے چیخنا چلانا شروع کردیا۔اب تک دکان سے باہر بڑی سکرینوں پر انواع واقسام کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے ناظرین نہایت خشوع وخضوع سے میاں بیوی کی ''لائیو وار'' کی جانب متوجہ ہوچکے تھے۔خاوند ہار سمیت کار میں بیٹھ کر جاچکا تھا۔بیوی نے بھی اسی تیزی سے ایک ٹیکسی روکی اور گھر کی جانب روانہ ہوگئی۔ادھر دکان پر میاں صاحب ایک جاننے والے بزرگ سے یوں گویا تھے۔

''دیکھیں صاحب! کیا زمانہ آگیا ہے۔میاں بیوی،آپس کے جھگڑے گھر سے نکال کر سڑکوں پر لے آئے ہیں''

''میاں صاحب! ہمارے وقتوں کی بیویاں خاوند کے ایک اشارۂ ابرو پر عمل کرنے کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتی تھیں''ان بزرگوں نے اپنا فلسفہ بیان کیا۔

''اجی صاحب! یہ سب میڈیا کا کیا دھرا ہے،سٹار پلس نے

ہمارے روائتی پاکستانی کلچر کا حلیہ بگاڑ کے رکھ دیا ہے'' میاں صاحب نے ان بزرگوں کی بات کو گویا بڑھاوا دیا۔

''ہاں جی! یہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ پڑوسی ملک کے کلچر نے تو گھر گھر ناچ گانے اور فحاشی کو عام کر دیا ہے'' ان بزرگوں نے ایک بار پھر بیان جاری کیا۔

''ویسے میں حیران ہوں، پاکستان کے حکمران اس طرف کیوں نہیں توجہ کرتے۔۔۔شرم ناک بدیسی کلچر کی یلغار سے ہماری نئی نسل بالکل تباہ ہو کر رہ گئی ہے۔۔۔'' میاں صاحب کے لہجے میں مستقبل کا سیاسی لیڈر صاف جھلکنے لگا تھا۔

''میاں صاحب! پاکستانی حکمران بھی کیا کریں؟ توانائی، مہنگائی بے روزگاری، دہشت گردی اور امریکہ بہادر کے دخل در معقولات جیسے مسائل ،وطنِ عزیز نوقیمتی سال ضائع کرنے والا مشرف نامی ایک آمر ورثے میں چھوڑ گیا ہے۔اب ہمارے حکمران کس کس مسئلے سے نمٹیں؟''

''یہ آپ نے امریکہ بہادر کی خوب کہی، جو ہمارا چھپا ہوا ازلی دشمن ہے۔۔۔'' ابھی میاں صاحب اور ان بزرگوں کے درمیان سیاسی بھاشن بازی جاری تھی کہ وہی قیامت بیگم ایک بار پھر اپنے قیمتی ہار سمیت کسی آفت ناگہانی کی مانند آن نازل ہوئیں۔ خاتون نے کاؤنٹر پر پہنچتے ہی اپنا سونے کا ہار میاں صاحب کے سامنے دھرا اور گویا ہوئیں۔

''آپ نے میرا ٹی وی پیک کر دیا؟'' میاں صاحب اور ان کے سیلز مین سوالیہ نظروں سے خاتون کو گھورنے لگے۔خاتون دوبارہ گویا ہوئیں،

''پلیز جلدی کریں، اس سے پہلے کہ میرا ظالم شوہر دوبارہ آ جائے آپ چھتیس انچ کا ٹی وی میری گاڑی میں رکھوائیں اور جلدی سے بقیہ رقم میرے حوالے کریں تا کہ میں جا سکوں'' خاتون کی آواز اور آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ بہت روئی ہیں۔اسکے بال بھی کچھ الجھے ہوئے تھے۔

میاں صاحب نے نازک صورت حال کے پیش نظر سیلز مینوں کو ٹی وی پیک کر کے گاڑی میں رکھوانے کا حکم دیا اور خود جلدی جلدی کیش بکس سے پینسٹھ ہزار روپے کی بقیہ رقم پوری کرنے لگے۔ایک دوسرے سیلز مین کو میاں صاحب نے پچاس ہزار روپے کی رسید اور گارنٹی کارڈ بنانے کے لیے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔انہوں نے جلدی سے رقم گن کر خاتون کے حوالے کی، جو اس نے ٹی وی کی رسید اور گارنٹی کارڈ سمیت جلدی سے بغیر گنے اپنے پرس میں ٹھونسی اور میاں صاحب کا شکریہ ادا کر کے جس تیزی سے آئی تھی اسی تیزی سے شوروم سے نکل کر اپنی گاڑی میں جا بیٹھی۔خاتون نے پچاس کا ایک نوٹ گاڑی میں ٹی وی رکھ کر جانے والے دو سیلز مینوں کی طرف بڑھایا اور فشوں ہو گئی۔خاتون کے تیزی سے آنے اور کارروائی کر کے واپس جانے میں بمشکل دس منٹ لگے تھے۔

''جناب! بالآخر آج کی عورت اپنے مرد سے جیت گئی۔اس خاتون نے خاوند کے منع کرنے کے باوجود ہار بیچ کر بڑا ٹی وی خرید لیا تا کہ اپنی مال دار سہیلیوں کے سامنے اپنی ناک اُونچی کر سکے۔۔۔'' میاں صاف کے لہجے میں ایک خاوند کی ہار سے زیادہ اپنی پچاس ہزار کی سیل کا نشہ صاحب جھلک رہا تھا۔انہوں نے سیلز مین ندیم کو ہار اور تخمینے والی چٹ دیتے ہوئے کہا کہ جاؤ جا کر جیولر سے ایک لاکھ پچیس ہزار روپے گن کر لے آؤ۔تیسرے کو چائے کا آرڈر دیا تا کہ وہ ان بزرگوں کے ساتھ حالات حاضرہ پر بے لاگ تبصروں کا ٹوٹا سلسلہ پھر سے جوڑ سکیں۔جیولر کے ہاں سے ندیم دوسرے ہی لمحے کھوٹے سکے کی مانند پلٹ آیا۔

''میاں جی! جیولر کہتا ہے وہ پہلے والا ہار لاؤ یہ تو نقلی ہے'' سیلز مین کہہ رہا تھا۔

اور میاں صاحب کی موٹی آنکھیں اپنے حلقوں سے نکل کر مزید باہر کو آ گئی تھیں۔

''اوئے۔۔۔۔۔کیا بکتا ہے؟'' ان کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔مگر وہ اس لمحے یہ فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ اس جنگ میں خاوند ہارا یا بیوی؟ یا پھر نقلی ہار نے ان کی ہار پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی؟

بقیہ: عیدملن پارٹی

رہنے کی تاکید کرتے ہوئے کھانا لگنے کی خوشخبری کے ساتھ مخمور آواز میں ایک اور خوشخبری بھی سناتا ہے۔''بھائیوں اور دوستو اللہ جانتا ہے کہ ہم سب تجارت کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں۔گھبرانے کوئی بات نہیں' اگر اس سال ہمارے کچھ بھائی بندوں کو منافع میں گھاٹا ہوا ہے تو میرے سوہنے رب نے سیلاب کی صورت میں اُس نقصان کی تلافی کا سامان بھی پیدا کر دیا ہے۔ہمت اور حوصلے سے کام لیں خدا نے چاہا تو ایک ہی ہلّے میں سارے نقصان اور خسارے دُور ہو جائیں گے۔''(انشاءاللہ' انشاءاللہ۔ہم آواز ہو کر)

ہمیں افسوس ہے کہ اس بڑے اور عالیشان گھر کی نہایت بڑی اور شاندار ضیافت کا احوال اس سے آگے سنانا ہمارے بس میں نہیں۔ہمیں اعتراف ہے کہ ہم کمزور دل' کمزور دماغ اور کمزور اعصاب کے مالک انسان ہیں۔کسی بھی انوکھی یا انہونی صورت حال میں خود پر قابو رکھنا ہمارے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔

اُس روز بڑے اور عالیشان گھر کی نہایت بڑی اور شاندار ضیافت میں کھانا لگتے ہی ہماری آنکھوں کے سامنے تارے جھلملانے لگے اور ہمیں کھانے کی میز پر رنگ برنگے خوشبودار کھانوں کے بجائے بے شمار نہتے' مجبور' بے بس و لاچار انسان رسیوں' زنجیروں' ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑے ڈائننگ ٹیبل پر تڑپتے بلکتے' آہ و بکا کرتے نظر آئے تو اُن کی جانب بڑھتے ہوئے خونخوار بھیڑیوں اور گِدھوں کو روکنے کی خود میں سکت نہ پا کر ہم اوسان گنوا بیٹھے۔اُس کے بعد وہی ہوا' جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے.....!!!

بارودی جیکٹ

فرخندہ شمیم (راولپنڈی)

بس حسبِ معمول رواں تھی۔ سڑکیں ہر روز اس کے کھٹور ٹائروں کی رگڑ سہہ سہہ کر اب ایسے ہی خاموش ہو گئی تھیں جیسے بااثر وڈیروں کے حرم میں لڑکیاں چپ ہو جاتی ہیں۔ وہ ایک آفس کی بس تھی جو ہر روز آفس کے ملازمین کو مقررہ سٹاپ سے پک کرتی اور آفس کے بڑے گیٹ پر ڈراپ کرتی تھی۔ پے در پے بم دھماکوں کی وجہ سے سیکورٹی کی پرخطر صورت حال کے باعث دفتر کا بڑا گیٹ بند کر دیا گیا تھا اور آفس کے ذرا پیچھے ایک نسبتاً تنگ اور غیر معروف جگہ پر بس ہر روز اپنا سفر مکمل کرتی تھی۔ ملازمین کو تھوڑا سا پیدل چل کر دفتر کے مرکزی گیٹ تک پہنچنا ہوتا تھا اور پیدل چلنے کے اسی راستے میں اگر کوئی خوشگوار بات تھی تو اتنی سی کہ مرد اور خواتین ایک چھوٹے سے ٹریک پر ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ چھوٹا ٹریک بعض کے لیے مجبوری اور بعض کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ تھا۔ نئی نئی پرفیومز اور کوکونز فضا کو شرابی سا کرتے اور نوجوان لڑکوں سے زیادہ ادھیڑ عمر کے مرد اُس مہک کے پیچھے پاگلوں کی طرح بھاگنے لگتے اور تنگ راستے پر کئی بار ان کے لمبے لمبے بازو خواتین کے دوپٹوں سے مَس ہو جاتے اور وہ اِسی کامیابی کو فتحِ مبین سمجھ لیتے۔ یوں تو ناصر بھی کچھ ایسے ہی ارمانوں سے گندھا نوجوان تھا لیکن اس کی پسند ہر کوئی نہیں' سر سے پاؤں تک پردے میں لپٹی زویا تھی۔ سیاہ برقعہ جس کی پہچان تھا۔ آفس کی کوئی سرکاری تقریب ہوتی یا نجی۔۔۔۔ زویا اُسی کالے برقعے میں اٹی نظر آتی۔ البتہ اس کا کھُلا چہرہ بے حد معصوم سا ہوتا تھا اور آنکھیں حیا کے بار سے جھکی رہتی تھیں۔ آفس میں اس کی بڑی عزت تھی۔ وہ دفتر کے استقبالیہ کاؤنٹر پر بیٹھتی تھی۔ ملاقاتیوں کا تاثر یہ تھا کہ وہ آنے والوں کے لیے استقبال کی ہر ادا سے آشنا ہو گی لیکن زویا ذاتی نہیں صرف سرکاری استقبال سے آشنا تھی جس کی اُسے تنخواہ اور عزت ملتی تھی۔ ناصر اسے اکثر چھپی چھپی نظروں سے دیکھا کرتا اور داد دیتا رہتا تھا۔ زندگی میں اس کی ایک ہی بڑی خواہش تھی' زویا کے ساتھ اس کا کوئی تعلق بن جائے ویسے وہ پہلے سے شادی شدہ بھی تھا۔ کئی مہینوں سے وہ بہانے بہانے استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف جا رہا تھا کہیں زویا سے گفتگو کا کوئی موقع مل جائے شاید کبھی وہ اس کا حال احوال ہی پوچھ لے' اتنا پرانا کولیگ تھا ناصر اس کا۔۔۔۔ برسوں سے بس میں اس کا ہم سفر بھی تھا۔ لیکن وہ تو جیسے صرف سرکاری ڈیوٹی ہی ادا کرتی تھی اس روز بھی اس نے نظر اٹھا کر یہ تک نہیں دیکھا کہ ناصر استقبالیہ لاؤنج میں پڑے صوفے پر کب سے بیٹھا بظاہر کسی VISITOR کا انتظار کر رہا ہے لیکن چوری چوری اُسی کو دیکھ رہا ہے۔ اس دن اگر چیف سیکورٹی آفیسر' جو وزارتِ داخلہ سے آئے تھے' معمول کے معائنے پر دفتر میں موجود نہ ہوتے تو زویا کو تو اپنے کاؤنٹر کے علاوہ دوسرے ماحول کا پتہ ہی نہ چلتا۔ شہر میں پچھلے دنوں پے در پے ہونے والے بم دھماکوں نے سیکورٹی کا ہائی الرٹ کر دیا تھا اور سیکورٹی پلان سے متعلقہ آفیسرز ریڈ زون ایریا میں اکثر چکر لگاتے رہتے تھے۔ زویا کا آفس بھی ایک حساس علاقے کی حد میں واقع تھا۔

یہ صاحب کون ہیں؟ سیکورٹی آفیسر نے کاؤنٹر پر پہنچتے ہی کرخت لہجے میں زویا سے دریافت کیا۔ اس کا اشارہ ناصر کی طرف تھا۔

''یہ ہمارے ایمپلائی ہیں سر''۔ زویا نے پہلی بار ناصر کو مجموعی طور پر دیکھا تھا۔

کب سے؟ دوسرے آفیسر نے پوچھا۔

دس بارہ سال سے! زویا اتنا تو جانتی ہی تھی۔

کس سیکشن میں ہیں؟

ایڈمنسٹریشن میں۔

کیسا بندہ ہے یہ؟ انہوں نے ناصر کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

بالکل ٹھیک سر' کبھی کوئی شکایت نہیں سنی' زویا نے متانت سے کہا۔ وہ حیران بھی ہو رہی تھی' چیف سیکورٹی ناصر کے بارے میں یہ معلومات کیوں لے رہا تھا۔

''پھر بھی سر'' دوسرے سیکورٹی آفیسر نے آہستہ سے کہا۔

آپ اس شخص کی باڈی لینگویج اور دونوں ہاتھوں کے انگوٹھوں پر چیک رکھیں' یہ نارمل نظر نہیں آتا۔

دونوں واپس مڑ گئے۔ ان کا رُخ ناصر کی طرف تھا۔

یونیفارم میں ملبوس دو چاق و چوبند پولیس آفیسرز کو دیکھ کر ناصر ادب سے کھڑا ہو گیا۔

آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ ڈیوٹی Place پر کیوں نہیں ہیں؟ پیشہ ورانہ انداز میں آفیسر نے پوچھا۔

اپنے دوست کا انتظار کر رہا ہوں۔ سَر مجھے چیک اپ کے لیے ہسپتال جانا ہے'' ناصر نے شستہ لہجے میں کہا''۔

کیا ہوا ہے آپ کو؟

''دل کا مریض ہوں'' اس نے زویا کی طرف غیر محسوس انداز میں دیکھتے ہوئے کہا۔

دونوں آفیسرز نے دیکھا وہ تو کوئی عشق کا مارا لگتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی ویرانی اور چہرے پر پیار نہ پا سکنے کی ناکامی لکھی ہوئی تھی وہ دونوں واپس چلے گئے۔ زویا کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور وہ دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔

پھر اچانک اگلے پندرہ روز بڑی وحشت کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔ شہر میں اوپر تلے دو دھماکوں نے زندگی پر سے بھروسہ گنوا دیا تھا۔ متعدد افراد لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ ہر طرف دہشت گردی کا موضوع زیرِ بحث تھا۔ آفس بس میں بھی ان دنوں بارود کلچر پر ہی باتیں ہو رہی تھیں۔

آخر دھماکہ خیز مواد اتنا عام کیسے ہو گیا ہے جی؟ پہلے تو جان لیوا ہتھیار صرف حکومتوں کے پاس ہوتے تھے اب تو عام آدمی کے ہاتھ میں بھی آ گئے ہیں۔ یہ دیکھو ناں ایک نئی بلا..... بارودی جیکٹ!!

ایسا لگتا ہے دکانوں پر دال چاول کی بجائے بارودی جیکٹس بکتی ہیں۔ کسی بھی دکان میں جاؤ اور مہنگا آٹا خریدنے کی بجائے سستی قیمت پر بارودی جیکٹ خرید لو۔۔۔۔ توبہ توبہ لگتا ہے ہماری آنے والی نسلیں نصاب میں بارودی جیکٹوں کی

اہمیت کے بارے میں ہی پڑھا کریں گی۔کیسا برا وقت آ گیا ہے۔اللہ توبہ!!

بس میں سب ہی لوگ موت سے اٹے ان واقعات سے خوف زدہ تھے۔البتہ ناصر کو اس گفتگو سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔زویا کی نشست بس اس کے حصار میں رہتی تھی اور جس روز کہیں زویا نہ آ پاتی وہ سفر سے ہی دست بردار ہو جاتا اور درمیان کے کسی سٹاپ پر بے مقصد اتر جاتا تھا۔کوئی بھی اس فیصلے کی وجہ نہ جان سکا کیونکہ ناصر کی کوئی حرکت اور کوئی ادا سماجی میل جول سے بھی لگا نہیں کھاتی تھی۔۔۔۔وہ کسی سے کلام نہیں کرتا تھا' اس کے قریبی لوگ صرف اتنا بتاتے تھے کہ وہ ذہنی طور پر اپ سیٹ ہے لیکن اس کی پیشہ وارانہ رپورٹ پر اس بیماری کا کوئی داغ نہیں لگا تھا۔کسی ساتھی کارکن نے یہ کھوج لگانا ضروری نہیں سمجھا کہ آخر وہ ذہنی بے چینی کیا ہے؟ شاید ناصر کوئی بھی قابلِ ذکر شخص نہیں تھا۔

بعد کے پچیس دن ناصر دفتر نہیں آیا۔تو کسی نے بھولے سے بھی نوٹ نہیں کیا۔سارے کولیگ روز کی طرح خاموشی سے سفر کرتے رہے' زویا بھی حسبِ معمول سیاہ برقعے میں لپٹی روز دفتر آتی رہی لیکن ایک دن اچانک ناصر بس میں دوبارہ نظر آ گیا۔ایک دو لوگوں نے محسوس کیا وہ پہلے سے زیادہ کمزور اور زرد نظر آ رہا تھا۔اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور جسم ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا۔اس نے پوری بس پر ایک طائرانہ نظر ڈالی لیکن زویا پر تو جیسے ٹک گیا۔اچانک پوری بس میں اس کی غیر متوقع آواز گونجی۔وہ اپنی سیٹ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

''آپ سب لوگ سن لیں آج میرے پاس ایک بم ہے''

کیا؟؟ تمام مسافروں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ دیکھو یہ جیکٹ'' اس نے اپنی قمیض الٹ دی۔

لوگوں کی چیخیں نکلتے نکلتے رہ گئیں۔اف بارود کی جیکٹ۔۔۔۔جو وہ ہر روز ٹیلی وژن سکرین اور اخبارات میں دیکھ رہے تھے۔۔۔۔لوگوں کے دل اچھل کر حلق میں آ گئے۔خواتین ایک دوسرے سے چپک گئیں۔زویا کا دل بری طرح لرزنے لگا۔اس نے اپنی سہمی نظریں بے اختیار ناصر کے چہرے پر گاڑ دیں' جو قبر کی طرح ساکت تھا۔ایک لمحے کے لیے ڈرائیور کو خیال آیا۔۔۔۔وہ گاڑی سے کود جائے اور بھاگ کھڑا ہو کم از کم وہ تو بچ جائے گا۔۔۔۔لیکن ناصر اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ڈرائیور کا ارادہ شاید اس نے پڑھ لیا تھا۔

خبردار۔۔۔۔کوئی شخص اپنی سیٹ سے نہ ہلے۔مجھے تو مرنا ہی ہے کیونکہ مجھے اپنی زندگی سے پیار نہیں۔اس نے دکھ بھرے انداز میں کہا اور زویا کو دیکھنے لگا۔سیٹ سے چپکی زویا بری طرح کانپ گئی۔''لیکن میں آپ سب کو بھی اپنے ساتھ اڑا کر لے جانا چاہتا ہوں کیونکہ میں آپ لوگوں کے بغیر قبر میں بھی خوش نہیں رہوں گا''۔اس نے ایک بار پھر زویا کی طرف حسرت سے دیکھا۔

پوری بس پر سکتہ چھا گیا۔

''میرے پاس صرف تین منٹ ہیں'' ناصر نے اپنا ہاتھ جیکٹ پر رکھ دیا تھا۔

ایک بار مسافروں کی چیخیں نکل گئیں۔وہ ناصر کے سامنے گھگھیانے لگے۔

تم ایسا کیوں کر رہے ہو۔کیا چاہتے ہو آخر تم ناصر؟

''میں زویا کو چاہتا ہوں'' جان لیوا فقرہ بس میں گونجا۔''اگر وہ میرے ساتھ چلنے پر تیار ہو جائے تو سب کی جان بخشی ہو جائے گی'' اس نے دو ٹوک انداز میں کہا اور دوسرے ہی لمحے میکانکی انداز میں ہر نگاہ معصوم' شریف اور نیک زویا پر جا اٹکی جو خوف اور دہشت کے مارے سوکھے پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔برقعے کے اندر اس کا دل ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔اس نے رحم کی ایک نظر اپنے ہم سفروں پر ڈالی لیکن زیادہ زندہ رہنے کی خواہش کتنی خود غرض ہوتی ہے' زویا نے اپنی کولیگس کی آنکھوں میں دیکھ لیا تھا۔

اب آپ کے پاس صرف دو منٹ اور ہیں؟

اچانک ناصر بے رحمی سے چیخا۔خوف کی سرد لہر ہر مسافر کی ریڑھ کی ہڈی میں سرایت کر گئی تھی۔

''زو۔۔۔۔زو۔۔۔۔یا'' گھگھیائی ہوئی آواز میں زویا کے دو ہم دفتر منمنائے۔زویا نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔وہ جو استقبالیہ کاونٹر پر اس کے ساتھ بدتمیزی کر چکے تھے۔

پلیز۔۔۔۔زویا۔۔۔۔ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے بے آسرا ہو جائیں گے۔تمہارے علاوہ کوئی سہارا نہیں ہے۔۔۔۔زویا ہماری مدد کرو۔

ہم مجبور ہیں زویا۔بہت مجبور۔سفید داڑھی والے ایک سینئر کولیگ نے زویا کے پاؤں پکڑ لیے۔تو اس نے گھبرا کر اپنا وجود سمیٹ لیا۔

زویا۔۔۔۔مہربانی کرو۔۔۔۔ورنہ ہم سب مارے جائیں گے۔

لڑکیاں زویا کے سامنے ہاتھ باندھنے لگیں۔زویا پوری جان سے کانپ گئی۔وہ بھی زندہ رہنا چاہتی تھی ان سب کی طرح۔مدد کی ایک اور نظر اس نے بس پر ڈالی۔وہاں کوئی اس کا نہیں تھا۔کسی بھی مرد کو زویا میں اپنی بیٹی کی آبرو اور کسی بھی بیٹی کو اس میں اپنی عفت کا عکس نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ سب جینا چاہتے تھے اور یہ زندگی صرف زویا کی حرمت جانے سے مشروط تھی۔

کیا ہم اکٹھے مر نہیں سکتے؟ زویا کی آنکھوں کے کنارے بھیگے ہوئے تھے۔

یہ شخص تمہاری وجہ سے ہم سب کو مارنا چاہتا ہے۔تمہاری زندگی اِسے اپنا لے تو سب کی موت ٹل سکتی ہے۔زویا کی صحرا آنکھیں پھیل گئیں۔ساون کی ہر بوند نے اس سے منہ موڑ لیا تھا۔

اس نے آخری مرتبہ بس کے مکینوں کو رحم طلب نظروں سے ناپا اور سب کو چہرہ چھپاتا دیکھ کر اپنا برقعہ گھسیٹتی نیچے اتر گئی۔ناصر اس کے پیچھے اتر گیا تھا۔

اگلے روز بس میں نئی زندگی کا جشن منانے والا ایک شخص کہہ رہا تھا۔

''معلوم ہے دونوں کا ایک عرصے سے چکر چل رہا تھا؟''

''جھوٹن''

ڈاکٹرعمران مشتاق (رگبی،یوکے)

کب بیج پڑا۔کونپل پھُوٹی۔پودے نے سر اُٹھایا۔چاہت کے ہلکوروں میں، پیار کی خُوشبو سے سینچا گیا تو محبت کی مظبوط جڑوں نے اِک تنومند درخت اُسکے اندر کھڑا کر دیا،تو وہ خُود سرو قد ہوگئی۔آنکھوں میں ڈورے تیرنے لگے اور جسم آپ ہی آپ نشے سے ٹُوٹنے لگا۔

''کیا یہی پیار ہے؟''اِک ترنگ نے سوال کھڑا کیا۔

''پگلی جانتی تو ہے پھر کاہے کو پوچھتی ہے؟ کیا اب تک یقین کی منزل نہیں آئی؟''

''اِک دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔دل اِک انجانی پریشانی سے کانپتا رہتا ہے۔کُچھ ہو نہ جائے،بس اِس احساس سے راتوں کو نیند روٹھنے لگتی ہے۔''

''محبوب کے ملنے اور پھر بچھڑنے کا ڈر کنواریوں کو سہائے رکھتا ہے۔جب تک قانون اور مذہب اجازت نہ دے،خُود کو سنبھال کے رکھ۔وہ تیرے آنچل سے بندھا بندھا پھرے گا۔''

''میں تو اپنا آپ اُسکی محبت پہ وار چکی ہوں۔''وہ خُود سے بدن چُرانے لگی۔

''تو بس اب وقت کا اِنتظار کر۔وہ خُود ہی فیصلہ کر دے گا۔''بڑی ہی بے رُخی اور بے مہری سے،اُسکے اندر کوئی چلایا تھا۔دل تھا کہ تھم تھم کے چلتے ہوئے بند ہونے کو تیار۔

''اب کیا ہو گا؟ یہ میں نے کیا کیا؟''دِل بے طرح گھبرانے لگا۔''اگر اُس نے دھوکا کیا تو پھر۔۔۔۔''یہاں پہ آ کے اُس کی سوچوں کے پر جلنے لگتے تھے۔

''لیکن وہ دھوکا آخر کیوں کرے گا؟''دِل نے سنبھلنے کو مہلت چاہی۔

''کیوں اِس میں بھلا کیسی دِقت۔تولہ بھر زبان ہی کو تو تکلیف دینا پڑتی ہے۔اور کون جانے وہ تکلیف کے نام پہ مُسرت حاصل کرنے کا اِک بہانہ ہی ہو۔''مہلت ملنے کی رعایت شاید اُس کا نصیب نہ تھا،تبھی تو دِل معصوم فاختہ کی مانند ہو کر رہ گیا تھا۔وسوسے اور واہمے جب ڈرانے لگے تو اُس کے آس پاس کا سناٹا،خاموشی میں ڈھلنے لگا۔

اگر وقت ہی فیصلوں پہ قادر ہے تو وقت کا فیصلہ سامنے آنے میں دیر نہ لگی۔جسے وہ محبت سمجھ بیٹھی تھی وہ تو بھنورے کی وقتی لذت حاصل کرنے کا بہانہ تھا۔دھچکا گہرا تو تھا۔اُسکا محبوب اور اِک بھنورا۔شہد لوٹ کے چل دینے والا اِک مسافر کہ پھول راہ میں اور بھی تھے۔اُسے یقین ہی نہ آیا۔کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ اگر ایسا ہی ہوا تھا تو اتنی جلدی کیسے؟ ابھی تو اُس میں بڑا رس تھا۔شہد کا پیالہ تو لبالب تھا۔بات شاید نئے اور پرانے کی تھی۔باسی اور تازہ کا فرق سامنے رکھا گیا تھا یا پھر کُچھ اور تھا۔

کُچھ بھی تھا،دل و جاں پہ اختیار کھونے کی گھڑی قریب تھی کہ اِک اور گہری چوٹ نے اُسے تلملا کر رکھ دیا۔اُسکا محبوب ہی نہیں بلکہ اُسکی عزیز ترین سہیلی بھی کھیل میں شامل تھی۔یہ جانکاری جان لیوا ثابت ہوئی کہ وہ خُود تو دیر سے اِسکا حصہ بنی تھی۔یعنی 'جُھوٹن' ہی اُسکے نصیب میں لکھی تھی۔بچپن سے نہ تو اُس نے کبھی کسی کی جُھوٹن کھائی تھی اور نہ ہی اُترن پہنی تھی۔

یوں تو کہنے کو دھوکا اپنے ہی دیتے ہیں کہ غیر جو کرتے اور کہتے ہیں وہ اور معاملہ ہوتا ہے۔اب کوئی اگر آنکھیں کُھلی نہ رکھے اور بس صُمٌ بُکمٌ بنا رہے تو پھر دوش دینے کا اِختیار کھو دیتا ہے۔جب دو عزیز ترین ساتھیوں نے اُس سے چُھپ کے وہ ''کھیل'' کھیلا تو وہ کس کا گلا پکڑتی۔سہیلی کو مُوردِ الزام ٹھہراتی یا اُس عاشق سے گِلا کرتی جو اُس کے حُسن کی شان میں شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی قصیدے کہنے سے نہ چُوکتا۔ایسی ایسی باتیں اور لن ترانیاں کہ ہر دم اُسے آئینے کی یاد ستانے لگتی۔

''تم میری آنکھوں میں جھانک لیا کرو۔کسی اور آئینے کی احتیاج ہی نہ رہے گی۔''وہ کہتا اور وہ اُس کے کہے پہ یوں ایمان لے آتی جیسے وہ کوئی مقدس الفاظ ہوں۔دِل کی سرزمیں پہ اُترتے پوتر صحیفے۔اُس کا اِلتفات جب کم کم ہونے لگا۔آئینے دُھندلانے لگے اور صحیفے جب کورے ورق بنے تو اُس نے جانا کہ اُس کے بدن کے کورے ورق پہ انمٹ سیاہ رنگ کی سیاہی بکھیرنے والا،اپنا قلم لے کر آگے بڑھنے کو ہے۔بھنورے نے ایک اور پھول کی جانب اُڑان بھرنے کے لئے جست لگائی ہی تھی اور اِس سے پہلے کہ اب بھنورا اُس پھول پہ جا ہی بیٹھتا،اُس نے بھنورے کی اُڑان ہی ختم کر ڈالی۔وہ چُھری جو اُسکے ہاتھوں میں بھنڈی توری پہ چلتے ہوئے بھی کانپ کانپ جاتی تھی وہ اتنی تیزی سے چلی تھی۔اُٹھی تھی۔گری تھی اور اُٹھ اُٹھ کے گری تھی کہ وہ حیرت کا شِکار صرف اپنے لہولُہان گلتے جسم کا آپ نظارہ ہی کر سکا تھا۔اُسے اپنے فیصلے پہ ہرگز پچھتاوا نہ تھا۔نسوانیت زخم خوردہ ہوئی تو ہوئی پر وہ کسی اور کی جُھوٹن کھائے؟ یہ بات ناقابلِ برداشت تھی۔بھنورا تو اپنے ہی لہو میں رنگا،کسی کے اعجازِ مسیحائی کا مُنتظر ہوا اور وہ خُود قانون کے سامنے کھڑی،اپنی قسمت کا فیصلہ سُننے کے لئے تیار کہ فیصلہ کرنے والے ہاتھوں میں ایک ایسی میزان ہوتی ہے،جس کا ایک پلڑا جُھکتا ہے تو زندگی زندگی نہیں رہتی۔زمیں پہ بھی جہنم کا نمونہ دکھا دیتی ہے۔جیل جانا ایسا ہی تو تھا۔

جیل پہنچنے کے بعد کے مناظر اُس نے صرف کہانیوں میں ہی پڑھے تھے۔اب جانا کہ کہانیاں بھی سچی ہوتی ہیں۔لکھنے والے اِسی دُنیا کے باسی ہوتے ہیں۔وہ آسمان سے قلابے نہیں ملاتے بلکہ زمین کی کڑوی حقیقتوں کو فسانے کا رنگ دے کر فیصلہ قاری کی ذہانت پہ چھوڑ دیتے ہیں۔وہ تو شروع سے ہی بے حد ذہین تھی۔

باقی: صفحہ ۹۴ پر ملاحظہ فرمائیں

عید ملن پارٹی

گلزار جاوید

(راولپنڈی)

اس وقت ہم شہر کی تازہ تازہ وجود میں آنے والی پوش آبادی کے ایک بڑے اور عالیشان گھر کے باہر کھڑے ہیں۔اس گھر کے بارے ہمارا تجسس واشتیاق ہمیشہ ہمیں مہمیز دیتا رہا ہے۔کبھی اس کا وسیع وعریض رقبہ جو بہت سے گلی کُوچوں اور محلّوں کی نسبت بڑا اور وسیع ہونے کے باعث اپنی جانب متوجہ کرتا ہے' کبھی اس کا کشادہ اور سرسبز لان اور اُس پر اُگی مخملی گھاس' گھاس پر اُگے رنگ برنگے قیمتی وخوشنما پھول اپنی اُور کھینچتے ہیں' کبھی اس گھر کا جدید ڈیزائن اور اُس میں استعمال ہونے والا بیش قیمت خام مال دعوتِ نظارہ دیتا ہے اور کبھی اس کے پورچ میں کھڑی بڑے سائز کی ایک سے زائد امپورٹڈ گاڑیاں حیرانی میں مبتلا کرتی ہیں۔

مگر ٹھہریئے! اس ایک گھر پر کیا موقوف' ہمیں تو اس آبادی کے اکثر وبیشتر محل نما گھروں اور اُن میں بسنے والی باہنر مخلوق کی بابت کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ جاننے اور جانچنے کا خبط رہا ہے۔اگر ہم آپ کو اپنے دل میں چھپی خواہش کے بارے سچ سچ بتا دیں تو آپ حیران ہونگے کہ ہم اس آبادی کے عالیشان گھروں کے علاوہ اس شہر بلکہ تمام شہروں کی ایسی آبادیوں اور اُن میں راتوں رات اُگنے والے بیش قیمت فلک بوس گھروں اور عمارتوں کی بابت ہمارا تجسس اور اشتیاق ہمیشہ ہمیں بیکل وبے چین کیا کرتا ہے۔یہ بے چینی اور بے کلی اکثر ہماری ذلّت ورسوائی پر بھی منتج ہوا کرتی ہے۔

یہ بڑا اور عالیشان گھر اس آبادی کے دیگر گھروں سے انفرادیت کا حامل یوں بھی ہے کہ اس گھر میں آنے جانے والوں کا اکثر تانتا بندھا رہتا ہے۔ان میں تاجر' دکاندار' دینی وسماجی مرتبے کے حامل لوگوں کے علاوہ چھوٹے بڑے درجے کے سرکاری اہل کار اور بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے سیاستدانوں کی کثرت کے ساتھ حاجت مندوں کی بہتات بھی نمایاں ہوا کرتی ہے۔اس گھر کے مالک کا تن وتوش ہی توانا نہیں دل بھی فراخ ہے۔جس کا ثبوت روزمرّہ کے علاوہ عید' بقرعید' حج وعمرہ کے اہم مواقعوں کے ساتھ رمضان المبارک کے بابرکت ایّام میں صدقہ وخیرات کی فیاضی سے تقسیم فراہم کررہی ہے۔

آج کا اجتماع اس گھر کا پہلا اجتماع نہیں ہے۔اس گھر میں اکثر وبیشتر ہفتہ وار' مہینہ وار اور سالانہ اجلاس کے علاوہ بھی اکثر دعوتوں اور محافل کا انعقاد ہوا کرتا ہے۔آج کا اجتماع رمضان المبارک کی خیریت کے ساتھ رخصتی اور عیدالفطر کے مبارک موقع کی مناسبت سے مرکزی صدر انجمن تاجران یعنی اس عالیشان گھر کے مالک نے تمام ذیلی انجمنوں کے صدور کے اعزاز میں منعقد کی ہے۔

عرصے سے ہماری خواہش اس بڑے اور عالیشان گھر کو اندر سے دیکھنے اور اس میں برپا بڑی اور شاندار محافل کا احوال رقم کرنے کی تھی۔بار بار کی ناکامیوں کے بعد ایسا وقت بھی ہم پہ گذرا ہے کہ ہم اپنی خواہش کی تکمیل کے حوالے سے قطعی ناامید ہو چکے تھے۔ہماری کیفیت اُس ناکام ونامراد عاشق کی طرح ہو چکی تھی جو ہر روز دیدارِ یار کی حسرت لیے کوئے یار کا طواف کرتا اور ہر روز ناکامی کا داغ سہہ کر لوٹا کرتا۔بقول شاعر:

لطف وہ عشق میں پائے ہیں کہ جی جانتا ہے
رنج بھی اتنے اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے

اب آپ سے ہماری ایک بنتی بلکہ درخواست ہے کہ آپ ہم سے ہرگز یہ دریافت نہ کیجیے گا کہ ہم آج اس بڑے اور عالیشان گھر کی بڑی اور شاندار ضیافت میں شرکت کے حقدار کیونکر ٹھہرے اور کس طور اس بڑی اور شاندار ضیافت کا احوال آپ کے لیے رقم کرنے میں کامیاب ہوئے۔

غالباً یہ بیس بائی تیس یا تیس بائی چالیس کا ہال نما کمرہ ڈرائنگ روم جمع ڈائننگ ہال پر مشتمل ہے۔ڈائننگ کو ڈرائنگ روم سے الگ کرنے کے لیے ہرے' نیلے' پیلے اور سنہرے رنگ کی باریک ڈوریوں کے درمیان لال رنگ کی ریشمی ڈوری سے آراستہ چلمن ڈال کر الگ کیا گیا ہے۔اس چلمن کے درمیان سے گزرنے کے لیے جب بھی اس کو حرکت دیں گے تو چلمن کے اندر سے نقرئی گھنٹیاں بجنا شروع ہو جائیں گی۔قیمتی لکڑی کے نقشین پائے اور پھول دار شیشے کی ٹاپ والی کھانے کی بیضوی میز کے گرد ایک درجن یا اس سے زائد منقّش پائے اور نرم فوم والی قیمتی کُرسیاں آراستہ کی گئی تھیں۔کھانے کے کمرے کو گھر کے اندرونی حصّے سے الگ کرنے والی دیوار کے ساتھ قدِ آدم شیشے کی الماری قیمتی لکڑی کے منقّش فریم کے ساتھ مستقل طور پر دیوار میں آویزاں کر کے اُس کے جہازی سائز کے خانوں میں اعلیٰ درجے کی کراکری اور کراکری کے درمیان رنگ برنگ سامانِ آرائش بھی سجایا گیا تھا۔

ڈرائنگ روم کی سامنے والی دیوار پر ایک بزرگ سر پر صافہ ہاتھ میں چھڑی اور جسم پر گہرے رنگ کی شلوار قمیض کے ساتھ پرانے طرز کی واسکٹ پہنے سفید لمبی داڑھی اور گندمی رنگ کے ساتھ تصویر میں یوں مسکرائے بیٹھے تھے جیسے آپ کی نامناسب حرکت پر محظوظ ہوتے ہوں۔غالباً یہ صاحبِ خانہ کے والد یا دادا کی تصویر ہونی چاہیے۔دائیں ہاتھ کے کونے میں درمیانے سائز کا ہنوط شدہ شیر اور بائیں ہاتھ کے کارنر میں زندہ مچھلیوں کا ایکورم مہمانوں کی افتادِ طبع کے لیے سجائے گئے تھے۔دونوں کونوں کے درمیان ایک سنہری میز پر بہت سارے ڈیکوریشن پیس ترتیب سے رکھے ہوئے تھے' جن میں گھوڑا تانگہ' توپ اور تلوار نمایاں تھے۔کھڑکیوں اور دروازوں پر سنہرے رنگ کے جھالردار پردے

جبکہ فرش پر سرخ رنگ کا پھول دار نرم قالین بچھا ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم کے چہار جانب مختلف رنگ کے ڈیزائن اور کشن سے آراستہ بہت سے صوفے لگے ہوئے تھے جن پر شوخ رنگ حاوی نظر آ رہا تھا۔ سینٹر ٹیبل پر قیمتی دھات کی سنہری آنکھوں والی بلّی سرخ دُم کے ساتھ سجائی گئی تھی جس کی آنکھوں میں وقفے وقفے کے ساتھ برقی قمقمے روشن ہوتے تھے۔ تمام صوفوں کے آگے منقش پائے اور شیشے کی ٹاپ والی سینٹر ٹیبلز سجائی گئی تھیں۔ ہر ٹیبل کے اوپر شیشے کی بنی قیمتی ایش ٹرے کے علاوہ طرح طرح کے مشروبات' ڈرائی اور تازہ فروٹ سے بھری طشتریاں نمایاں نظر آ رہی تھیں۔

مہمانوں کی آمد شروع ہو چکی ہے۔ ہر آنے والے مہمان کی خواہش میزبان سے معانقہ یا مصافحہ کرنے کی ہوتی ہے مگر میزبان نہایت بے نیازی کے ساتھ چہرے پر خفیف مسکراہٹ سجائے ہر مہمان کے بڑھے ہوئے جثّے یا ہاتھوں کے جواب میں دائیں ہاتھ کی چند انگلیاں بڑھا کر بے دلی سے مصافحہ کر کے رسمی جملوں میں اُس کا حال احوال دریافت کر کے بیٹھنے کا اشارہ کرتا ہے۔ ہر مہمان کا چہرہ مہرہ' لباس' لہجہ اور سراپا بجائے خود تفصیلی بیان کا متقاضی ہے مگر طوالت کا خوف ہمیں اس بیان سے باز رہنے پر مجبور کر رہا ہے۔

جُوں جُوں مہمان اپنی جگہ سنبھال کر خوش گپیوں میں مصروف ہو رہے ہیں وُوں وُوں گھریلو ملازمین کی مستعدی بڑھتی جا رہی ہے۔ مشروب سے بھری پلاسٹک کی سفید' کالی' نارنجی بوتلوں کے ساتھ شیشے کی لال' گلابی' مٹیالی اور ارغوانی بوتلیں بھی صوفوں کے سامنے رکھی میزوں پر سجا دی گئی ہیں۔ مشروبات کی سپلائی کے بعد ماکولات کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ بڑی بڑی جدید طشتریوں میں فرائی مچھلی' روسٹ مرغ' چپس' پکوڑے' دال موٹ اور کئی طرح کے نمکین پکوان ٹرالی میں لاد کر لائے جا رہے ہیں۔

ایک مستعد ملازم جو خالی ٹرے لے کر واپسی کے لیے مڑنا چاہتا ہے مالک کی آواز پر دوڑ کر مؤدب کھڑا ہو جاتا ہے۔ مالک کی جانب سے اشاروں میں سمجھائی ہدایت کے جواب میں مستعد ملازم' ڈرائنگ روم کے پردے برابر کر کے باہر کی جانب دوڑ لگاتا ہے۔ جس پھرتی سے ملازم باہر جاتا ہے اُسی پھرتی سے واپس ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے دونوں ہاتھ ہلا کر مالک کو حکم کی تعمیل سے مطلع کرتا ہے جس کے جواب میں مالک ہاتھ کی جنبش سے دوسری ہدایت دیتا ہے۔ تمام ملازمین پھرتی سے ڈرائنگ اور ڈائننگ کو الگ کرنے والی چلمن کو درست کرتے ہوئے گھر کے اندرونی حصّے میں چلے جاتے ہیں۔ وقفے وقفے سے ڈائننگ کے اندر ملازمین کے چلنے پھرنے اور برتن کھڑکنے کی آوازیں مسلسل سنائی دیتی ہیں مگر کوئی ملازم ڈرائنگ روم کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کرتا۔

آہستہ آہستہ ڈرائنگ روم کا ماحول مچھلی بازار کا نقشہ پیش کرنے لگتا ہے۔ اونچی آواز میں بے تکلف اور ذومعنی جملوں کے درمیان بوتلوں کے کارک کھلنے اور گلاسوں کے ٹکرانے کی آوازوں کے ساتھ زبان اور دانتوں کی چپڑ چپڑ صاف سنائی دینے لگتی ہے۔ سگریٹ کا دھواں بھرنے کے باعث گھٹن کی کیفیت کے احساس سے گھر کا مالک ایک ملازم کو نام لے کر آواز دیتا ہے۔ چونکہ مالک کی آواز پہلے کی نسبت خواب آلود ہو گئی ہے جس کے باعث ملازم کو سننے میں دشواری کا سامنا تھا لہٰذا گھر کا مالک ملازم کو کوستے ہوئے بڑا سا منہ کھول کر زور دار آواز لگاتا ہے جس سے اُس کی آواز کا بھدّا پن اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ ملازم کو دیکھتے ہی مالک کا پارہ چڑھ جاتا ہے۔ چند غلیظ جملوں سے ملازم کی مدارت کرتے ہوئے اُسے کھڑکیوں کے بجائے روشن دان کھولنے کی تاکید کرتا ہے۔ ملازم' مالک کے حکم کی تعمیل میں تیزی سے لپکتا ہوا اندر جاتا ہے اور چھڑی نما شے کی مدد سے روشن دان کھولنے کی تدبیر کرنے لگتا ہے۔

ڈرائنگ روم کا ماحول پہلے کی نسبت خوابیدہ اور پُرسکون ہونے لگا ہے۔ کچھ دیر قبل جو لوگ ایک دوسرے سے اونچی آواز میں براہِ راست گفتگو کر رہے تھے اب اُن کی گفتگو بے ربط اور لہجہ دھیما ہو چکا ہے۔ میزوں پر سجی نعمتوں سے ناانصافی کے خوف نے اُنہیں بولنے کے بجائے سننے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب زیادہ تر گفتگو ہاتھ' منہ' آنکھ' ناک کے علاوہ اشاروں اور ہُوں ہاں میں ہو رہی ہے۔ کبھی کبھی کھانسنے' کھنکارنے' چھینکنے' ڈکارنے کے باعث ماحول میں بے تکلفی بھی در آتی ہے۔ ایک دوسرے پر لطائف اچھالنے اور پھبتی کسنے کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا ہے۔

''میں نے کہا پیر جی خیریت تو ہے' آپ ہمارا ساتھ اُس طرح نہیں دے رہے جس طرح میز پر سجے سودے کا حق بنتا ہے!'' (صاحبِ خانہ کے بالمقابل قراقلی ٹوپی' بوسکی کی قمیض اور سفید شلوار کے ساتھ سنہرے تلّے والی چپل پہنے قوی جثّے کے حامل مہمان نے میزبان کو مخاطب کرتے ہوئے بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے دانتوں میں خلال کرنے کے ساتھ دائیں ہاتھ میں دبی مرغے کی ران کو پھر سے بھنبھوڑنا شروع کر دیا۔)

''بس کیا بتلاؤں شیخ جی' یہ سُسرے ڈاکٹر خود جیتے ہیں نہ دوسروں کو جینے دیتے ہیں!'' ''میرے سرکار کی خیر ہو طبیعت شبیت تو ٹھیک ہے نا آپ جناب کی!'' (میزبان کی دائیں جانب تلوار کٹ مونچھوں اور سونے کے دانت والے ادھیڑ عمر مہمان نے ترنگ سے دریافت کیا) ''او یار طبیعت کو کیا ہونا ہے! شوگر' بلڈ پریشر' ہارٹ وغیرہ تو ہماری قومی نشانیاں ہیں' جس کسی کو ان سے واسطہ نہ ہو سمجھو وہ آدمی یا تو کنگال ہے یا فارغ البال''۔

''سر جی آپ اس بار چیک کرانے باہر نہیں گئے؟'' (بائیں ہاتھ کے صوفے کی درمیانی سیٹ پر بیٹھے تہبند' کرتا اور پگڑی میں ملبوس کھچڑی داڑھی والے مہمان نے کاندھے پر پڑے رومال سے ناک صاف کرتے ہوئے سوال کیا تو سارے مہمانوں نے ناگواری سے اُس کی جانب دیکھنا شروع کر دیا۔)

''جانا تو تھا یار' عمرے سے واپسی پر پاسپورٹ بھی ویزے کے لیے بھیج دیا تھا مگر

یہ ہماری حکومت ہے نا' ایک جگہ ٹکتی ہی نہیں!''

''اجی قبلہ حکومت کی کیا مجال جو آپ کو کہیں جانے سے روکے!'' (نیلے رنگ کی دھاری دار قمیض اور ہرے رنگ کی تنگ پتلون میں ابلتے پیٹ کو سہلاتے ہوئے میزبان کی بغل میں بیٹھے مہمان نے چشمے سے باہر بنٹے گھماتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔) ''میرے پیارے میں روکنے کی بات نہیں حکومت کی پالیسیوں کی بات کر رہا ہوں جو ایک جگہ ٹکنے کا نام ہی نہیں لیتیں''۔ ''درست فرمایا' سو فیصد درست فرمایا'' (کئی لوگوں کے ایک ساتھ بولنے کے سبب آوازیں آپس میں گڈمڈ ہوگئیں۔)

''اچھی بھلی چالیس روپے کلو پک رہی تھی چینی' ہم بھی مزے میں تھے اور اوپر والے بھی خوش' پھر کیا ضرورت تھی بھلا پنگا لینے کی' ہیں جی!' (جیب سے دوائی کی شیشی نکال کر ایک گولی منہ میں ڈالتے ہوئے) اب اگر رمضان شریف کے مہینے میں اسّی روپے تک جا پہنچی ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور! اسے کہتے ہیں ہور چُوپو! یہ تو شکر ہے کہ ہم ہاتھ روک کر مارکیٹ میں چینی دے رہے ہیں ورنہ اس مبارک مہینے میں روزہ داروں کو کیک' پیسٹری' مٹھائی' پھینی' دودھ جلیبی اور شربت سپلائی کون کرتا؟ منافع منافع کا شور ڈالنے والے طلب اور رسد کو کبھی دھیان میں نہیں لاتے۔ قسم ہے پیدا کرنے والے کی پچھلے سال کی نسبت اس سال منافع میں مسلسل گھاٹا رہا ہے۔ اب ان لوگوں کو کیا معلوم کہ مارکیٹ کی ڈیمانڈ پوری کرنے کے لیے ہمیں کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ گنّا' چقندر' شکر قندی' حتیٰ کے آلو' شلجم اور گلوکوز جو بھی جیسے بھی جہاں سے بھی دستیاب ہوا' سپلائی چالو رکھی مگر روزہ داروں کو چینی کی سپلائی میں کمی نہیں آنے دی۔ اس پر بھی اگر لوگ باگ چینی کی مہنگائی اور مٹھاس کم ہونے کا گلہ کریں تو یہ ان کی ناشکری نہیں ہے بھلا!''

''میری سرکار! بالکل یہی صورت حال آٹے پر صادق آتی ہے۔'' (تہبند' کرتا' پگڑی میں ملبوس کھچڑی داڑھی والے مہمان نے لقمہ دیتے ہوئے گفتگو جاری رکھی۔) ''کم وزن' سوجی' میدہ' چوکر نکالنے کے الزام سر آنکھوں پر مگر یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ یک لخت گندم کی قیمت دُگنی کرنے سے ہمیں کتنا نقصان ہوا ہے۔ پڑوسی ملک کو جو سپلائی بند ہوئی ہے اُس سے ہمیں جس قدر خسارا اٹھانا پڑا ہے وہ کوئی نہیں جانتا۔ سمگلنگ بند ہوتی ہے تو ہوا کرے اوپر والوں کا منہ تو اُسی طرح کُھلا ہے۔ آپ کی دعا سے ہر سال ایک نئی مل لگ جاتی تھی اس رمضان میں صرف ایک کوٹھی کے پیسے نکال سکا ہوں وہ بھی سرکار کی جانب سے سستی روٹی اسکیم کی برکت اور کم قیمت آٹا سپلائی کے طفیل' ورنہ!''

''بھائی جان! آپ لوگ بار' بار سرکار' سرکار کی رٹ لگا رہے ہیں' ہمارے ملک میں سرکار نام کی شے ہے کہاں؟'' (ریشمی کُرتا' چیک دار تہبند' سر پر دو پلی ٹوپی اور پیروں میں موزوں کے بنا گرگابی چڑھائے مہمان نے غصیلے انداز میں اپنا نکتہ نظر آگے بڑھایا) ''ماڑی سے ماڑی بھینس پچاس ہزار کو پہنچ چکی ہے' چالیس سے اوپر گائے' دس سے کم کا بکرا نی ملتا' اب تم ہی بتلاؤ سرکاری ریٹ پر کون مائی کا لال گوشت بیچ سکتا ہے''۔

''قریشی صاحب، مُردہ جانور تو سستے ملتے ہیں نا!'' (صاحبِ خانہ نے اپنے ساتھ بیٹھے مہمان کو آنکھ مار کر چٹکی کاٹتے ہوئے لقمہ دیا۔) ''اب جناب یہ تو فضول کی بحث ہے۔ وہ نہ ملے تو ہم دَر دَر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو جائیں۔ پہلے آپ مجھے یہ بتلاؤ کہ مُردہ جانور میں بُرائی کیا ہے؟ دنوں یا ہفتوں پرانا جانور تھوڑی کھلاتے ہیں ہم لوگوں کو' آخر کو ہم نے بھی خدا کو جان دینی ہے۔ گھنٹہ' دو گھنٹہ بہت سے بہت چار گھنٹے کے اندر حلال کر کے بیچ ڈالتے ہیں۔'' ''اس سے انسانی صحت کو کوئی نقصان نہیں ہوتا؟'' (پگڑی اور تہبند والے بزرگ نے تشویش کا اظہار کیا۔) ''حاجی صاحب آپ تو بڑے جہاندیدہ بندے ہو آپ کو تو پتا ہونا چاہیے کہ ہم میں سے اکثر بڑے لوگ مرنے سے پہلے اپنے آنکھ' ناک' کان اور تو اور دل گردے بھی مریضوں کے نام کر جاتے ہیں' آپ کا کیا خیال ہے؟ ڈاکٹر مرنے والوں کے سرہانے کھڑا ہوتا ہے، دل گُردے نکالنے کے لیے! گھنٹے دو گھنٹے چار گھنٹے میں انسان کے دل گردے خراب نہیں ہوتے تو جانور کو اتنی دیر میں کیا نقصان پہنچ سکتا ہے؟ ویسے بھی یہ گوشت روز مرّہ کی گاہکی میں تھوڑا استعمال ہوتا ہے۔ میاں! یہ تو ہسپتالوں' یتیم خانوں اور جیلوں میں سپلائی کا مال ہے' کیا سمجھے!''

(قریشی صاحب کے بیان کے فوراً بعد سلیٹی رنگ کے سفاری سوٹ میں ملبوس مہمان نے ہاتھ نچاتے ہوئے قریشی صاحب کی طرف جملہ اچھالا۔) ''وہ جو برف گوشت اور ہوا گوشت والی باتیں ہیں وہ کیا ہیں؟'' (قریشی صاحب نے لمبا سانس لے کر جبڑے میں دبی پان کی گلوری کو اسٹرے میں اُگلتے ہوئے) ''خدا جھوٹ نہ بلوائے' کچھ بھائی بند یہ کام بھی کر رہے ہیں' آخر کو ان کے بھی چھوٹے چھوٹے بچے ہیں' ان بچوں کی مُنھی مُنھی' معصوم معصوم خواہشیں ہیں۔ اب اگر پورا تول کر گزارا نہیں ہوگا تو مرتا کیا نہ کرتا کہ مطابق کچھ تو کرنا پڑتا ہے۔ ویسے آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں (آنکھ دباتے ہوئے) فائدہ اس میں بھی گاہک کا ہی ہے۔ میاں! گوشت انسان کو جتنا نقصان پہنچاتا ہے اتنا اور کوئی خوراک نہیں پہنچاتی۔ آدمی جتنا کم کھائے اُتنا اُس کے لیے بہتر ہے۔''

''قریشی صاحب سارے بیان میں آپ ہمارا ذکر کیوں بھول گئے؟ آپ کو تو ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے بلکہ اوپر والوں کا بھی۔ روز روز کے جائز و ناجائز مطالبوں سے تنگ آ کر اگر ہم مرغی اور انڈے کی پیداوار نہ گھٹاتے تو آج مارکیٹ میں مرغی کا گوشت بڑے گوشت سے بھی کم داموں پر دستیاب ہوتا۔'' (نسواری رنگ کے ٹائی سوٹ میں ملبوس آنکھوں پر گہرا سیاہ چشمہ لگائے سفید بالوں والے مہمان کے بیان پر قہقہہ لگا کر قریشی صاحب نے سر کی جنبش سے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے) ''بالکل درست' سو اسولہ آنے درست بات کی ہے آپ نے' مگر یہ سب کچھ (بایاں ہاتھ نچاتے ہوئے) آپ نے ہماری محبت میں نہیں

کیا۔اس میں (دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی سے انگوٹھا کو مس کرتے ہوئے) مایا دیوی کی محبت اور کشش شامل ہے!''

''شاہ صاحب! سارے راز قریشی صاحب سے ہی اُگلواتے جاؤ گے یا کچھ اپنی بابت بھی بتلاؤ گے؟'' (ڈائننگ ہال کے قریب صوفے میں دھنسے خضاب زدہ بالوں والے ادھیڑ عمر شخص نے ساتھ والے کی پسلیوں میں کہنی چبھوتے ہوئے) ''آپ کو تو پتہ ہے' ہمارا سارا کام مشینی ہے۔ پیداوار کم' زیادہ کرنے کے علاوہ ہمارے بس میں ایک حربہ رہ جاتا ہے کہ منڈی جانے والے مال کو ثابت گندم کھلا کر نمک ملا پانی پلا دیں۔اس طرح من کے پیچھے کلو' دو کلو مال بڑھ جاتا ہے۔مگر اب اس کتے خصی میں بھی کیا دھرا ہے؟ حکومت نے گندم کی قیمت جو دوگنی کر دی ہے۔''

''وہ جی ہمارے ماموں ہیں ناں! ہاں' ہاں وہی جن کے سر پر دانشوری کا بھوت سوار ہے۔ایک بات اُن کی میرے دل کو بڑی لگتی ہے۔ رمضان المبارک کو وہ ہمیشہ فوڈ فیسٹیول کے نام سے پکارتے ہیں۔ پہلے وقتوں میں لوگ روزہ اللہ کی خوشنودی کے لیے رکھتے تھے جبکہ آج کل' توبہ توبہ اللہ توبہ' کہتے ہوئے خوف آتا ہے (قراقلی ٹوپی اور بوسکی کُرتے والے مہمان نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بیان جاری رکھا) اب تو لوگ باگ ہم پر بھی ذخیرہ اندوزی کا الزام لگانے لگے ہیں۔''

''اچھا جی!'' (بہت ساری آوازیں ایک ساتھ) ''جنابِ من آپ تو جانتے ہیں کیلا سب سے نازک پھل ہے ہفتے بھر سے زیادہ نہیں روکا جا سکتا' انگور کی بھی یہی کیفیت ہے۔البتہ سیب' ناشپاتی' امرود' آڑو' خوبانی اور گرما وغیرہ میں گنجائش نکل آتی ہے۔ہم مانتے ہیں کہ رمضان کے شروع میں بیس' تیس روپے درجن والا کیلا اسّی' سو روپے بِکا ہے' اسی طرح اسّی' سو والا انگور ڈھائی تین سو تک گیا ہے۔ٹھوس پھل' میرا مطلب سیب' ناشپاتی' امرود' آڑو' خوبانی اور گرما وغیرہ سے ہے' ان کے نرخ بھی اسی حساب سے بڑھے ہیں۔اب عقل کے اندھوں کو کون بتلائے کہ اگر ہم یہ پھل ہاتھ روک کر یعنی کنٹرول کر کے مارکیٹ میں نہ بھیجیں تو پہلے دو تین دنوں میں ہی سارا مال صاف ہو جائے۔ ہر کوئی ہما شما اونے پونے خرید کر کھا مکائے' رمضان المبارک کے بقیہ دنوں میں شرفا کیا کھائیں اس کی بابت بھی کسی نے سوچا ہے!''

''اب اسی کو دیکھ لیجیے! ہر کوئی گھی تیل کی مہنگائی' ناقص کوالٹی اور منافع خوری کی دہائی دینے پر کمربستہ ہے' یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ رمضان المبارک میں گلی گلی' محلّہ محلّہ' سموسے پکوڑے' پھینی' جلیبی اور مٹھائی کی کس قدر دکانیں اُگ آتی ہیں۔ غریب سے غریب' امیر سے امیر بھی سموسے' پکوڑے کے بغیر روزہ نہیں کھولتا۔ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس بار رمضان کے مبارک مہینے میں سپلائی برقرار رکھنے کے لیے ہم لوگوں نے کہاں کہاں سے کون کون سا تیل حاصل کر کے سپلائی برقرار رکھی ہے۔بنولہ' پام' سویابین' سرسوں' خشخاش' تارا میرا تو اپنی جگہ اس بار تو وائٹ آئل اور پھک کے تیل کے ساتھ دیسی چربی بھی گھی' تیل بنانے میں کام آئی ہے۔''

''یہ پھک کیا ہوتا ہے جی؟'' (دھاری دار نیلی قمیض اور ہری پینٹ والے مہمان سے تلوار کٹ مونچھوں اور سونے کے دانت والے نے جملہ اچک کر سوال داغا) ''چاول ہوتے ہیں نا' چاول' اس کے چھلکے کو پھک کہتے ہیں۔'' ''چاول کے چھلکے سے بھی تیل نکل آتا ہے' کمال ہے!'' (گہرے سلیٹی رنگ کے سفاری سوٹ میں ملبوس منہنی شخص کان میں انگلی گھماتے ہوئے حیرت کا اظہار کر کے بولا)۔

''لگے ہاتھوں وائٹ آئل کی وضاحت بھی ہو جائے تو کیا بُرا ہے!'' (ایک آواز) ''جناب من! یہ جو آپ چنبیلی کا تیل' آملے کا تیل اور مولسری کا تیل سر میں لگاتے ہیں وائٹ آئل میں رنگ اور ایسنس ڈال کر بنتے ہیں یہ تیل!'' (سر پہ دوپلّی ٹوپی' آنکھوں میں کاجل' سلیقے سے ترشہ ہوا خط اور کالی شیروانی میں ملبوس سرخ و سپید شخص نے دائیں ہاتھ کو زیرِ ناف حرکت دیتے ہوئے وضاحت کی)۔

''بھائی جی! آپ بڑے لوگوں کے ساتھ ہم سبزی ترکاری والے بھی رگڑے میں آ رہے ہیں۔میرے بڑے بھائی نے (اشارہ قراقلی ٹوپی اور بوسکی کے کُرتے والے کی طرف) بالکل درست فرمایا کہ کچا سودا زیادہ دیر اسٹور ہو ہی نہیں سکتا' پھر ذخیرہ اندوزی کس بات کی؟''

''تو پھر اس مبارک مہینے میں سبزی کے ریٹ آسمان پر کیسے پہنچ جاتے ہیں؟'' (میزبان نے حیران ہوتے ہوئے سوال داغا تو اُس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے سارے مہمان سوالیہ انداز میں ہمہ تن گوش ہو گئے) ''چھوڑیں جی' کوئی اور بات کریں!'' ''نا جی نا' یہ بھی کوئی بات ہوئی' پیٹی بھائیوں سے بھلا کیا پردہ۔ذرا ہمیں بھی تو پتہ لگے کہ کچے سودے والے راتوں رات محل دو محلے کس طرح کھڑے کر لیتے ہیں؟''

''سیدھی سی بات ہے جی!'' (گہرے سلیٹی رنگ کے سفاری سوٹ میں ملبوس مہمان نے کھسیانی انداز میں بیان جاری رکھا) ''آلو' پیاز' ادرک' لہسن تو پکے آئٹم ہیں' انہیں اسٹور کرنا اور اپنی مرضی سے مارکیٹ میں لانا آسان ہے۔ٹماٹر کچا ہو تو ہفتہ' کبھی ڈیڑھ ہفتہ نکال جاتا ہے' بات جہاں تک تازہ اور ہری سبزی کی ہے تو اُس کے لیے ضروری ہے کہ جتنی پیداوار روز کے روز ہو اتنی مارکیٹ میں لاؤ۔'' ''پھر؟'' (سفید شلوار اور کالے کُرتے میں ملبوس کونے والے صوفے کی آخری سیٹ پر بیٹھے نوجوان نے حیرت کا اظہار کیا) ''سیدھی سی بات ہے جناب پہلے ہم مال خریدتے تھے اب کھیت خریدنا شروع کر دیئے ہیں۔سو من کی طلب ہو تو مارکیٹ میں پچاس من لاؤ' طلب کے حساب سے قیمت خود بہ خود چار گنا ہو جائے گی' منافع پھر بھی دوگنا ہو گا۔آخر کو کسان کے گھر' پاس پڑوس اور ڈھور ڈنگر کا بھی کوئی حق بنتا ہے نا!''۔

''تُو سنا بھئی کاکا! تیرا کیا حال ہے' معاف کرنا' میں تجھے پہچان نہیں

پایا!'' (صاحبِ خانہ نے سفید شلوار اور کالے کُرتے میں ملبوس گورے چٹے نوجوان سے سوال کیا تو اس کے لب کھولنے سے پہلے ہی تہبند اور پگڑی والے بزرگ بول پڑے) ''او جی یہ اپنے مرشد کا چشم و چراغ ہے۔'' ''مرشد!'' (سلیٹی رنگ کے سفاری سوٹ والے نے سوالیہ انداز میں دریافت کیا) ''بھئی کمال ہے! مرشد تو اُن کی بزرگی کے باعث لاڈ میں کہتے ہیں' اصل نام تھوڑی ہے ان کا یہ۔ ویسے ایمان لگتی بات یہ ہے کہ مرشد ہیں بڑے نیک اور خدا ترس انسان۔''

''کیوں بھئی کاکا! کام شام تو ٹھیک چل رہا ہے' خیر سے ابّا جی تو ٹھیک ہیں نا!'' ''جی جناب! آپ کی دعا سے بالکل ٹھیک ہیں' انہوں نے ہی آنا تھا مگر اُن کی فلائٹ لیٹ ہوگئی۔ آپ کو تو پتہ ہے' ابّا جی عمرے پر گئے ہوئے ہیں؟'' ''لے یہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے' ہم دونوں ایک ہی فلائٹ میں گئے تھے۔ (میزبان نے شفقت کا اظہار کرتے ہوئے سر ہلا کر گواہی دی)۔

''خیر سے کتنی بھینسیں رکھی ہوئی ہیں بیٹا جی آج کل؟'' (پانچویں صوفے کی پہلی سیٹ پر کالے بٹن' سنہرا کرتا' سفید شلوار کے نیچے کوہاٹی چپل اور مونڈھے پر چیک دار شال ڈالے ہوئے کرخت آواز والے مہمان نے شیشے کے گلاس کو خالی کرتے ہوئے دریافت کیا) ''میرا خیال ہے جی!'' (انگلیوں پر گنتے ہوئے) ''خیر اے خیر اے! اتنے ڈھیر سارے باڑوں کا زبانی حساب کرنا بھی تو مشکل ہے نا! تُو یہ بتا آج کل گوالوں کی کیا صورت حال ہے' دودھ شودھ کی سپلائی تو ٹھیک ہے نا؟'' (ایک بار پھر پگڑی اور تہبند والے بزرگ نے گرہ لگائی)

''جی خیر سے اب تو اپنی فیکٹری لگا لی ہے ہم نے دودھ بنانے والی!'' ''دودھ بنانے والی فیکٹری؟'' (ڈائننگ کی طرف سے آخری صوفے سے ایک آواز) ''ہاں جی' مصنوعی دودھ بنانے والی فیکٹری!'' ''تیرا مطلب خشک دودھ تو نہیں؟'' (میزبان نے سوالیہ انداز میں دریافت کیا) ''نہیں جی' یہ جو آج کل موبل آئل' ماربل پاؤڈر' سرف (شرماتے ہوئے) اور دوسرے پاؤڈر سے ملا کر بنایا جاتا ہے۔'' ''دوسرا پاؤڈر؟'' (ایک آواز) ''ہاں جی' دوسرا والا پاؤڈر!'' (جھینپتے ہوئے) ''بھئی یہ دوسرا پاؤڈر کونسا ہوتا ہے؟'' (سلیٹی رنگ کے سفاری سوٹ والے کی حیرت میں سب شریک تھے) ''مزے والا پاؤڈر اور کون سا پاؤڈر!'' (تہبند اور پگڑی والے بزرگ نے دایاں ہاتھ بائیں والے کے ہاتھ پر مار کر آنکھ دباتے ہوئے صورت حال کی وضاحت کی تو سب مہمانوں کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے)

''اس کا مطلب ہے پوڈر شوڈر یعنی خشک دودھ کا ٹن ٹنا مک گیا!'' (مصنوعی بتیسی کو ہونٹوں کی مدد سے دباتے ہوئے پکی عمر کے شخص نے جملہ اُچھالا) ''ناں جی! وہ کس طرح مَک سکتا ہے۔'' ''پھر؟'' (میزبان حیرت سے) ''تینوں برابر ملاتے ہیں جی!'' ''مطلب؟'' (ایک آواز) ''مطلب یہ کے ایک بٹا تین بھینس کا دودھ' ایک بٹا تین پوڈر کا دودھ اور ایک بٹا تین مشینی دودھ۔''

''میں نے کہا بزرگوار! آپ بڑے خاموش بیٹھے ہو۔'' خیر سے پنسار کا کام تو ٹھیک چل رہا ہے نا!'' (تلوار کٹ مونچھوں والے کے سوال پر شال والے مہمان نے چونکتے ہوئے) ''نہیں بندہ پرور آپ کی دعا سے پنسار کا دھندہ بھی ٹھیک چل رہا ہے۔ اب وہ پہلے کی طرح سیخ سڑپّے والی بات نہیں رہی' اب تو بس دیکھا بھالی ہے۔'' ''دیکھا بھالی سے کیا مراد ہے آپ کی؟'' (نیلی قمیض اور ہری پتلون والے مہمان نے خمار آلود لہجے میں سیدھا ہاتھ ہوا میں لہرا کر دریافت کیا جس کے باعث گلاس سے مشروب چھلک کر اُس کے کپڑوں پر آ گرا)

''صاف سی بات ہے۔ ہر چھوٹے بڑے بازار میں نِچّے قسم کے دکاندار چکّی لے کر بیٹھ گئے ہیں۔ چکّی میں پہلے سے کیا ہوتا ہے یہ جاننے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ گاہک کو یہ تسلی ہے کہ ہلدی' مرچ' نمک' دھنیا اور بیسن سامنے پیس کر دیا جا رہا ہے۔ ہم تو بیسن میں زیادہ سے زیادہ سستا چاول اور رنگ ملا لیا کرتے تھے' اب تو یار لوگ! چکنی مٹی اور پسی ہوئی لکڑی بھی ملانے لگے ہیں۔ سرخ مرچ کے اندر پہلے لکڑی کا بارودہ ملاتے تھے اب پتھر پیس کر ملانا پڑتا ہے۔ چائے کی پتی میں پہلے کم قیمت یا زائد المیعاد پتی ملا لیا کرتے تھے۔ اب کیلے اور چنے کے چھلکے کبھی کبھی لکڑی کا بارودہ ملانے کے سبب رنگ اور کیمیکل کی لاگت بھی بڑھ گئی ہے۔ چینی کی مہنگائی نے مشروبات کو روزے داروں کی دسترس سے باہر کر دیا ہے لہٰذا کچھ نے تو اپنی فیکٹریاں لگا لی ہیں اور کچھ مقامی کمپنیوں سے ساز باز کر کے ملتے جلتے شربت بنا کر مناسب دام پر روزہ داروں کو مہیا کر رہے ہیں۔ دقّت اس میں یہ ہے کہ دیسی رنگ' سکرین اور ایسنس کی قیمتیں بھی آسمان سے باتیں کرنے لگی ہیں۔ اوپر سے پرانی شیشی بوتل والے بھی آنکھیں دکھلانے لگے ہیں۔ اب بندہ اس مبارک مہینے میں منافع کو دیکھے کہ ثواب کمائے۔ رہی سہی کسر اللہ میاں نے نکال کر رکھ دی ہے؟''

''وہ کیسے؟'' (کالا کُرتا اور سفید شلوار والے نے معصومیت سے دریافت کیا) ''اس بار کھجور کی فصل اتنی اچھی ہوئی تھی' اتنی اچھی ہوئی تھی کہ پورے صوبے میں گھر گھر مال کے ڈھیر تھے اور گاہک دُور دُور تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ روزہ داروں کی سہولت کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے آؤ دیکھا نا تاؤ لمبی چوڑی خریداری کر ڈالی۔ ہوا کیا! فائدہ کے بجائے الٹا منافع میں نقصان اٹھانا پڑا۔ ہم مال روکتے رہے اور لوگ مال رولتے رہے۔ چلو اللہ مالک ہے' اس میں بھی شاید کوئی بہتری ہو' ایک در بند تو ستر کھلے۔

''بے شک' بے شک' درست فرمایا آپ نے' اللہ تعالیٰ کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں! (میزبان کے سامنے والی رو کے تیسرے صوفے کی پہلی سیٹ پر کمر کے درد سے نجات کے لیے دائیں بائیں ایک سے زیادہ کُشن رکھ کر بیٹھے ہوئے لمبی داڑھی والے مہمان نے بلند آواز سے شال والے مہمان کی تائید کی تو اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے) ''شکر الحمد للہ' وہ جس حال میں رکھّے (آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھا کر) آپ سناؤ سائیں جی آپ کا دھندا تو ٹھیک ہے نا!''

''کمال کرتے ہو یار! جو بندہ ایک مہینہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھا رہے، نہ کوئی دیگ کھڑکائے، نہ کڑاہی چکائے، اس بیچارے سے دھندے کی بابت دریافت کرنا سراسر زیادتی ہے!'' (مصنوعی بتیسی والے مہمان نے دونوں ہونٹوں کے اندر والی سائیڈ پر زبان پھیرتے ہوئے سائیں جی سے ہمدردی جتانے کی کوشش کی) ''ایسی بھی کوئی بات نہیں! وہ دن ہوا ہوئے جب خلیل خاں فاختہ اُڑاتے تھے۔ (دونوں ہاتھوں کو ہوا میں بلند کرتے ہوئے) جناب عالی! عام دنوں میں ہوٹلوں کا کاروبار آٹھ گھنٹے ہوتا ہے تو رمضان المبارک کے مہینے میں بارہ گھنٹے ہوٹل کھلے رہتے ہیں۔ افطاری سے لے کر سحری تک گاہکوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔'' ''اچھا جی!'' (کئی آوازیں ایک ساتھ) ''ہاں جی! اب تو وہ کیا کہتے ہیں، میرا مطلب ہے، فیشن بن گیا ہے ہوٹلوں میں سحری وافطاری کرنے کا۔ پہلے زمانے کے لوگ بھوک پیاس برداشت کر کے اور کھانے سے پرہیز کر کے روزہ رکھا کرتے تھے۔ اب تو جی پوری قوم کھابے کھانے پر لگی ہوئی ہے۔ جسے دیکھو حلوہ پوڑی، سری پائے، مغز، نہاری، گردے کلیجی، حلیم، بریانی، ہریسہ، قیمہ پراٹھے، کڑاہی، روسٹ اور بروسٹ پھڑکانے پر لگا ہوا ہے۔''

''پھر تو آپ کی خوب چاندی ہوگی!'' (تلوار کٹ مونچھوں والے مہمان نے سونے کے مصنوعی دانت کو زبان سے فکس کرتے ہوئے) ''آپ کی دعا سے منافع تو اس کام میں پہلے بھی کم نہ تھا مگر جب سے کسی سیانے نے ڈسپرین اور کیمیکل پر لگایا ہے، تب سے!'' ''خدا کا خوف کرو سائیں جی! ڈسپرین اور کیمیکل کا کھانوں سے بھلا کیا تعلق!'' (سلیٹی سوٹ والے مہمان کی حیرت میں سب مہمان شریک تھے) ''ہے بادشاہو، سو فیصد ہے! یہ جو آپ لوگ مرغ، مچھلی، گوشت کے موٹے موٹے اور بڑے بڑے بُچّے (دائیں ہاتھ سے گولہ بناتے ہوئے) بیس بچیس منٹ میں آرڈر پر کڑاہی اور بالٹی کی شکل میں تیار کرا کے چٹ کر جاتے ہو یہ اسی ڈسپرین اور کیمیکل کا کمال ہے!'' (میزبان نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے) ''بھلا کیا نام ہے اس کیمیکل کا، ہمیں بھی تو پتا چلے؟'' ''وہ جی! خدا آپ کا بھلا کرے، نام (سوچتے ہوئے) ENZYME نام ہے اس کا۔'' ''یہ انزیم آپ کے کس کام آتا ہے؟'' (تہبند والے بزرگ مہمان نے غلط تلفظ سے دریافت کیا) ''کسی زمانے میں تو جی یہ صفائی وفائی کے کام آتا تھا۔ اب تو ہوٹلوں اور ریستورانوں کے ساتھ کیٹرز اور کک بھی گوشت گلانے کے لیے کثرت سے استعمال کرتے ہیں یہ!'' ''اس کا فائدہ؟'' (ایک آواز) ''فائدہ اس کا جناب یہ ہے کہ اوّل تو کوئی مائی کا لعل اس کیمیکل میں گلا ہوا کھانا پیٹ بھر کے کھا نہیں سکتا اور اگر کھا لے تو پچا نہیں سکتا!'' (فخریہ انداز میں) ''پھر جی؟'' (حیرت میں ڈوبی ایک آواز) ''پھر کیا جی! سیر کا تین پاؤ دیے جاؤ اور لمبے نوٹ چھاپے جاؤ! ہماری فکر چھوڑو جی، یہ اپنے حاجی صاحب بڑے خاموش بیٹھے ہیں، میں نے کہا حاجی صاحب سب خیر خیریت تو ہے نا!''

''اصل میں جی ویسے تو اللہ پاک کا بڑا کرم ہے مگر یہ جو آج کل کے ڈاکٹروں نے ڈاکو زنی شروع کر دی ہے اس سے ہمارے کاروبار کو بڑا نقصان پہنچ رہا ہے۔'' ''وہ کس طرح قبلہ؟'' (حاجی صاحب کے سامنے والے صوفے سے آواز ابھری۔) ''وہ اس طرح بندہ پرور (آواز کی جانب منہ کر کے شکل پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے) کہ ہر ڈاکٹر نے اپنے کلینک میں قانونی یا غیر قانونی فارمیسی کھول رکھی ہے۔ سو ڈیڑھ سو لال پیلے کیپسول وٹامن یا آئرن کی چند گولیوں اور ٹیکے کے عوض مریض سے جھاڑ لیتے ہیں۔ تین سے چار سو روپے دوائی کی چٹ لکھ کے الگ سے پکڑا دیتے ہیں جو ان کے کلینک کے سوا کہیں دستیاب نہیں ہوتی۔ مجھے تو شرم آتی ہے اِن کو ڈاکٹر کہتے ہوئے۔''

''آپ کی انجمن نے اس کا کیا حل نکالا ہے؟'' (ہاتھ میں تھامے ہوئے گلاس سے چُسکی لیتے ہوئے میزبان نے حاجی صاحب کو مخاطب کیا) ''بندہ پرور ہمارے بھی چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، ہم نے بھی خدا کو جان دینی ہے۔ اگر ہم اپنے زیر کفالت لوگوں کی ضرورتوں کا خیال نہیں رکھیں گے تو حقوق العباد سے رُوگردانی کے مرتکب ہونگے۔ ویسے تو مغربی اور مشرقی پڑوسیوں کی جانب سے لُوز پیکنگ میں اس قدر گولیاں اور کیپسول آ رہے ہیں کہ اُنہیں اپنی مرضی کی پیکنگ اور لیبل لگا کر منہ مانگی قیمت مل جاتی ہے۔ رمضان المبارک کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ روزہ داروں کے سحری اور افطار کے وقت الل ٹپ اور اناپ شناپ کھانے کے باعث پیٹ درد، سر درد، بلڈ پریشر اور شوگر کنٹرول کرنے والی گولیوں اور انسولین کی طلب بڑھ جاتی ہے۔ ہم لوگوں کو لاکھ سمجھائیں مگر اُن کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ اس نیک مہینے میں شیطان کو بند کر دیتا ہے لہٰذا یہ عارضی بیماریاں شیطان مردود کی عدم موجودگی میں مومن کا کیا بگاڑ سکتی ہیں! مگر کیا کریں جی، لوگوں کی ضعیف الاعتقادی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے فرمان پر بھی کان نہیں دھرتے''

''تو پھر آپ لوگ کیا کرتے ہیں؟'' (پگڑی اور تہبند والے بزرگ نے ترنگ میں آ کر شوخی سے دریافت کیا) ''بندہ پرور کرنا کیا ہے! رمضان المبارک میں جن دوائیوں کی مانگ بڑھ جاتی ہے اُن دوائیوں میں چاک مٹّی اور پانی کی مقدار دگنی ہو جاتی ہے۔ دیسی کمپنیوں کے ساتھ ہمارا بھی بھلا ہو جاتا ہے۔ مسئلہ تو روزداروں کے اطمینان کا ہے، سو اللہ کا نام لے کر درود شریف پڑھ کے پھونکے جاتے ہیں اور حاجت مندوں کو دیے جاتے ہیں۔ ویسے بھی! جب شیطان مردود قید ہے تو پھر ڈر کس بات کا؟ آپ تو جانتے ہو جو شخص صوم وصلوٰۃ کا پابند ہو، زکوٰۃ، خیرات اور فطرانہ وقت پر ادا کرتا ہو، اللہ کے گھر کی تعمیر وتزئین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہو، حضور کے در پر سال کے سال جا کر گڑگڑاتا ہو، پھر بھلا شیطان مردود کی کیا مجال کہ اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ سکے!''

''بے شک، بے شک'' (قریب قریب تمام شرکاء ہم آواز ہو کر) ملازم مالک کے نزدیک آ کر دھیمے لہجے میں کھانا لگنے کی اطلاع دیتا ہے۔ جس کے جواب میں دونوں ہاتھ کے اشارے سے مالک تمام مہمانوں کو خاموش

باقی: صفحہ ۷ پر ملاحظہ فرمائیں

''خوشبو سے رشتہ''

ملک زادہ جاوید (نوئیڈا، بھارت)

لفظوں سے مصرعہ بنتا ہے
پھولوں سا چہرہ بنتا ہے

توڑو مت شاخوں سے پھول
خوشبو سے رشتہ بنتا ہے

دھوپ سے کر کے رشتے داری
موم کا وہ پُتلا بنتا ہے

دھن پر ہم جب سج جاتے ہیں
تب جا کر نغمہ بنتا ہے

کیوں ہنستا ہے آنکھ سے وہ
ہر دن اک قصّہ بنتا ہے

دل کے زخموں سے ہی مل کر
آنسو کا قطرہ بنتا ہے

نکلو گھر سے اے جاوید
بھیڑ میں خود رستہ بنتا ہے

عظمیٰ صدیقی (لندن)

بستی بستی کوچہ کوچہ درد کا منظر دیکھا ہے
ٹوٹے بکھرے انسانوں کا ایک سمندر دیکھا ہے

فاقہ مستی اور جہالت، خونریزی خونریز سیاست
اپنی دنیا کے لوگوں کا آج مقدر دیکھا ہے

کل جو اپنے اپنے ہاتھ پہ چاند اور سورج رکھتے تھے
اُن کو غیر کے دہلیزوں پہ مثلِ گداگر دیکھا ہے

جس کو ڈھونڈنے نکلے جوگی جنگل جنگل صحرا صحرا
اُس ہستی کا عکس تو ہم نے اپنے اندر دیکھا ہے

اپنے وطن میں امن وسکوں ہے گھر گھر میں خوشحالی ہے
ہم وطنوں یہ خواب سہانا ہم نے اکثر دیکھا ہے

اس بستی میں رہنے والوں وہ گھر بھی تو جا کر دیکھو
جس کو دیکھا تو ہے لیکن باہر باہر دیکھا ہے

چھوڑ تو آئے ہیں پیچھے ہم اپنے کیسے کیسے خواب
مڑ مڑ کے پر ہم نے اُن کو آنکھیں بھر بھر دیکھا ہے

دل کی کیاری میں بویا تھا الفت کا جو بیج کبھی
بڑھتے بڑھتے کل کا پودا آج تناور دیکھا ہے

اُس سورج کی گرمی سے خون کی ایک ایک بوند میں عظمیٰ
ہم مشرق کے لوگ ہیں ہم نے رنگِ خاور دیکھا ہے

عارف شفیق (کراچی)

دوزخ بھی کیا گمان ہے جنت بھی ہے فریب
ان وسوسوں میں میری عبادت بھی ہے فریب

دریا و دشت اور سمندر بھی ہیں سراب
دن کا اجالا رات کی ظلمت بھی ہے فریب

تیرا ہر اک خیال بھی اک خوشنما گمان
دنیا ہی کیا خود اپنی حقیقت بھی ہے فریب

پرچھائیں کے سوا تو نہیں ہیں ہم اور کچھ
یہ رنگ و نور اور یہ نکہت بھی ہے فریب

روزِ ازل کا لمحۂ موجود بھی ہے عکس
یعنی گذرتے وقت کی ساعت بھی ہے فریب

وہم وگماں کے سائے ہیں سورج بھی چاند بھی
اندھی ہے سوچ اور بصارت بھی ہے فریب

ہے یہ نگارخانہ جو خواب و خیال سا
اس آئینے میں میری یہ صورت بھی ہے فریب

عارف حسین کا دھوکا سہی اپنی کائنات
اس زندگی کے بعد کی حالت بھی ہے فریب

سہیل اختر

(بہاولپور)

زیست ساون کی جھڑی ہو جیسے — اور کئی دن سے کھڑی ہو جیسے
آنکھ سے ڈھلتا ہوا خوننابہ — لعل و گوہر کی لڑی ہو جیسے
اُن کے قامت کی نزاکت' توبہ — کوئی پھولوں کی چھڑی ہو جیسے
میرے پہلو میں تری یاد کی چاپ — ایک انمول گھڑی ہو جیسے
یادِ ماضی' دِل ویراں میں کوئی — گم شدہ چیز پڑی ہو جیسے
آرزوؤ بڑے شبستاں سے دور — ایک جوگن سی کھڑی ہو جیسے

○

کرشن پرویزؔ

(روپڑ' بھارت)

سچ تو یہ ہے کہ تری انا کو مری وفا سے پیار نہیں — لیکن ترے حسن کی عظمت سے مجھ کو انکار نہیں
تن تنہا بیٹھا ہوں کب سے یادوں کے مے خانے میں — دل ہے شکستہ جام ہے خالی اور کوئی غمخوار نہیں
غرض کے بندے ہیں اب سارے کام سبھی اپنے مطلب ہے — پل دو پل کی اس دنیا میں کوئی کسی کا یار نہیں
ہم تم دونوں اک دوجے کو حیرت سے کیوں دیکھ رہے — میری محبت خمیر گل ہے پتھر کی دیوار نہیں
کوئی ہیولہ رہزن بن کر لوٹ نہ لے پرویزؔ ہمیں — منزل بھی تو دُور بہت ہے رستہ بھی ہموار نہیں

○

شگفتہ نازلی

(دعائیہ اسلوب میں کہی گئی)

(لاہور)

مشکل میں آ پڑے ہیں' ہم پہ رحم کیجیے — سیلاب میں کھڑے ہیں' ہم پہ رحم کیجیے
اس انتہا پسندی کی کوئی انتہا تو ہو — حالات سے لڑے ہیں' ہم پہ رحم کیجیے
قومی مفاد ہو ہمیں ہر شے سے بھی عزیز — کس سمت کو مُڑے ہیں' ہم پہ رحم کیجیے
اِصلاح کا شعور گر بیدار ہو رہے — موقعے تو پھر بڑے ہیں' ہم پہ رحم کیجیے
غیبت' دروغِ گوئی سے مجروح کوئی نہ ہو — بہتان کیا گھڑے ہیں' ہم پہ رحم کیجیے
ہر معاملے میں میانہ روی سے ہی کام لیں — کس بات پہ اڑے ہیں' ہم پہ رحم کیجیے
دہشت سے سیر گاہیں بھی جیسے اُداس ہیں — طیور بھی اڑے ہیں' ہم پہ رحم کیجیے
دشتِ دُعا دراز' فریاد و پکار ہے — اِک صف میں آ کھڑے ہیں' ہم پہ رحم کیجیے!

ندیم ہاشمی

(کراچی)

تیرگی میں اُتر نہیں سکتے — خُوں کے رشتے مُکر نہیں سکتے
کیسے موجوں کو جوش آتا نہیں — کیسے طوفاں اُبھر نہیں سکتے
پھر سے ہوگی نہیں نوازش کیا — پھر سے گیسو سنور نہیں سکتے
ہم نے جینے کا عزم پالا ہے — غم کے لشکر سے ڈر نہیں سکتے
جو لگائی ہے تُو نے جلووں کی — اُتنی قیمت تو بھر نہیں سکتے
جن کو جاں کا خراج دینا ہو — ایسے جذبے تو مَر نہیں سکتے
اُس سے کہہ دو ندیمؔ، اُس کیلئے — پھُول بن کے بکھر نہیں سکتے

○

اسد بیگ

(راولپنڈی)

وفا تلاش کرو کارواں تلاش کرو — کہیں تو عزمِ سفر کا نشاں تلاش کرو
ہے منزلوں کی صداقت بھی بیچ رستے میں — اگر چلے ہو تو اپنا جہاں تلاش کرو
نکل پڑے ہو جو گل کی تلاش میں یارو — تو پہلے اچھا سا اِک باغباں تلاش کرو
وہ جس کی یاد نے رکھا ہے مضطرب یارو — اسی کے نام پہ دردِ نہاں تلاش کرو
جہاں کہیں ہے صدائیں بھرو سماعت میں — جہاں کہیں ہے محبت وہاں تلاش کرو
اسدؔ یہ کار امانت ذرا اٹھاؤ تو — کہ اپنی بستی میں اک ہم زباں تلاش کرو

○

عدیل زیدی

(ہیوسٹن)

جہانِ علم کا بابِ نصاب ہوتے ہوئے — بھٹک رہا ہوں میں اہلِ کتاب ہوتے ہوئے
کچھ اور بھی ہے خرابی کی دوسری صورت — میں خود کو دیکھ رہا ہوں خراب ہوتے ہوئے
جو کام دل کو مرے فطرتاً نہیں بھاتے — اُنہیں میں کر نہیں پاتا ثواب ہوتے ہوئے
مرے ہی دم سے ہے جو کچھ بھی اس جہاں میں ہے — میں کیسے خود کو بھلا دوں جناب ہوتے ہوئے
عدیلؔ جو تھے اِن آنکھوں کی روشنی کل تک — وہ چہرے دیکھ رہا ہوں میں خواب ہوتے ہوئے

○

ڈاکٹر جواز جعفری (لاہور)

ہجوم دامن و دستار سے گذر رہا تھا
میں خواب میں کسی بازار سے گذر رہا تھا

تمام شہر میں جب روشنی کے چرچے تھے
مرا قبیلہ کسی غار سے گذر رہا تھا

بُلا رہے تھے مجھے شہرِ مصلحت کے مکیں!
میں جس گھڑی خطِ انکار سے گذر رہا تھا

رُوئیں روئیں میں مرے کونپلیں نکل آئیں
میں تیرے سایۂ دیوار سے گذر رہا تھا

مہک رہا تھا گلِ آرزوٗ پسِ شمیر
میں زخم زخم تھا اور دھار سے گذر رہا تھا

عجیب دن تھے یہ دل خوش بھی تھا' اداس بھی تھا
میں اِن دنوں کسی آزار سے گذر رہا تھا

ہمارے بیچ کوئی خاک وخوں کا دریا تھا
میں اِس طرف تھا، وہ اُس پار سے گذر رہا تھا

نہ کوئی چشمِ ستارا، نہ کوئی دستِ گلاب
میں جیسے قریۂ اغیار سے گذر رہا تھا

لُٹے پٹے درودیوار کہہ رہے ہیں جواز
یہ شہر نرغۂ سالار سے گذر رہا تھا

مسکین احمد منصور (حیدرآباد)

تم نے کتنے سپنے دیکھے، میں نے کتنے محل بنائے
اپنی جھولی میں سب لے کے سمے کا ساگر بہتا جائے

جانے کتنی صدیاں بیتیں پیاس آنکھوں کو پتھرائے
پھر بھی دیکھو دل کی دھڑکن ہر آہٹ پر رکتی جائے

تیرے خط کے حرف اور نقطے جیسے مہکی مہکی کلیاں
اک البیلی خوشبو ناچے، ہاتھ بڑھاؤں ہاتھ نہ آئے

آنے والی کل کا سورج سنا ہے روشن روشن ہوگا
لیکن کسی طرح سے بیرن رین تو گزرے صبح تو آئے

کارا کا گا صبح سویرے میری اٹریا بول رہا ہے
میرے پردیسی ساجن کا شاید کوئی سندیسہ آئے

دنیا میں بھی رہ کر ہم نے اس دنیا کی ریت نہ جانی
جھلمل کرتی ریت پہ اکثر بہتے جل کے دھوکے کھائے

چپ چپ اس دھرتی کے باسی، انساں ہیں پتھر ساتی
کوئی تو زہر پیالہ مانگے، کوئی تو سولی پر چڑھ جائے

رؤف خیر (حیدرآباد دکن)

یہاں تو بیٹھے ہیں ہم آزمائے دیدہ و دل
جسے گنوانا ہو' جائے گنوائے دیدہ و دل

بدلتی رہتی ہے آب و ہوائے دیدہ و دل
ہم ایک عمر سے ہیں آشنائے دیدہ و دل

کوئی لکیر کوئی نقش پائیدار نہیں
پلک جھپکتی ہے حیرت سرائے دیدہ و دل

یہ شہر شہر تھا اس کی گلی کی نسبت سے
بچا ہی کیا ہے یہاں اب برائے دیدہ و دل

خدا کرے کہ تمہیں بھی نظر یہ مل جائے
میں دیکھتا ہوں بہت ماورائے دیدہ و دل

الگ ہیں اس کی وفاداریاں زمانے سے
دماغ ہو گا کہاں ہم نوائے دیدہ و دل

فقیر اپنی جگہ مست و بے نیاز تو ہے
متاع کچھ بھی نہیں ہے سوائے دیدہ و دل

ترے لئے میری پہچان' امتحان بھی ہے
کبھی تو دیکھ ہٹا کر ردائے دیدہ و دل

نصیب چین سے پھر بیٹھنا نہیں ہوگا
اگر قبول کرو گے صلائے دیدہ و دل

ہے سخت میرے یقین و گمان کا معیار
خلاف عقل تو دیتے ہیں رائے دیدہ و دل

ہمیں خلاف توقع جو خیر ملتے ہیں
کبھی وہ بھرتے نہیں زخم ہائے دیدہ و دل

○

احسان احمد شیخ (اسلام آباد)

نہ رفو کر تو مرے چاک گریبانوں کو
ہاتھ میں کوئی بھلا تھامے ہے طوفانوں کو

ریزہ کر دیں گے یہ ہر کوہ و دمن کو لوگو
راستہ دے دو اِن بڑھتے ہوئے دیوانوں کو

اندھے ہو جاؤ گے گر دیکھ نہیں سکتے تم
بھیگی آنکھوں میں سسکتے ہوئے ارمانوں کو

وہی شعلہ جو میسّر نہیں چولھے کو مرے
راکھ کر دے گا چمکتے ہوئے ایوانوں کو

کتنی ہی مسجدیں تعمیر ہوئی بستی میں، یہ دل
بھول سکتا نہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کو

میں گزر جاؤں گا اِن راہوں سے اے شیخ مگر
یاد رکھے گی یہ دنیا میرے افسانوں کو

تصور اقبال (اٹک)

جہاں بُزدلوں کا نگر آتا ہے
وہاں نوکِ نیزہ پہ سر آتا ہے

جہاں چڑھتا سُورج نظر آتا ہے
پرستش کو ہر کوئی در آتا ہے

مری غم سے ہے دوستی اس قدر
بِلا خوف وہ میرے گھر آتا ہے

کبھی آنکھ نم کر کے تُو گِڑگڑا
سنا ہے دُعا میں اثر آتا ہے

ستاروں پہ رکھتا ہے تُو کیوں یقیں؟
تجھے ان میں کیا کچھ نظر آتا ہے؟؟

سفینہ مرا ہو رواں کس طرح
چلوں دو قدم تو بھنور آتا ہے

بنایا ہے جس نے مرا حال یہ
اُسے بھی ترس دیکھ کر آتا ہے

جہاں نفرتوں کا سفر ختم ہو
محبت کا آباد گھر آتا ہے

سدا دھوپ میں چھاؤں دیتا ہے جو
مری رہ میں ایسا شجر آتا ہے

غزل پھر تصوؔر نئی کہہ کوئی
تجھے بھی بڑا یہ ہُنر آتا ہے

عرش صہبائی (جموں، کشمیر)

روشنی بن کے وہ ظُلمات میں تابندہ ہیں
لوگ تاریخ کے اوراق میں جو زندہ ہیں

آپ کو بے وفا کہنے کی خطا ہم سے ہوئی
کچھ بھی ہو دل سے ہم اِس لئے شرمندہ ہیں

اس میں کچھ شک نہیں تعداد میں وہ کم ہوں گے
پھر بھی حق گو ہیں جو دنیا میں ابھی زندہ ہیں

عمر بھر صاحبِ کردار رہے ہیں جو بھی
کل بھی تابندہ تھے وہ آج بھی تابندہ ہیں

ہم غلط بات پر خاموش کبھی رہ نہ سکے
ایسی لغزش کے لئے خود سے بھی شرمندہ ہیں

زندہ رہنا نہیں دُنیا میں بڑی بات مگر
دیکھنا یہ ہے کہ کن حالات میں ہم زندہ ہیں

جذب ہونا ہے اِنہیں نورِ سحر میں آخر
چاند تارے جو بڑی شان سے تابندہ ہیں

عرشؔ ہر بات کا مقصد ہوا کرتا ہے کوئی
ہم کو معلوم نہیں کس لئے ہم زندہ ہیں

○

ہوا کے دوش پر

(ایک عام آدمی کی داستان حیات)

فیروز عالم

(کیلی فورنیا' امریکہ)

قسط.....۳

جودھپور

ہمارے کنبے کا وہ دور جو انہوں نے جودھپور میں سن چالیس کی دہائی میں گذارا ایک سنہری دور ہے۔ اس زمانے میں وہ لوگ جو یو پی چھوڑ کر راجپوتانہ آ بسے تھے زیادہ تر جودھپور میں جمع ہو گئے تھے۔ اس سے پہلے ان میں سے کچھ کو اپنی ملازمت کی وجہ سے راجپوتانے کے چھوٹے شہروں جیسے باڑ میر، میڑتا روڈ، مارواڑ پالی، ڈگانہ اور سندھ کے شہر میر پور خاص میں رہنا پڑا تھا مگر اب تقریباً سب ہی جودھپور میں اکھٹے ہو گئے تھے۔ یوں خاندان کی ایک بڑی شاخ اب بھی مراد آباد میں تھی اور چھٹیوں میں ان سے بھی ملنا رہتا تھا۔

جودھپور راجپوتانہ کے ریگستان کے عین درمیان میں واقع ہے۔ یہ قبل تقسیم ہند ریاست کا دارلحکومت تھا۔ مغلوں ہی کے دور حکومت سے اسے بڑی اہمیت حاصل تھی اور شہنشاہ اکبر اعظم کے دور میں یہاں کے راجہ جسونت سنگھ اسکی حکومت میں وزیر جنگ کے طور پر شامل تھے۔ یہ اس وقت بھی ہندوستان کے بڑے اور ترقی یافتہ شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ یہاں اچھے سنیما گھر تھے، بہت جدید ہسپتال ''ونڈھم ہوسپٹل'' تھا اور شہر میں بڑے باغات جیسے ''پبلک پارک'' اور دوسری تفریحی جگہیں تھیں۔ برطانوی فضائی فوج کا ایک ہوائی اڈہ ''ایرو ڈروم'' بھی تھا۔ شہر کے بیچ ایک چھوٹی پہاڑی پر پرانہ قلعہ تھا اور اسی کے پاس راجہ کا محل ''چھیتر پیلس'' تھا۔ میری بڑی بہن ریحانہ آپا شاید ان چند لوگوں میں ہیں جنہوں نے ''بلیو برڈ'' جو گرل اسکاؤٹ قسم کی تنظیم تھی میں شامل ہونے کی وجہ سے چھیتر پیلس دیکھا ہے مگر وہ اس وقت اس قدر چھوٹی تھیں کہ اب انہیں وہ اچھی طرح یاد نہیں۔ شہر کے عوام خوش حال تھے اور محبت اور رواداری کی ایک مثالی فضا قائم تھی۔ ریاست کے راجہ امید سنگھ کو اپنی رعایہ سے بہت محبت تھی اور وہ ہندو اور مسلمانوں کے ساتھ یکساں انصاف اور محبت کا سلوک کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمان تہوار بھی سرکاری سرپرستی میں منائے جاتے تھے۔ رمضان میں روزہ افطار کے وقت قلعہ سے توپ داغی جاتی تھی ورمحرم میں رانی صاحبہ کا اپنا تعزیہ نکلتا تھا۔

ہمارا کنبہ تفریح کا شوقین تھا اور زندگی سے مکمل لطف اندوز ہونے کے فلسفے پر قائم تھا۔ اس لئے اس دور میں پکنکیں، گھومنے پھرنے اور گیت و سنگیت کی محفلیں کرنا انکا معمول ہو گیا تھا۔ میں نے میر پور خاص میں اپنے بچپن میں اُن تمام رشتہ داروں کو جو اس زمانے میں جودھپور میں تھے وہاں گزارے ہوئے خوشگوار وقت کا تذکرہ بڑے شوق سے کرتے سنا ہے۔ یہ لوگ بتاتے تھے کہ تمام کنبہ وہاں بال سمند اور منڈور میں پورا پورا دن گذارتا تھا مزے مزے کے کھانے پک کر ساتھ جاتے تھے اور کھیل کود اور چہچہی کی بازیاں جمتی تھیں۔

اکثر شاموں کو سب مل کر نئی ریلیز ہوئی فلم دیکھنے ''سٹیڈیم'' سنیما جاتے تھے اور جب شہر میں سرکس آتا تھا تو بچے بوڑھے سب ملکر شوق سے سرکس دیکھتے تھے۔

جودھپور میں اس وقت خاندان کے دو گھرانے اپنے اقتدار اور اثر و رسوخ کے لحاظ سے سرفہرست تھے۔ ایک میری والدہ کے ماموں زاد بھائی سعادت حسین اور دوسرے انکی بہن کے بڑے بیٹے سید ذوالفقار حسین۔ ان تمام تقریبات کا انتظام کرنا اور اس کے لئے خاندان کے ہر گھر کو چاہے اسکا سماجی مرتبہ یا مالی حیثیت کیسی ہی ہو شامل کرنا ان دونوں ہی کی خاندان پرستی اور محبت کا نتیجہ تھا۔

میں نے جو کچھ اپنی والدہ سے سنا اس کے لحاظ سے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ سعادت حسین جنہیں ہم سعادت ماموں جان کہتے ہیں، کا کنبہ اس وقت خاندان کی ''فرسٹ فیملی'' کا درجہ رکھتا تھا۔ سعادت ماموں جان میری والدہ کے بڑے ماموں سید علی اصغر صاحب کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ انہوں نے شاید ۱۹۱۸ میں انجینئرنگ پاس کی تھی اور ریلوے میں انسپیکٹر آف ورکس کے عہدے پر تعنات تھے۔ ایک زمانے میں سید علی اصغر خود بھی خاندان میں اپنے مرتبے کے حساب سے اول درجے پر تھے اور انہوں نے میری والدہ سمیت خاندان کے بہت سے لوگوں کی بڑی مدد کی تھی۔ سعادت ماموں اپنے حسن و مردانہ وجاہت کے لحاظ سے لاکھوں میں ایک تھے۔ نہ صرف انکا قد و قامت اور ناک نقش بیحد متاثر کن تھا بلکہ انکا رنگ وروپ ایسا تھا کہ وہ سفید فام قوم کے فرد لگتے تھے۔ جب وہ سفاری سوٹ پہن کر اور سولہ ہیٹ لگا کر سائیٹ پر معائینہ کے لئے نکلتے تھے تو اکثر افراد پہلے پہل انکو انگریز سمجھتے تھے۔ یہاں یہ تحریر کرنا بے محل نہ ہو گا کہ ویسے اس قسم کا رنگ وروپ میرے ننیہال میں کوئی بہت غیر معمولی بات نہیں تھی کیونکہ میرے اپنے ماموں اور بہت سے دوسرے افراد بھی ایسی ہی شکل وصورت کے حامل تھے۔

سعادت ماموں جان کا بنگلہ جودھپور کے محلّہ ''رائی کے باغ'' میں تھا اور انکے یہاں کئی نوکر چاکر تھے۔ بچوں پر علیحدہ نوکر مقرر تھے۔ گرمیوں میں کھڑکیوں دروازوں اور جالیوں پر خس کی ٹٹیاں لگائی جاتی تھیں اور ان پر ٹھنڈا پانی چھڑکا جاتا تھا۔ انکی بیگم جو خود نہایت حسین خاتون تھیں گھر اور نوکروں پر رانیوں کی طرح حکومت کرتی تھیں۔ اس پر خدا نے انہیں پانچ بیٹوں سے نوازا تھا جو خود بھی خوبرو اور بہت سی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان پانچ بھائیوں کی ایک اکلوتی بہن خورشید بانو تھیں جو اپنے بھائیوں کے ساتھ ٹام بوائے بن گئیں

تھیں اور انکی شرارتوں میں برابر کی شریک تھیں۔گھر کا معیار زندگی بہت اعلیٰ اور مغرب زدہ تھا اور تمام لڑکے اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

یہ سب بہن بھائی موسیقی سے خاص دلچسپی رکھتے تھے۔سب ہی کوئی نہ کوئی ساز بجاتے تھے اور اس کے ساتھ گاتے بھی تھے۔مہینے میں کم از کم ایک بار انکے گھر گیت وسنگیت کی محفل منعقد ہوتی تھی جو صبح تک جاری رہتی تھی۔خاندان کے اور افراد جن کو گانے کا شوق تھا وہ بھی اس میں حصہ لیتے تھے۔

کسی وجہ سے میری والدہ کی انکی بیگم سے بہت دوستی ہوگئی تھی اس کے علاوہ سعادت ماموں جان بھی اماں سے خاص محبت کرتے تھے اس لئے جودھپور کے قیام کے زمانے میں ہمارے گھر والوں کا ان سے بہت زیادہ ملنا جلنا رہا۔سلطانہ آپا بتاتی ہیں کہ ہم سب وہاں بہت شوق سے جاتے تھے اور ہماری وہاں بہت پیار سے آؤ بھگت ہوتی تھی۔مجھے متاثر کرنے کو سلطانہ آپا کہتی تھیں کہ ان لوگوں کا معیار زندگی اتنا بلند تھا کہ جب کھانے کے وقت نوکر میز پر کھانا لگا دیا کرتے تھے تو باقاعدہ گونگ بجا کر اسکا اعلان کیا جاتا تھا۔انکے لڑکے سن چالیس میں اسکیٹینگ کرتے تھے اور پروجیکٹر پر گھر ہی میں فلمیں چلا کر دیکھتے تھے یہ سب اس زمانے میں بڑی بات تھی۔ساتھ ہی پڑھائی میں اور اپنے کیریئر کی منصوبہ بندی میں بھی یہ تمام بھائی اور بہن بہت سنجیدہ تھے۔

انہی بھائیوں میں سے تیسرے بھائی سید راحت حسین نے جو خود بھی بہت خوبصورت، طویل القامت اور نہایت گورے چٹے تھے، ۱۹۴۵ء میں برٹش رائل ائرفورس میں کمیشن لیا اور انکا پائلٹ کے طور پر تقرر ہوا۔وہ پائلٹ کی وردی پہن کر، سر پر کنٹوپ اور بڑے بڑے گلاسس کا چشمہ لگا کر ہوائی جہاز اڑاتے تھے اور خاندان والے انہیں دیکھنے ایروڈروم جاتے تھے۔خاندان میں انکا بڑا چرچہ تھا۔وہ ان چند گنے چنے ہندوستانیوں میں تھے جنہیں اس وقت یہ مرتبہ حاصل ہوا کیونکہ اس سے پہلے یہ عہدہ صرف انگریزوں کے لئے مخصوص تھا۔بعد میں انکی خدمات پاکستان ائرفورس کو منتقل ہوگئیں اور انہوں نے یہاں رسال پور میں پاکستان کے اولیں فلائینگ انسٹرکٹر کے طور پر خدمات انجام دیں۔سعادت ماموں کا ایک اور بیٹا انجینئرنگ پڑھ رہا تھا اور سب سے چھوٹا بیٹا ڈاکٹری کے اول سال میں میڈیکل کالج میں داخل ہوا تھا۔بڑے دو بیٹوں نے بھی سائینس میں گریجویشن کیا تھا۔

اکلوتی بہن خورشید بانو نہ صرف بیحد حسین تھیں بلکہ بہت خوش ذوق، شعروادب کی دلدادہ، خوش بیان اور محبت کرنے والی خاتون تھیں (اور ہیں)۔میرا نام انہی کی عنایت ہے اور ساتھ ہی میرے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا اضافہ بھی انہوں ہی نے ایک نیک شگون کے طور پر کیا تھا۔خورشید آپا بھی پاکستان بننے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ گئیں اور پاکستان واپس آکر انہوں نے اپنی زندگی تعلیم نسواں کے لئے وقف کردی۔

میری زندگی کی کہانی میں اس کنبے کا ذکر اس لئے ضروری ہے کہ میری والدہ اس کنبے کا خاص طور پر تذکرہ اس زاویئے سے کرتی تھیں کہ'' سعادت بھائیجان اور انکی اولاد نے میرا بہت ساتھ دیا اور میری بڑی اخلاقی مدد کی''۔انکے خیال میں سعادت ماموں نے انکو سگی بہنوں سے زیادہ محبت دی اور انکے بیٹوں نے انکا بڑا ادب کیا۔وہ کہتی تھیں کہ اگر کبھی میرے ابّا ڈیوٹی کی وجہ سے جودھ پور سے باہر ہوتے تھے اور انہیں کوئی مشکل پیش آجاتی تھی یا کسی چیز کی ضرورت ہوتی تھی تو سب سے پہلے مدد کرنے والوں میں سعادت ماموں جان ہوتے تھے۔انہوں نے بتایا کہ کبھی کبھی تو انکی اولاد کی خاکساری کا یہ عالم ہوتا تھا کہ اگر انہوں نے کہلا بھیجا ہے کہ کہ گھر میں آٹا ختم ہوگیا ہے تو انکے نازوں میں پلے اور پڑھے لکھے بیٹے کندھے پر آٹا رکھ کر سیڑھیاں چڑھ کر ہمارے گھر آٹا دینے آتے تھے۔

ہمارے گھر میں اس بات کا بھی چرچہ ہوتا تھا کہ جب میرے بڑے بھائی اور بہن سلطان بھائیجان اور سلطانہ آپا چاہے چھوٹی جماعتوں میں ہی پاس ہوتے تھے تو سعادت ماموں کی بیگم بڑے اہتمام سے مبارکیاں لے کر آیا کرتی تھیں۔سنا ہے کہ بچپن میں سلطانہ آپا نے اپنی گڑیا کی شادی اپنی ہندو دوست شادرا کے گڈے سے کی اور یہ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تو اس میں ایک بار پھر سعادت ممانی جان نے اتنا بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کہ خاندان میں لوگ حسد سے باتیں بنانے لگے۔

اس سلسلے میں مجھے بھی پاکستان بننے کے بعد کا ایک واقعہ یاد ہے۔ شاید ۱۹۵۵ء کا زمانہ تھا جب سعادت ماموں جان کے تیسرے صاحبزادے سید رفعت حسین انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ جارہے تھے۔یہ لوگ کراچی میں تھے اور ہم میرپور خاص میں۔میں یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ رفعت بھائیجان صرف میری اماں سے ملنے، انکو خدا حافظ کہنے اور انکی دعائیں لینے میرپور خاص آئے۔انہوں نے بتایا کہ یہ سعادت ماموں جان کی ہدایت تھی کہ وہ ایسا کریں۔مجھے یہ بھی یاد ہے کہ دوسرے دن انہوں نے باورچی خانے ہی میں پیڑے پر بیٹھ کر ضد کر کے اماں کے ہاتھ کے بنے گرم گرم پراٹھوں کا ناشتہ کیا۔

میں نے ان تمام وجوہات کی بنا پر اس تمام کنبے کی ہمیشہ بہت عزت کی اور آج بھی میں سوچتا ہوں کہ ایسے فراخ دل، محبت سے بھرپور اور با مروت لوگ دنیا میں کم کم ہی ہوتے ہیں۔

پاکستان کے قیام کے بعد یہ کنبہ بکھر گیا۔سعادت ماموں جان کی پوسٹنگ کیمبل پور ہوگئی۔انہوں نے ایک دفعہ اماں کو خط لکھا کہ ماضی کی یادوں کو تازہ کرنے ایک بار پھر سب مل کر جودھ پور گھومنے چلیں۔ہم بچے بھی بہت خوش ہوئے کہ ہم بھی ان جگہوں کو دیکھیں گے۔کئی دن گھر میں اس موضوع پر جوش وخروش سے گفتگو رہی پھر یہ منصوبہ مختلف دشواریوں کی بنا پر اپنی موت آپ ہی مرگیا۔

سعادت ماموں جان کا انتقال ۱۹۷۳ء میں کراچی میں ایکسرے کے دوران ایک انجکشن کے ری ایکشن کے نتیجے میں معائنے کی میز ہی پر ہوگیا وہ

اپنے انتقال تک بیحد وجیہہ انسان تھے اور قابل رشک صحت کے مالک تھے۔اللہ تعالیٰ ان کو جنت نصیب کرے۔

ماؤنٹ آبو

راجپوتانہ جسے ہندوستان کی آزادی کے بعد راجستھان کا نام دیا گیا ایک خشک بنجر اور ریگستانی علاقے پر مشتمل ہے۔اس کے مغرب میں تھر کا عظیم ریگستان ہے جسمیں بیکانیر، بھاولپور اور سندھ کے کچھ علاقے بھی شامل ہیں۔مگر اس کا جنوب مشرقی علاقہ پہاڑی ہے اور یہاں چتوڑ، اودے پور اور ماؤلی کے اضلاع شامل ہیں۔جہاں ریگستان کی اپنی خوبصورتی ہے وہیں پہاڑوں کا اپنا حسن ہے اور اس طرح یہاں کے باشندے قدرت کی اس رنگا رنگ فطری خوبصورتی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

سن تیس اور چالیس کی دہائی میں جب ہندوستان میں سفر برائے سیاحت کا رواج عام نہیں ہوا تھا ہمارا خاندان سیاحت کا شوقین تھا۔سعادت ماموں جان کا کنبہ تو کشمیر کی سیاحت بھی کر آیا تھا۔انکے بیٹے سید رفعت حسین نے جنہیں قدرت نے مصوری کا فن ایک خداداد صلاحیت کے طور پر عطا کیا تھا سرینگر، جھیل ڈل اور برف پوش مناظر کی تصویریں واٹر کلر میں بنائی تھیں اور انکی نمائش اور پھر انکی بیش قیمت فروخت نے جودھپور میں دھوم مچادی تھی۔کئی سال بعد رفعت بھائجان کی تصاویر کی کینیڈا میں نمائیش ہوئی اور انکی نگارشات کو کینیڈا کے شہر ریجینا کے سٹی ہال میں مستقل طور پر آویزاں کیا گیا۔کینیڈا کی ریڈ کراس نے انکی کئی تصویروں کو کرسمس کارڈز کے لئے بھی منتخب کیا اور اس طرح انکے کئی ہزار ایڈیشن لوگوں تک پہنچے۔

بہر حال، کشمیر کے پہاڑوں اور وہاں کے مناظر کا حال سن کر جودھپور کے باقی عزیز و رشتہ دار ایسے ہی مناظر کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہو گئے۔انہوں نے ابھی تک پہاڑ نہیں دیکھے تھے۔کشمیر بہت دور تھا اور اس میں خرچہ بھی بہت تھا اس لئے متوسط طبقہ کے لوگوں کے لئے یہ اخراجات اور کشمیر کا سفر ممکن نہیں تھا۔

یہ تجویز پیش ہوئی کہ سب مل کر راجپوتانے کے ہل اسٹیشن ماؤنٹ آبو کی سیر کرنے جائیں۔

ماؤنٹ آبو جودھپور کے جنوب مشرق میں کوہ اراولی کے سلسلہء کہسار میں ایک پرفضا مقام ہے۔یہ سرسبز علاقے میں واقع ہے۔اس کی سب سے اونچی چوٹی ساڑھے پانچ ہزار فٹ ہے اور یہاں بادل چھائے رہتے ہیں۔انگریزوں نے جب ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کی تو اچھے موسم اور نسبتاً سرد علاقوں کی تلاش میں پہاڑوں میں موسم گرما گذارنے کے لئے ''ہل اسٹیشن'' قائم کئے جن میں شملہ جو حکومت ہند کا موسم گرما کا دارالحکومت تھا، کوہ مری اور نینی تال بڑے مشہور ہیں۔ماؤنٹ آبو، جیسا اسکے نام ہی سے ظاہر ہے، کی مقبولیت کی وجہ بھی انگریز ہی تھے۔ یہاں انہوں نے راجپوتانے کی نگرانی کے لئے انگریز حکومت کا مرکزی ادارہ قائم کیا تھا اور یہیں پولس ٹریننگ اسکول بھی تھا۔راجپوتانے کے ذی حیثیت کنبے یہاں گرمیاں گزارنے آتے تھے۔

سعادت ماموں جان کی تحریک پر تیاریاں کی گئیں اور جودھپور میں موجود ہمارے خاندان کے تمام ہی افراد کو ساتھ لیا گیا۔میری والدہ تو اس میں پیش پیش تھیں۔ایک بس کرائے پر لی گئی اور یہ لوگ عازم سفر ہوئے۔یہ سفر خاندان کے یادگار ترین سفر اور تفریح میں شمار ہوتا ہے اور اس کے تذکرے سالوں بعد بھی بار بار ایک خوشگوار یاد کے طور پر کئے گئے۔

راستے میں چلتی بس میں خوب گانے بجانے ہوئے۔جگہ جگہ رک کر پڑاؤ ڈالے گئے اور پراٹھوں اور دوسرے لوازمات کے ساتھ کھانے کھائے گئے۔بقول شخصے جنگل میں منگل ہو گیا۔

میری عمر بہت چھوٹی تھی اور مجھے اس سفر کی کوئی بات یاد نہیں۔مگر ایک چیز جو میری نسبت بہت مشہور ہوئی وہ یہ تھی کہ میں اس وقت صرف دودھ اور ڈبل روٹی ہی کھاتا تھا۔اور وقت بے وقت دودھ ڈبل روٹی کی فرمائش کرتا تھا۔اور اگر دودھ ڈبل روٹی فوراً مہیا نہیں ہوتی تھی تو بہت زیادہ ہنگامہ کرتا تھا۔اس کے ساتھ ہی میں اتنا کم عمر تھا کہ منہ سے صحیح طور پر دودھ ڈبل روٹی کا لفظ نہیں نکلتا تھا اس لئے ''ڈبل چی'' کہتا تھا۔کئی دفعہ چلتی بس رکوا کر صرف میرے لئے دودھ ڈبل روٹی کا انتظام کیا گیا۔پھر دودھ اور ڈبل روٹی خرید کر ساتھ رکھ لی گئی مگر کسی وجہ سے یہ چیزیں اور سامان کے ساتھ بس کی چھت پر رکھ دی گئیں۔اب ریگستانی علاقے میں تو سیدھی سڑک پر بس رکوانے میں کوئی مشکل نہ تھی مگر جب بس پہاڑوں پر بل کھاتی سڑکوں پر چل رہی تھی اور نیچے گہری گھاٹیاں تھیں مجھے دودھ ڈبل روٹی کی یاد آئی اور میں نے لگاتار ''ڈبل چی۔۔ڈبل چی'' کی رٹ لگانی شروع کر دی۔اُدھر لوگوں کو گھومتے وبل کھاتے راستے کی وجہ سے چکر آ رہے تھے اور انکا دل مالش کر رہا تھا اور اِدھر میں مستقل ایک ہی راگ الاپے جا رہا تھا۔یقیناً میں نے بہت نا خوشگوار ماحول پیدا کر دیا ہوگا۔آج اپنی فطرت کو جانتے ہوئے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں اس بس میں سوار ہوتا تو بہت اپسیٹ اور ناراض ہوتا۔

ایک آدھ ڈانٹ بھی پڑی۔سنا ہے اماں نے بھی دو چانٹے بھی رسید کئے مگر اس سے میرا راگ پورے والیوم پر شروع ہو گیا جو رکنے میں نہیں آتا تھا۔آخر کار بس روکی گئی جو اس پتلی بل کھاتی سڑک کے اس قدر نازک کنارے پر کھڑی تھی کہ ہر ایک کا دل دہلا ہوا تھا۔سعادت ماموں جان کے بڑے بیٹے فرحت بھائجان نے بس کی چھت پر چڑھ کر دودھ ڈبل روٹی کی باسکٹ اتاری اور مجھے مطمئن کیا گیا۔اس واقعہ سے یہ ہوا کہ میں ''ڈبل چی'' کے نام سے مشہور ہو گیا اور سالوں بعد تک میں خاندان میں ڈبل چی ہی کے نام سے پہچانا گیا۔بلکہ مجھے یہ سن کر کوئی حیرت نہیں ہوئی کہ بیس بائیس سال بعد، جب میں ڈاکٹر بنا اور خورشید آپا نے اپنے بھائی عشرت حسین سے، جو سالوں پہلے ڈاکٹر بن کر کینیڈا میں آباد ہو گئے تھے اور جنہوں نے مجھے پاکستان بن جانے کے بعد کبھی نہیں دیکھا

تھا کہا کہ فیروز ڈاکٹر بن گئے ہیں تو انہوں پوچھا ''کون؟؟'' پھر خود کہا ''ارے وہ ڈبل چی!!''

ماؤنٹ آبو پہنچ کر ایک فلیٹ کرائے پر لیا گیا۔ یہ لوگ دن میں قافلے کی صورت میں نیچے دور دور وادیوں میں تفریح کرتے اور پھر شام کو گھر پر اچھے اچھے کھانے اور انکے ساتھ مال پوئے اور گلگلے پکائے جاتے۔ رات کو گانے بجانے کی محفل یا پچیسی کی بازی جمتی۔ بادل نیچے نیچے تیر رہے ہوتے اور کبھی کبھی بادل کا کوئی بڑا ٹکڑا تیزی سے اڑتا ہوا کمرے کی ایک کھڑکی سے اندر آتا اور دوسری کھڑکی سے باہر نکل جاتا۔ کمرے کی ہر چیز نم سی ہو جاتی۔ ان لوگوں نے باڑ میر، میڑتا روڈ اور جودھپور کے ریگستان میں یہ مناظر کہاں دیکھے تھے۔ اس لئے یہ ان مناظر سے بہت متاثر اور محظوظ ہوئے اور کئی سال تک اپنی باتوں میں اس کا ذکر کرتے رہے۔

ماؤنٹ آبو میں درجنوں مندر ہیں۔ یہاں جین مذہب کی بھی کئی خانقاہیں ہیں۔ انہوں نے ''ادھر دیوی'' کا مندر دیکھا جس میں ایک مورتی اس طرح رکھی تھی کہ وہ کشش ثقل کی نفی کرتی تھی۔ اسی لئے اس کا نام ''ادھر'' تھا۔ نہ جانے کس طرح ٹکی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کمرے میں زور سے بولنے یا بہت زیادہ گہرا سانس لینے کی اجازت نہیں تھی۔

ایک دن یہ نیچے وادی میں دور تک نکل گئے یہاں ایک چھوٹی سی ندی بھی ہے۔ ماحول خوبصورت تھا ڈھلان پر گہرا سبزہ اگا تھا اور پہاڑی درختوں کا گھنا جنگل تھا کہ انہوں نے دیکھا کہ درختوں کے جھنڈ سے ایک شیر نکل آیا۔ سب کی جان نکل گئی۔ ہمارا خاندان شکار یا اسی قسم کے اور کسی معاملے میں بالکل کورا تھا۔ کسی کے پاس بندوق بھی نہیں تھی۔ مشکل سے دعائیں پڑھیں اور چھپ چھپاتے بھاگے۔ گھر آ کر لاکھ لاکھ شکرانے ادا کئے کہ ع

جان بچی تو لاکھوں پائے

جودھ پور کے قیام کے دوران یہ شاید ہمارے خاندان کی آخری اچھی تفریح تھی۔ اس کے کچھ ہی ماہ بعد برصغیر کی تقسیم کے نتیجے میں پاکستان وجود میں آ گیا۔ ہمارا کنبہ پہلے ہی جودھپور ریلوے کی ملازمت کی وجہ سے میر پور خاص میں رہائش پذیر رہا تھا اور وہ اس شہر سے پہلے ہی مانوس تھے۔ اس لئے ان سب لوگوں نے جو جودھ پور میں تھے اپنے لئے پاکستان کا انتخاب کیا اور انکی ملازمت پاکستان کی ریلوے، نارتھ ویسٹرن ریلوے کو منتقل ہو گئی۔ یہ تمام کنبے بغیر کسی ناخوشگوار واقعے کے ساتھ خیریت پاکستان ہجرت کر گئے۔ انکو کسی قسم کے تکلیف دہ تجربے سے دوچار نہیں ہونا پڑا اسی لئے پاکستان کے قیام کے سالوں بعد بھی انکے دل میں جودھ پور کی، وہاں کے راجہ اور انکی حکومت کی اور اپنے ہندو دوستوں اور پڑوسیوں کی خوشگوار یادیں زندہ رہیں اور جب بھی یہ لوگ اکھٹے ہوتے تھے تو جودھپور کا تذکرہ بڑے پیار اور چاہت سے کرتے تھے۔ مجھے تو یہ بھی یاد ہے کہ ہمارے میر پور خاص کے گھر میں جودھپور کے راجہ امید سنگھ جی کی فوجی وردی اور خوبصورت پگڑی میں ایک تصویر شاید ۱۹۵۶ء تک لگی رہی اور اماں انکی فراخ دلی اور منصفانہ فطرت کا اکثر ذکر کیا کرتی تھیں۔

نازک بانہیں مضبوط پتوار

پاکستان کے قیام کے بعد ہمارا کنبہ میر پور خاص آ گیا۔ میر پور خاص سے ہمارے کنبہ کا تعلق تو پاکستان کے قیام سے پہلے ہی سے تھا اس لئے یہ شہر ہمارے لئے جانا پہچانا تھا۔

دراصل اس کنبے کے جدامجد بابا جی بھی یہیں دفن تھے۔ مگر اس سے پہلے کہ میں میر پور خاص کے متعلق مزید کچھ لکھوں مجھے اس کا احساس ہے کہ اب تک میں نے اپنے ددھیال یعنی ڈاکٹر مظفر حسین کے گھرانے، جس سے میرے والدین الگ ہو گئے تھے، کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک دفعہ الگ ہونے کے بعد اگرچہ میری والدہ کی پرخلوص کوشش تھی کہ ہمارے کنبے کے ان سے تعلقات خوش گوار رہیں مگر دوسری طرف سے سرد مہری کا مظاہرہ تھا اور انکے برتاؤ سے یہ بات واضح تھی کہ پہلے ہی کی طرح (جس کی وجہ سے علیحدگی کی نوبت آئی تھی) وہ ہمیں سماجی طور پر خود سے کم تر سمجھتے ہیں اور میرے والد کو ڈاکٹر مظفر حسین کی سب سے بڑی اولاد ہونے کے باوجود برابر کا درجہ دینے کو تیار نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقسیم ہند سے قبل ہم ان سے تو قریب نہیں ہو سکے مگر جودھپور اور میر پور خاص کے تمام دور میں ہمیں ہمارے ننیہال نے اپنی پیار بھری بانہوں میں لئے رکھا اور میرے ابّا کے کنبے سے نہ صرف بے انتہا شفقت اور محبت کا سلوک کیا بلکہ انہیں وہ عزت اور توقیر دی جو انکا جائز حق تھا۔ میرے ننیہال کے وہ گھرانے جو اہل ثروت تھے اور جنکا رہائشی معیار بہت بلند تھا وہ بھی ہمارے استقبال میں اپنی آنکھیں بچھاتے تھے۔

ادھر ڈاکٹر مظفر حسین کے انتقال اور میرے ابّا کی شادی اور پھر علیحدگی کے بعد یہاں کنبے کی سربراہی اور مالی ذمہ داری کے لئے کوئی مرد نہیں رہ گیا تھا۔ میرے چچا ظفر عباس ابھی چھوٹے تھے اور انہیں خود سہارے کی ضرورت تھی۔ ایسی صورت میں ایک ایسی ہستی نے یہ ذمہ داری اٹھائی جنکی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ایسی ہستیاں دنیا میں خال خال ہی جنم لیتی ہیں جو اپنی ذاتی خوشیاں اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے پر قربان کر دیتی ہیں۔ انہوں نے اپنی محنت، قوت ارادی اور سب سے بڑھ کر احساس ذمہ داری کے بل بوتے پر اس چھوٹے سے گھرانے کی ڈولتی کشتی کے پتوار سنبھالے اور اپنی ذات اور اپنے مفاد کو پس پشت ڈالتے ہوئے اس گھرانے کو ایک شاندار منزل تک پہنچایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ انکی حیات پر ایک علیحدہ ناول تحریر کیا جانا چاہئے جسکا مطالعہ لڑکیوں کے لئے لازمی ہو۔

یہ تھیں میری سب سے بڑی پھوپھی، ڈاکٹر مظفر حسین کی دوسری بیوی صفدری بیگم سے پیدا ہونے والی پہلی اولاد ''سیدہ شہر بانو''

شہر بانو جنہیں میں آئندہ پھوپو لکھونگا میرے ابّا سے شاید تین سال

چھوٹی تھیں۔وہ اپنے باقی بھائی بہنوں میں سب سے بڑی تھیں۔یہ لکھنؤ کے مشہور زمانہ کالج، ازابیل تھابرن کالج میں تعلیم پارہی تھیں۔جب انکے والد ڈاکٹر مظفر حسین کا انتقال ہوا تو سارے بہن بھائی چھوٹے تھے۔ باپ کی چھوڑی ہوئی جائیداد اور دوسرا اثاثہ بھی کب تک چلتا۔انہوں نے شاید ۱۹۲۶ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ یہاں یہ واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ ازابیل تھابرن کالج کا مرتبہ اتنا بلند تھا کہ یہاں ہندوستان کے اعلیٰ ترین گھرانوں کی لڑکیاں جن میں خان بہادر اور رائے بہادر جیسے افراد شامل ہوتے تھے تعلیم پارہی تھیں۔ یہاں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک شاندار مستقبل ان لڑکیوں کا منتظر ہوتا تھا۔پھر اس زمانے میں جب کہ لڑکوں میں تعلیم کا رواج نہیں تھا ایک لڑکی کا بی اے کرنا اسکی تعلیمی صلاحیت کی معراج تھی۔ایسی حالت میں یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والی لڑکیوں کے لئے یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ انڈین سول سروس کے اعلیٰ افسران کی مائیں رشتوں کے لئے ان کے دروازوں پر کھڑی ہونگی۔ پھوپی تو اپنی تعلیم، نشست و برخواست اور شائستگی کے علاوہ صاف رنگ اور خوبصورت شکل وصورت کی بھی مالک تھیں۔ پھر وہ برٹش آرمی کے سابقہ ڈاکٹر کی بیٹی تھیں اس لئے سماجی طور پر بھی کسی سے کم نہیں تھیں۔اگر اس دور میں پسندیدہ لڑکیوں کی کوئی فہرست ترتیب دی جاتی تو یہ یقیناً سرفہرست ہوتیں۔یہ سب جانتے ہوئے بھی انکی نظر اس پر بھی تھی کہ ڈاکٹر مظفر حسین کے باقی بچے ہوئے گھرانے کی اب تمام تر ذمہ داری ان پر ہے۔انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب انکی اولیں ذمہ داری بھائی اور بہنوں کی پرورش ہے انہوں نے کمر ہمت کسی اور بقول میرے بزرگوں کے انہوں نے لڑکوں سے بڑھ کر کام کیا اور اپنے بھائی بہنوں پر ایک سائبان بن کر چھا گئیں۔

بقول شاعر

اس میں اپنے لہو کا زیاں ہی صحیح
ہم چراغوں کی لو تیز کر جائینگے

انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بمبئی سے کیا اور محکمہء تعلیم میں درمیانہ درجے کی افسرانہ ملازمت اختیار کی مگر جلد ہی انکے افسران بالا کو انکی صلاحیتوں کا علم ہو گیا اور انکی سفارش پر حکومت سندھ نے انہیں ۱۹۳۹ء میں سندھ میں لڑکیوں کے نظام تعلیم کی بنیاد رکھنے کے لئے ایک اعلیٰ عہدے کی پیشکش کی۔جب یہ سندھ آئی ہیں تو پورے صوبہ سندھ میں یہ واحد اور اعلیٰ ترین تعلیم یافتہ مسلمان خاتون تھیں۔اس بات پر ہمیں آج بھی فخر ہے کہ سندھ میں تعلیم نسواں کی بانی شہر بانو تھیں۔انہیں یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ ہمارے تمام خاندان میں سب سے پہلے یعنی ۱۹۴۰ء میں انہوں ہی نے کار خریدی۔ یہ پردہ کرتی تھیں اس لئے خود ڈرائیو نہیں کرتی تھیں۔انہیں ایک ڈرائیور کی خدمات حاصل تھیں۔انکے ساتھ انکے بھائی ظفر عباس چچا اور چھوٹی بہن قمر بانو بھی کراچی آ کر بس گئے تھے۔چونکہ یہ گھرانہ تقسیم ہند سے بہت پہلے کراچی آ گیا تھا اور خاندان کے باقی لوگ مراد آباد، جودھ پور اور میر پور خاص میں آباد تھے اس لئے یہ لوگ باقی خاندان میں ''کراچی والے'' مشہور ہو گئے۔شہر بانو پھوپھی نے کراچی میں اپنی ملازمت کے حوالے سے ایک قابل رشک دور گذارا اور سن ساٹھ کی دہائی میں انسپکٹریس آف گرلز اسکول کے عہدے سے ریٹائر ہوئیں۔جب انہوں نے اپنے کنبے کی ذمہ داری سنبھالی تھی اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

انہوں نے کبھی شادی نہیں کی اور تمام عمر اپنے بہن بھائی اور انکی اولاد پر محبت اور شفقت نچھاور کرتے گذار دی۔موجودہ نسل میں انکا جو مرتبہ ہے اور انہیں جس عزت سے یاد کیا جاتا ہے وہ کسی اور کو نصیب نہیں۔

میرے چچا سید ظفر عباس اور میری چھوٹی پھوپھی قمر بانو نے کراچی ہی میں تعلیم پائی اور قمر بانو نے کراچی سے ۱۹۴۸ء میں ایم اے کیا۔یہ بھی اس وقت کے لحاظ سے بڑی بات تھی کہ اس وقت صرف گنی چنی خواتین ہی یہ اعزاز حاصل کرتی تھیں۔انہوں نے بھی اپنی تمام زندگی تعلیم نسواں کے لئے وقف کر دی اور پہلے گورنمنٹ گرلز کالج، پھر اسلامیہ کالج اور آخیر میں پی ای سی ایچ ایس کالج کے پرنسپل کے عہدے سے ریٹائر ہوئیں۔ پی ای سی ایچ ایس کالج میں یہ اپنے روائیتی لباس کی وجہ سے غرارے والی پرنسپل مشہور تھیں۔انہوں نے بھی ایک تابناک روائیت اپنے پیچھے چھوڑی اور انکے شاگرد انہیں آج بھی عزت سے یاد کرتے ہیں۔

کراچی میں ان لوگوں کا گھر صدر میں تھا۔گھر میں داخل ہوتے ہی ڈرائنگ روم کے بڑے داخلی دروازے کے اوپر میرے دادا کی فوجی یونیفارم میں تصویر لگی تھی۔میری دونوں پھوپھیوں کی شادی نہیں ہوئی تھی اس لئے یہ اور ظفر عباس چچا کا کنبہ ایک ساتھ اس گھر میں رہتا تھا مگر مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی بھی اس گھر میں مہمان کے طور پر ایک رات بھی گذاری ہو۔اسی طرح جب ہم ہر سال کراچی آتے تھے تو کراچی میں ہمارے کئی ہفتوں کے قیام کے دوران ہم اس گھرانے میں ایک وقت کے کھانے پر بھی کبھی مدعو نہیں کئے گئے۔اس بات کو زبان پر لائے بغیر یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ ہمارے اور ہمارے دادا کے باقی گھرانے کے درمیان تعلقات کی یہی نوعیت ہے اور اسے ایسے ہی قبول کر لیا جائے۔اپنی تہذیب اور روایت کی پاسداری کرتے ہوئے ہم انہیں سلام کرنے اور ان سے ملنے ضرور جاتے تھے اور وہ مختصر وقت اچھا گذرتا تھا۔

ٹی نائین اے

پاکستان کے وجود میں آنے کے فوراً بعد ہمارا پورا خاندان جو جودھپور ریلوے سے وابستہ تھا اور میر پور خاص سے پہلے ہی سے واقف تھا میر پور خاص آ گیا۔انکی ملازمتیں بھی نارتھ ویسٹرن ریلوے میں منتقل ہو گئیں اور یہ تقسیم کی اکھاڑ پچھاڑ سے بالکل متاثر نہیں ہوئے۔ بعد میں ان میں سے بہت سے خاندان کراچی چلے گئے۔

اگرچہ مجھے میر پور خاص کی زندگی ٹھیک طرح ۱۹۵۱ء کے بعد سے ہی یاد ہے مگر پھر بھی کچھ مٹی مٹی سی یادیں اور باتیں ہیں جو میرے ذہن میں گردش

کرتی ہیں۔اس پر یہ کہ چونکہ میرا گھرانہ ماضی پرست ہے اور گذرے وقت کو ہمیشہ بہت پیار اور اچھے الفاظ میں یاد کرتا ہے اس لئے بہت سی باتیں کئی دفعہ سننے کی وجہ سے بھی میرے ذہن میں واضح ہوگئی ہیں۔

ہم لوگ ۱۹۴۷ء ہی میں میرپور خاص جواب پاکستان میں تھا آ گئے تھے۔میرے اماں ابّا کے کنبے کے علاوہ جو اور کنبے یہاں آئے ان میں میری والدہ کے کزن سعادت حسین، انکے بھانجے سید ذوالفقار حسین، انکی نند حسن بانو اور انکے سب سے بڑے بھائی ظفر محمد قریشی اور بڑی بہن مشتری خالہ بی کا گھرانہ شامل تھا۔ظفر محمد کے سوا یہ سب لوگ ریلوے کے اعلیٰ افسر تھے اس لئے بہت تھوڑے عرصے کے لئے یہ تمام لوگ جس میں میرا اپنا کنبہ بھی شامل تھا ریلوے کے اعلیٰ درجے کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے۔اس ریسٹ ہاؤس کی یادیں بھی لوگوں کے ذہن میں خوشگوار تاثر چھوڑتی ہیں کہ مل جل کر مزے مزے کے کھانے پکتے تھے اور گانے بجانے کی نشستیں ہوتی تھیں سب سے پہلے سعادت ماموں جان کو ایک بنگلہ الاٹ ہوا، اسکے بعد ذوالفقار بھائجان اپنے بنگلے میں منتقل ہو ئے۔پھر سب اپنے اپنے ٹھکانے لگ گئے۔اس دور کی قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہمارے خاندان میں تعلیم کی اس وقت بھی بہت اہمیت تھی۔اس نوزائدہ ملک میں ہر چیز بے ترتیب اور تمام نظام درہم برہم تھا جس کی وجہ سے بچوں کے اسکول بھی نہیں تھے اس لئے سعادت ماموں جان کے بنگلے میں تمام بچوں کے لئے عارضی سکول قائم کیا گیا اور خورشید آپا نے خاندان کی دوسری خواتین کے ساتھ مل کر جس میں کشور آپا اور ثریا آپا شامل تھیں ہر روز کلاسیں منعقد کرنا شروع کیں۔سب بچے مل کر جوش سے پہلے ایک حمد اور پھر اقبال کا ترانہ گاتے تھے۔

اسی دوران میرا کنبہ ریلوے کالونی میں حیدر آباد جانے والی گاڑیوں کے اسٹیشن کے بالکل سامنے ایک کوارٹر میں جسکا پتہ ٹی نائین بی تھا منتقل ہوگیا۔ہمارا گھر ٹی نائین بی (جس میں رہنا مجھے بالکل یاد نہیں) ریلوے کالونی کی عام ڈیزائننگ کے لحاظ سے کچھ انوکھا تھا۔سب ہی کو معلوم ہے کہ انگریزوں کی تعمیر کی گئی ایسی کالونیاں چاہے وہ ریلوے ملازمین کی ہوں یا پولس کی ایک ہی جیسے قطار میں بنے ہوئے کوارٹروں پر مشتمل ہوتی ہیں۔قطار میں دیوار سے ملی دیوار کے ساتھ پندرہ بیس مکان ہوتے ہیں اور انکے دروازے بھی جڑے جڑے ہوتے ہیں۔ہمارا یہ گھر دراصل امریکی اصطلاح میں ایک ڈیوپلیکس تھا۔یعنی صرف دو ہی مکان تھے جو بالکل ایک جیسے تھے اور وہ دونوں مکان ایک درمیانی دیوار سے جڑے تھے۔اس کے علاوہ مکان سے منسلک باہر کی طرف ایک ہوادار ٹریس تھا اس ٹیریس کے چاروں طرف لکڑی کی جالیاں تھیں اور اس پر امریکی طرز کے SUN ROOM کی طرح ایک ہلکی چادر کی چھت تھی۔ہمارے پڑوس میں اس وقت بھی ایک ہندو گارڈ للّو پرساد رہتے تھے مگر انکا ارادہ چند ہی روز میں ہندوستان جانے کا تھا۔انکے مکان کا نمبر ٹی نائین اے تھا۔یہ دونوں مکان بالکل ایک ہی جیسے تھے بس جیسے آئینے میں عکس الٹا دیا جاتا ہے صرف ایسا ہی فرق ان دو گھروں میں تھا۔مگر جو ایک بہت بڑا فرق اور بھی تھا وہ یہ تھا کہ للّو باوَجی کے گھر میں بجلی کی سہولت تھی جو ٹی نائین بی میں نہیں تھی۔للّو باوَجی نے ہم سے کہا ''میں جیسے ہی جاؤں تم لوگ اس میں آ جانا'' بلکہ وہ اس قدر شریف طبع انسان تھے کہ انہوں نے کہا کہ میں تو اکیلا ہی ہوں اور میرے پاس کچھ سامان بھی نہیں اس لئے تم لوگ ابھی سے تھوڑا تھوڑا سامان اس گھر میں رکھنا شروع کردو تا کہ میرے جاتے ہی تم اس پر قبضہ کرسکو۔ایسے ہی ہوا اور جیسے ہی للّو پرساد جی وہاں سے رخصت ہوئے میرے اماں ابّا اپنے چار بچوں کے ساتھ (میری سب سے چھوٹی بہن دردانہ پیدا نہیں ہوئی تھی) اس میں منتقل ہوگئے۔اس کے بعد ہمارا گھرانہ اس گھر میں یعنی ٹی نائین اے میں اتنا عرصہ رہا کہ بہت سے لوگ کہتے تھے کہ ریلوے کو یہ گھر آپ ہی لوگوں کو دیدینا چاہئے۔میرے امریکہ آنے کے بعد بھی میرے بھائجان سید سلطان عالم اس میں رہتے تھے اور میرے میرپور خاص کے دوست مجھے چھیڑ کر کہتے تھے کہ اس پر تو حکومت کی طرف سے ایک یادگاری تختی لگنی چاہئے کہ یہ سید ابن عباس کے کنبے کی رہائش گاہ تھی۔میں آج کیلی فورنیا میں بھی رہتے ہوئے یہی سوچتا ہوں کہ ہمارا اصلی گھر تو وہی ٹی نائین اے ہے جہاں ہم نے زندگی کے اہم ترین سال گذارے۔میں کبھی کبھی سنجیدگی سے یہ سوچتا ہوں کہ اگر کبھی میری یادداشت میں ایسا نقص پیدا ہوا جیسے الزہائیمر کی بیماری میں پیدا ہوتا ہے کہ قریبی یادداشت گم ہوجاتی ہے مگر دور کی یاد داشت سلامت رہتی ہے اور کسی نے یکا یک نیند سے جگا کر مجھ سے میرے گھر کا پتہ پوچھا تو میں امریکا میں رہتے ہوئے بھی یہی کہوں گا کہ ''ٹی نائین اے'' ریلوے کالونی میرپور خاص سندھ۔

کھٹمل

کراچی کے کھٹمل بڑے تیز ہیں
خُرپ چال چلنے میں انگریز ہیں
یہ کھٹمل کہ ''شب خوں'' ہے ان کا اُصول
مناتے ہیں راتوں میں ''اپریل فول''
یہ کھٹمل کہ ہیں سخت عاشق مزاج
حسینوں کی محفل میں کرتے ہیں راج
یہ کھٹمل کہ ہیں غیرتِ شیرِ نَر
کِیا اچھے اچھوں کو چت فرش پر
یہ کھٹمل منظّم ہیں میرے خلاف
الٰہی! خطا میری کردے معاف

شبنم رومانی کی مثنوی سیرِ کراچی سے انتخاب

''معنی اور تناظر''

ڈاکٹر وزیر آغا

(●)

اردو زبان وادب کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اسے اوائل زمانے سے ہی کشادہ ذہن اور روشن فکر کے حامل اہلِ قلم کی ایک طویل کہکشاں میسّر رہی ہے۔ سرسید کے نامِ نامی سے فہرست مرتب کی جائے تو ایک ضخیم کتاب وجود میں آ سکتی ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا اِسی کشادہ ذہن اور روشن فکر کے تسلسل کا ایک نمایاں نام ہے جن کے دم قدم سے اردو شاعری' نثر اور تنقید نے بے پناہ نئے زوایئے تلاشے' تراشے اور اردو ادب کی تمام اصناف کو نئی جہت اور نئے خطوط پر استوار کیا۔

ڈاکٹر صاحب کی رحلت اس قدر بڑا سانحہ ہے کہ اہلِ علم وادب ڈاکٹر وزیر آغا کے خلاء کو مدت تک محسوس کریں گے اور ڈاکٹر وزیر آغا کے استوار کردہ نئے خطوط اور زوایوں سے روشنی ورہنمائی حاصل کرتے رہیں گے۔

ذیل کی سطور میں ہم ''معنٰی اور تناظر'' کے عنوان سے ڈاکٹر وزیر آغا کی ایک مطبوعہ تحریر نذرِ قارئین اس خواہش کے ساتھ کر رہے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے علم وادب کی جو شمع روشن کی تھی اُسے روشن تر رکھنے کے لیے ڈاکٹر وزیر آغا کے علمی وادبی کارناموں سے خود بھی رہنمائی حاصل کریں اور نوجوان اہلِ قلم کو بھی اس جانب مسلسل راغب کرتے رہیں.....ادارہ

فن کا طرہ امتیاز ہے.....قوس! اور غیر فن کا.....لکیر! اور قوس اور لکیر کا یہی فرق شعر کو نثر سے جدا بھی کرتا ہے۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ کیا ہر شعر واقعی شعر ہوتا ہے اور کیا ہر نثر پارہ فن کے دائرے سے لازمی طور پر خارج متصور ہوسکتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ شعر ہو یا نثر پارہ یہ اسی حد تک فن کا مظہر قرار پائے گا جس حد تک اس میں فن کی روح یعنی قوس کا انداز شامل ہوگا۔

لکیر کی جہت مستقیم ہے۔ لہٰذا کچھ پتہ نہیں کہ یہ کس منزل تک لے جائے گی۔ لے بھی جائے گی کہ نہیں۔ لیکن قوس میں خم ہے' موڑ ہے' اپنے ازل کی طرف لوٹنے کا انداز ہے۔ اس کی منزل خود اس کے اندر موجود ہے کیونکہ یہ ہمہ وقت اپنی ہی جانب لوٹ رہی ہوتی ہے۔

فن اپنی طرف سے لوٹنے کا ایک وظیفہ ہے۔ اندر کے ان دیکھے جہان کو صورت پذیر کرنے کی ایک کاوش ہے۔۔۔۔''ان دیکھا'' اس لئے کہ مرئی شے ہی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ جب'' شے'' غیر مرئی ہو' ایک بے خدوخال احساس یا تجربے کی صورت میں ہو تو اس کو حسیات کی مدد سے نشان زد کرنا کیسے ممکن ہے؟ اس سب کے باوجود فن اس چھوئی موئی کو صورت پذیر کرنے کی ایک دلکش کاوش ہے۔ اس عمل میں وہ جس حد تک کامیاب ہوا اتنا ہی اعلیٰ متصور ہوتا ہے۔

اندر کے بے خدوخال احساس کا ذکر کر کے میں داخل اور خارج کو ایک دوسرے کا حریف بنا کر پیش نہیں کر رہا یعنی غائب کو ظاہر سے جدا نہیں کر رہا۔ خارج بھی دراصل داخل ہی کا ایک رنگ ہے بلکہ خارج بجائے خود وہ داخل ہے جو صورت پذیر ہو چکا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ظاہر' غائب کی ضد نہیں بلکہ غائب کی توسیع اور تجسیم ہے۔ دوسری طرف انسان کو سزا یہ ملی کہ اسے قوس سے محروم کر کے لکیر کے سپرد کر دیا گیا۔ چنانچہ اس کا مقدر ایک معنی کا مطیع ہونا قرار پایا۔ مگر انسان نے اس پابندی کو قبول کرنے کے دوران بھی گاہے ماہے اس سے آزاد ہونے کی کوشش کی۔ اس کی یہ کوشش قوس کی صورت میں ظاہر اور فن کی صورت میں مجسم ہوئی۔ اگر وہ سیدھی لکیر کی گرفت سے آزاد ہو کر قوس کا انداز اختیار نہ کرتا تو کبھی کائنات کے تخلیقی عمل کے علی الرغم ایک ثانوی تخلیقی عمل کا مظاہرہ نہ کر پاتا اور اسی لئے کبھی فن کے مدار میں داخل نہ ہوسکتا۔

کائنات کے کینوس پر بھی قوسیں ہی قوسیں نظر آتی ہیں۔ ہر کہکشاں اپنے محور پر گھومتی دکھائی دیتی ہے یعنی ایک ایسے مرکزے کے گرد جو ایک بے نشان بلیک ہول ہے۔ اس کے علاوہ وہ کہکشاؤں کے کسی ایک کنبے میں شامل ہو کر کسی اور مرکزے کے گرد گھومتی ہوئی بھی نظر آتی ہے اور یہ مرکزہ کہکشاؤں کی معیت میں کسی اور مرکز کے گرد طواف کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ساری کائنات ایک کبھی نہ ختم ہونے والا طواف ہے جو کسی بے پایاں ان دیکھے مرکز کے گرد ہو رہا ہے۔ کائنات کا سفر باہر کی طرف یقیناً ہے مگر یہ سفر بھی سیدھی لکیر کے بجائے قوسوں یا Spirals کی صورت میں ہے۔ اپنے نظام شمسی پر ایک نظر ڈالیں تو ہمیں تمام سیارے سورج کے گرد طواف کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ چکر سا لگا کر سورج کے قریب تو آتے ہیں مگر اس کے روشن ہالے کو چھو کر لوٹ بھی جاتے ہیں۔ اگر وہ کبھی اس ہالے کو توڑ کر اندر آ جائیں تو سورج کی تمازت میں جل کر راکھ ہو جائیں۔ صوفی راکھ ہو جانے کے اس عمل کا والہ وشیدا ہے اور اس لئے اسے پروانے کی تمثیل بہت عزیز ہے۔ مگر فنکار طواف کا دلدادہ ہے' چھو کر اور یوں خود کو متوّر کر کے لوٹ جانے کا متمنی ہے تاکہ بار بار آ سکے۔ اسے وصال سے زیادہ Love Play عزیز ہے۔ مگر ان دونوں میں ایک اور فرق بھی ہے۔ صوفی قطرے کی صورت دجلے میں جذب

ہونے ہی کو سب کچھ سمجھتا ہے مگر فنکار تلمیذ الرحمٰن ہے۔ وہ کائنات کے تخلیقی عمل کے متوازی خود بھی ایک تخلیقی عمل کا مظاہرہ کرتا ہے اور جو کچھ اسے قریب آنے پر ''دِکھتا'' اور محسوس ہوتا ہے اسے صورتوں اور تمثیلوں میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔ بالکل جس طرح آفاقی سطح پر ''وجود'' نے اپنے عظیم تخلیقی عمل کے ذریعے ''موجود'' کی حامل ایک بوقلموں کائنات کو صورتوں، شبیہوں اور استعاروں میں ڈھال کر پیش کر دیا تھا۔

فن کے کینوس پر نمودار ہونے والی ہر صورت اور شبیہہ ایک دستخط ہے۔ یہ دستخط باطن کا علامتی اظہار ہے مگر عام دستخط کی طرح اس کا معنی متعین نہیں ہے۔ عام کاروباری دستخط اصلاً ایک ایسا نشان ہے جس کا صرف ایک معنی ہے۔ اگر وہ اس معنی سے دست بردار ہو کر کثیر المعنویت کا مظاہرہ کرنے لگے تو اس کی کاروباری حیثیت صفر ہو کر رہ جائے۔ کاروباری دستخط کی سچائی اس کی شفافی Transparency میں ہے۔ اس کے عقب میں اس ہستی کا چہرہ صاف نظر آنا چاہیے جس کا یہ دستخط ہے لیکن اگر عقب میں موجود ہستی بے چہرہ ہو تو پھر عام کاروباری دستخط یعنی مسودہ یا چیک پر نمودار ہونے والا دستخط اس کی نمائندگی کا دعوی کیسے کر سکتا ہے! مگر ادب کے مدار میں داخل ہوتے ہی دستخط منقلب ہو جاتا ہے۔ بظاہر تو وہ تصنیف پر مصنف کی ملکیت کو ظاہر کرتا ہے مگر بباطن مصنف کے اسلوبِ اظہار بلکہ اسلوبِ ذات کا اعلامیہ بن جاتا ہے۔ یعنی اپنے یک معنوی وجود کی توسیع کر کے اسے علامتی مفہوم عطا کر دیتا ہے۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہر تصنیف بجائے خود اس کے مصنف کا دستخط ہے۔ اب اس دستخط کے عقب میں جو ہستی ایستادہ ہے وہ محض مصنف کی ہیکل نہیں بلکہ اس کا وہ غیر شخصی وجود بھی ہے جو متعدد کوڈز (Codes) اور کنونشنز Conventions کا آمیزہ ہے جس میں لاتعداد ثقافتی ابعاد باہم آمیز ہو گئے ہیں۔ انسان کی یادداشت اور اس کے خواب، اس کی اجتماعی آرزوئیں اور اس کے آرکی ٹائپل امیجز یعنی اس کا سارا ثقافتی نسلی سرمایہ اس دستخط کے اندر سما گیا ہے، بلکہ اس میں وہ سب کچھ بھی موجود ہے جس تک انسان کی رسائی کبھی کبھار ہی ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا پُر اسرار براعظم ہے جس کے ساحلوں پر کئی کولمبس اور واسکوڈے گاما مبہوت کھڑے اس کے اندر کی دنیا میں اترنے کا سوچ رہے ہیں۔ لہٰذا ایک بات تو یہ ہے کہ مصنف نہ صرف دوسروں کے روندے ہوئے راستوں پر سفر نہیں کرتا بلکہ وہ بعض اوقات ایسے منطقوں میں بھی چلا جاتا ہے جنہیں پہلے کسی انسان کے قدموں نے چھوا تک نہیں تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مصنف اگلوں کے لکھے ہوئے میں اضافہ ضرور کرتا ہے مگر اس معاملے میں بھی وہ اینٹوں کی زیرِ تعمیر دیوار پر اپنے حصے کی اینٹ نہیں رکھتا بلکہ ''اصل'' اور ''اضافہ'' دونوں کو باہم آمیز کر کے ان کو تقلیب یا Metamorphosis سے گزارتا ہے وہ پوری دیوار کو پہلے منہدم کرتا ہے اور پھر اس کے سارے کچے مواد یعنی Raw Material سے (جو خراج کی ایک صورت ہے) از سرِ نو دیوار کو اسارتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو اس کی حیثیت محض ایک معمار کی ہوگی فنکار کی ہرگز نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تقلیب کے بغیر نیا فن پارہ وجود میں آ ہی نہیں سکتا اور یہ تقلیب صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ مصنف اپنی ذات میں موجود زبان کی ''یونیورسل گرائمر'' کے علاوہ ثقافتی مواد نیز اس نسلی مواد تک بھی رسائی حاصل کرے جو بنی نوع انسان کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ ایک عظیم فنکار اس سے بھی پیچھے اس منطقے تک پہنچتا ہے جو اپنی جگہ ایک بے خدوخال جہان ہے۔ جس طرح تصنیف میں پارول کا تنوع تو دکھائی دیتا ہے۔ لیکن وہ لانگ (Langue) نظر نہیں آتی جو اس کی بنت کاری کی محرک ہے اسی طرح مصنف کو بھی وہ ساخت دکھائی نہیں دیتی جو اس کی تخلیق کاری کی محرک ہے۔ تاہم وہ اسے وہبی طور پر محسوس ضرور کرتا ہے۔ مصنف کے لئے لازم ہے کہ وہ نہ صرف شعریات یا Poetics کی حامل اس ساخت کو اس کے وسیع تری ابعاد کے ساتھ قبول کرے اور محض اس سے اکتساب تک محدود نہ رہے بلکہ اس کے اندر جذب ہو کر اسے اپنی واردات بھی بنائے۔ صرف اسی صورت میں وہ صحیح معنوں میں تخلیق کر سکے گا۔

جو لوگ تصنیف سے اس کے مصنف کو منہا کرتے ہیں اور تمام تر اہمیت تصنیف یا قاری کو دیتے ہیں وہ تصویر کا صرف ایک رخ ہی دیکھتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ مصنف اپنی تصنیف میں اسی طور موجود ہوتا ہے جیسے گرائمر بطور ایک سسٹم جملوں کے اندر کارفرما ہوتی ہے۔ یہ مصنف محض گوشت پوست کی ایک ہستی نہیں جس کا ایک نام اور پیشہ بھی ہے بلکہ وہ بہت سی سطحوں کا حامل ایک Construct ہے جب یہ کہا جاتا ہے کہ مصنف تصنیف کی بنت میں شامل ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی شخصی حیثیت کے علاوہ اپنی انسانی اور آفاقی حیثیت میں بھی شامل ہے اور اسی لئے تصنیف محض ایک معنی تک محدود نہیں بلکہ کثیر المعیاتی ہے۔ مصنف کی شخصی زندگی کی چھوٹ پڑنے سے تصنیف کا جو معنی مرتب ہوتا ہے وہ بالعموم اکہرا اور سپاٹ ہوتا ہے اور بعض اوقات جب مصنف کسی خاص آئیڈیالوجی، نظریے یا مسلک کے تابع ہو تو یہ معنی متن پر اسی طرح منطبق ہو کر ''نشان'' بن جاتا ہے جیسے ''نام'' شخص پر منطبق ہو کر محض ایک معنی کا حامل قرار پاتا ہے۔ مگر مصنف کی ذات کے اندر متعدد سطحوں کا ایک پردہ در پردہ عالم بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنی تصنیف میں محض بالائی سطح کے معنی تک محدود نہیں رہتا بلکہ داخلی سطحوں سے ہو کر تصنیف کو بھی کثیر المعیاتی بنا دیتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ سامنے کے معنی کے اندر سے پھوٹنے والا ثانوی معنی پہلے معنی کو مٹا دیتا ہے۔ ہوتا فقط یہ ہے کہ تناظر یا Context کی تبدیلی سے معنی میں وسعت آجاتی ہے۔ دریدا سے یہ بات منسوب ہے کہ

Meaning is context bound but context is boundless

مراد یہ ہے کہ تناظر کے بغیر کوئی معنی مرتب نہیں ہو سکتا مگر کوئی تناظر حدود میں مقید نہیں ہوتا۔ اس کے اندر سے کوئی نہ کوئی چوتھا کھونٹ ضرور جھلکتا ہے

جوایک نئے تناظر کو وجود میں لاکر معنی میں توسیع کر دیتا ہے۔طبیعات کے سلسلے میں دیکھئے کہ انیسویں صدی کے آخر تک نیوٹن کا کشش ثقل کا تصور ہر شے پر محیط تھا مگر بیسویں صدی میں جب ذرّے کے اندر جھانکا گیا تو وہاں کشش ثقل کی قوت کے بجائے نیوکلر قوت دکھائی دی۔آج صورت یہ ہے کہ کائنات اکبر یعنی Macrocosm میں نیوٹن کی کائنات کا تصور درست ہے جب کہ کائنات اصغر(Microcosm) میں کوانٹم طبیعات کا!

کچھ یہی صورت تناظر کی تبدیلی سے معنی کی کائنات میں بھی درآتی ہے۔مصنف کی شخصی حیثیت کے تناظر میں جو معنی مرتب ہوتا ہے وہ اس Context میں تو درست ہے مگر مصنف کی انسانی حیثیت کے تناظر میں یہ معنی تبدیل ہو جائے گا اور تناظر کے دیگر دائروں میں متواتر تبدیل ہوتا جائے گا مگر اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہ ہوگا کہ کسی ایک تناظر کے اندر جو معنی پیدا ہوا تھا وہ مسترد ہو جائے گا۔کیونکہ اپنے تناظر کے اندر اس کا وجود بدستور رہے گا۔لہٰذا اس بات کا تمام تر دارومدار قاری پر ہے کہ وہ خود کو کسی ایک تناظر تک محدود کر کے ایک خاص معنی تک رسائی پاتا ہے یا اس تناظر کو عبور کر کے معنی کے نئے سلسلوں سے متعارف ہوتا ہے۔

معنی' جیسا کہ اوپر ذکر ہوا' تناظر سے مشروط ہے۔اگر تناظر تبدیل ہوگا تو لامحالہ معنی میں بھی کشادگی در آئے گی۔دیکھا جائے تو معنی آفرینی کا یہ عمل بیک وقت تصنیف کا بھی امتحان ہے اور قاری کا بھی! تصنیف کا اس اعتبار سے کہ کیا اس کا تناظر اکہرا اور معنی متعین ہے یا اس تناظر کے اندر وہ شگاف یا Rupture موجود ہے جو تصنیف کے دیگر ابعاد تک پہنچنے میں مدد دیتا ہے؟ ایک اعلیٰ تصنیف شگاف در شگاف اور اس لئے تناظر در تناظر ہوتی ہے' چنانچہ اس میں کوئی اکلوتا معنی نہیں ہوتا بلکہ معانی کے سلسلے موجود ہوتے ہیں۔ہر معنی نے ایک نسبتاً گہرے معنی کو دبایا ہوتا ہے۔جب تناظر تبدیل ہوتا ہے تو گویا متعین معنی کا بوجھ ہٹتا ہے اور اس کے نیچے سے ایک اور معنی نمودار ہوتا ہے۔

دوسری طرف معنی آفرینی کا یہ عمل قاری کے لئے بھی ایک امتحان ہے کیونکہ اگر قاری کے ہاں شگاف تلاش کرنے اور پھر اس میں سے گزر کر دوسرے تناظر میں چلے جانے کی تخلیقی صلاحیت نہیں ہے تو پھر وہ ایک معنی تک ہی محدود رہے گا اور تصنیف کے اکہرے پن سے مطمئن نظر آئے گا۔لیکن اگر وہ تخلیقی طور پر فعال اور متجسس ہوگا تو پھر اسے ایک کثیر المعیناتی فضا میں قدم بہ قدم بہت دور تک جانے کا موقع ملے گا اور وہ تصنیف کی کائنات کے اندر سرگرم ہو سکے گا۔

مصنف جب تخلیقی کاری میں مبتلا ہوتا ہے تو تصنیف کے کچے مواد کو جو باہر کی دنیا میں قاش قاش بکھرا پڑا ہے سمیٹ کر ایک نقطہ پر مرتکز پھر ''منقلب'' کرتا ہے۔۔۔۔نقطہ جو اس کی ''خواہش'' کا مرکز ثقل ہے۔حقیقتاً ''خواہش'' بجائے خود ایک کائنات ہے جس کی کوئی حد نہیں ہے۔بدھ مت والوں نے اسے سنیاتا' کہا تھا' جس کا مطلب تھا ''اندر سے خالی'' اور چینیوں نے اسے تاؤ Tao کہا تھا جس کا مطلب بھی ''اندر سے خالی'' تھا مگر اندر سے خالی کا مفہوم ''خلا'' نہیں تھا۔اس سے مراد یہ تھی کہ اندر کا خالی پن ایک ایسی زبردست قوت کے طور پر موجود ہے جو Spasmodic Contractions کے عمل میں مبتلا ہو کر ''باہر'' کو جرعہ جرعہ اپنے اندر اتار رہا ہے۔مصنف جب تخلیق کاری میں مبتلا ہوتا تو اس کے اندر کی خواہش جو تہ در تہ خالی پن ہے باہر کے مواد کو اپنی طرف لگا تار کھینچتی ہے۔تصنیف کے تناظر کے اندر ایک اور تناظر کا نمودار ہونا خواہش کی اس کشش ہی کے باعث ہے۔چونکہ خواہش جسم کے تقاضوں سے لے کر نفسیاتی' روحانی اور لاشعوری تقاضوں تک پھیلی ہوتی ہے لہٰذا اس کی کارکردگی سے جو تناظر ابھرتے ہیں وہ بھی معنی کے کئی سلسلوں کو جنبش میں لاتے ہیں۔تاہم ایک بات واضح ہے کہ اگر خواہش شعوری اور جسمانی ہے تو اس سے پیدا ہونے والا تناظر اور اس کا معنی بھی اکہرا ہوگا اور اگر خواہش لاشعوری ہے تو پھر اس سے نمودار ہونے والے منظر ناموں اور معانی کے سلسلوں کی بھی کوئی حد نہیں ہوگی۔

بقیہ
جھوٹن

عورتوں کی جیل کہنے کو تو صِرف عورتوں کے لئے ہی ہے۔سارا عملہ بھی عورتوں پہ ہی مشتمل ہوتا ہے۔یہ اور بات تھی کہ اُس نے ایسی عورتیں پہلے نہیں دیکھی تھیں۔صِنفِ نازک کو صِنفِ کرخت کے روپ میں دیکھنا بھی ایک تجربہ ہی تھا۔نسوانیت کی اگر کُچھ مخصوص نشایاں نہ ہوتیں تو شاید اُسے یقین ہی نہ آتا کہ عورتیں ایسی بھی ہو سکتی ہیں۔اُن کی بول چال اور گالی گلوچ ہی اُن کی ''نسوانیت'' کا بھانڈا پھوڑ دینے کو کافی تھی۔وہ ''مردمار'' عورتیں بھی مردوں کے اِس بنائے ہوئے نظام میں مردوں کے احکامات کی پابند تھیں۔جب ایک رات اُسے پولیس کے اِک اعلیٰ افسر کے خاص بنگلے پہ پہنچایا گیا تو اُسے مطلق حیرت نہ ہوئی۔افسرِ اعلیٰ کے حسبِ منشا جب وہ اپنی 'خدمت' بجا لائی تو وہ خوش ہو کے، شاہانہ انداز میں اُس کی کہانی سُننے پہ آمادہ ہو گئے کہ کبھی کبھار وہ بھی انعام واکرام دینے کے موڈ میں ہوتے تھے۔آخر میں اُسکی کہانی سُن کے حیران ہونے کی باری تو اُن کی تھی۔وہ غُصے میں دانت پیس کر رہ گئے۔دھوکا اور وہ بھی اُن کے ساتھ۔یعنی چھوٹے بڑے کا نہ تو پاس کیا گیا اور نہ ہی حسبِ مراتب کا خیال ملحوظ رکھا گیا۔۔جیل میں متعین عملے کے اُن چار ماتحتوں کو اگلے ہی روز اپنے 'اعمال' کا خمیازہ، معطلی کی صورت بھگتنا پڑا، جنھوں نے 'اُسے' اُن تک پہنچانے سے پہلے ہی 'امانت' میں خیانت کرتے ہوئے، ''جُھوٹن'' اُن کے دسترخوان پہ سجادی تھی۔

دوامِ ابد

انور سدید (لاہور)

آزادی کے بعد اردو افسانہ نگاروں کی جو نسل پروان چڑھی اور جس نے اردو افسانے کو ارتقاء کا اگلا قدم اٹھانے کے لئے زندگی کے نئے تجربات سے فنکارانہ انداز میں آشنا کیا، اس میں محمد منشایاد ایک بے حد اہم نام ہے۔ ان کو تخلیقی صلاحیت مبرائے فیاض نے عطا کی تھی اور ان پر بچپن میں ہی غیب سے مضامین اترنے لگے۔ شاعری کرنے لگے اور افسانے لکھنے لگے۔ پھر ایک ساعتِ سعید میں ان کے دوست وقار بن الٰہی نے سمجھایا کہ ''میاں تخلیق کی موم بتی کو یوں دونوں سروں سے جلاؤ گے تو شعلۂ تخلیق جلدی بجھ جائے گا۔'' منشا یاد نے اپنے افسانے نگار دوست کا مشورہ قبول کر لیا اور شاعری ترک کر دی۔ افسانے سے عشق کرنے لگے۔ ان کا پہلا افسانہ ''کنول'' شمع لاہور میں اکتوبر ۱۹۵۵ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ لیکن انہیں حقیقی ادبی شہرت ان کے افسانے ''تیرہواں کھمبا'' نے عطا کی جو ''اوراق'' میں ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''بند مٹھی میں جگنو'' ۱۹۷۵ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اور جدید اردو افسانے میں ان کی انفرادیت کا نشان بن گیا۔ منشایاد کی پیشہ ورانہ زندگی انجینئرنگ کے معروف شعبے سے وابستہ تھی لیکن ان کی فرصت کے تمام لمحات افسانہ تخلیق کرنے میں صرف ہوئے اور انہوں نے ''ماس اور مٹی''..... ''خلاء اندر خلاء'' ..... ''وقت سمندر'' ..... ''درخت آدمی'' ..... ''دور کی آواز'' ..... ''تماشا'' اور ''خواب سرائے'' کے نام سے افسانوں کے مجموعے پیش کیے اور ڈاکٹر وزیر آغا، ممتاز مفتی، گوپی چند نارنگ، مظفر علی سیّد، وارث علوی، امرتا پریتم، محمد علی صدیقی، انتظار حسین، شمس الرحمان فاروقی، احمد ندیم قاسمی، جوگندر پال اور متعدد دیگر نامور ادیبوں سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ اس دوران ہی انہوں نے اپنی ماں بولی ''پنجابی'' میں بھی کہانیاں لکھنے کا سلسلہ شروع کیا اور پنجابی افسانوں کا مجموعہ ''وگدا پانی'' کے علاوہ پنجابی زبان کا ناول ''ٹاواں ٹاواں تارہ'' پیش کیا جو چھپتے ہی ''کلاسیک'' تسلیم کیا گیا۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے صدر نشین فخر زمان صاحب نے ان کی ممتاز تخلیقی حیثیت کے تحت انہیں پاکستانی ادب کے معماروں میں شمار کیا اور لکھا:

''محمد منشایاد کو ادبی روایت کی پاسداری، روحِ عصر کی ترجمانی، اور اسلوب و آہنگ، افسانہ اور ناول کے سبب پاکستانی ادب کے عصری منظر نامے میں نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ انہوں نے ادب میں بنیادی آفاقی انسانی قدروں کی ترجمانی کی ہے''۔

منشایاد کے فن اور شخصیت پر کتاب لکھنے کا فریضہ معروف افسانہ نگار ونقاد اسلم سراج الدین کو تفویض کیا۔ ''پاکستانی ادب کے معمار'' کے سلسلے کی یہ کتاب مندرجہ بالا عنوان کے تحت زیرِ تبصرہ ہے۔ اس کتاب کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اسلم سراج الدین نے فنکار، تخلیق کار اور کہانی کار منشایاد کو ان کی کہانیوں سے دریافت کیا ہے اور اب ہمیں اس جہان کی سیاحت کرائی ہے جو پہلے منشایاد کی باطن میں آباد تھا اور اب ان کی کہانیوں میں دوامِ ابد پا چکا ہے۔ کہنے کو تو کتاب کا ایک طویل باب محمد منشایاد کے سوانحی حالات و واقعات اور ان کی زندگی کے منظر اور پس منظر کو بھی پیش کرتا ہے لیکن غور کیجیے تو یہ باب کہانی کے اُن فن کا تذکرہ ہے جس نے منشایاد کے ساتھ قدم بہ قدم سفر کیا اور ان کے تخلیقی عمل سے اپنا واقعاتی وجود اس طرح قائم کیا ہے کہ معاشرے کا ظاہر و باطن آشکار ہوتا چلا جاتا ہے۔ محترم مؤلف نے منشایاد کے سوانحی کوائف، ادبی خدمات اور عملی سرگرمیوں اور ان کی تصانیف کا تذکرہ اجمال سے کیا ہے لیکن ان کا تنقیدی اور تجزیاتی کمال ''فکر و فن'' کے باب میں سامنے آتا ہے اور محسوس یہ ہوتا ہے کہ اسلم سراج الدین تنقید و تجزیہ نہیں کر رہے بلکہ کہانی کے ساتھ ہم کلام ہیں اور کہانی اپنا باطن خود ان پر منکشف کر رہی ہے۔ اس پر مستزاد اسد فیض کا انٹرویو ہے جس میں منشایاد نے افسانہ نگاری کے فن کے اہم ترین زاویوں کو منور کیا ہے اور اس فن کی اس خوشبو کو اجاگر کیا ہے جو تخلیقی لمحات میں منشایاد پر طاری ہو جاتی تھی۔ اسلم سراج الدین اور اسد فیض نے جو حقیقتیں پیش کی ہیں، ان کا اثبات ملک کے متعدد نامور دانشوروں، ادیبوں اور نقادوں نے کیا جس کے نام اوپر درج ہو چکے ہیں۔ زیرِ بحث کتاب پڑھ کر محمد منشایاد کے فن کی عظمت آشکار ہو جاتی ہے اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ پاکستانی ادب کے ایک حقیقی معمار ہیں۔ یہ کتاب تالیف کرنے پر اسلم سراج الدین ہر لحاظ سے تحسین کے مستحق ہیں۔ مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ محمد منشایاد جو اسلام آباد کی تعمیر میں ایک پیشہ ور انجینئر کی حیثیت میں اعلیٰ خدمات ادا کر چکے ہیں، ادب کی دنیا میں اعلیٰ پائے کے افسانہ نگار تسلیم کیے گئے اور ان کی قدر افزائی ان کی زندگی میں کی گئی۔ کتاب کی طباعت و تدوین کی خوبصورتی اور پیشکش کی رعنائیاں محترمہ سعیدہ درانی کی مرہونِ منت ہیں۔ ساڑھے تین سو صفحات کی یہ کتاب ۳۴۰ روپے میں اکادمی ادبیات پاکستان، پطرس بخاری روڈ، سیکٹر H-8/1، اسلام آباد سے دستیاب ہے۔

''لہو کی بُو''

شہریار
(علی گڑھ، بھارت)

۲۰۱۰ء اردو ادب و شاعری اور محترم شہریار کے لیے اس حوالے سے خوش آئیند ہے کہ اس سال جناب شہریار کو بھارت کے سب سے بڑے ''گیان پیٹھ'' ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا اور اسی سال حیدر آباد دکن یونیورسٹی نے شہریار صاحب کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا۔ ادارہ اور قارئینِ چہارسو ڈاکٹر شہریار کی خدمت میں اس مبارک موقع پر ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔۔۔۔ادارہ

اپنی یاد میں

میں اپنے گھاؤ گن رہا ہوں
دُور تتلیوں کے ریشمی پروں کے نیلے پیلے رنگ
اُڑ رہے ہیں ہر طرف
فرشتے جیسے آسمان سے اُتر رہے ہیں صف بہ صف
آنسوؤں کی اوس میں نہا کے بھولے بسرے خواب آ گئے
خون کا دباؤ اور کم ہوا
نحیف جسم پر کسی کے ناخنوں کے آڑھے ترچھے
نقش جگمگا اُٹھے
لبوں پہ لُکنتوں کی برف جم گئی
طویل ہچکیوں کا ایک سلسلہ
فضا میں ہے
لہو کی بُو ہوا میں ہے

○

خواب کا در بند ہے

میرے لیے رات نے
آج فراہم کیا
ایک نیا مرحلہ

نیندوں سے خالی کیا
اشکوں سے پھر بھر دیا
کاسہ میری آنکھ کا
اور کہا کان میں
میں نے ہر اک جرم سے
تم کو بری کر دیا
میں نے سدا کے لیے
تم کو رہا کر دیا
چاہو جدھر جاؤ تم
جاگو کہ سو جاؤ تم
خواب کا در بند ہے

○

STAR WALK☆

امجد اسلام امجد (لاہور)

رنگ و آواز کے سب سے مشہور اور مرکزی شہر میں
اک سڑک وہ بھی ہے
جس کے فٹ پاتھ پر، راہ چلتے ہُوئے
ہر قدم اک ستارا ہے زیرِ قدم
ہر ستارا کسی ایک ایسے ستارے سے منسوب ہے
جو سرِ آسمانِ ہُنر، عمر بھر
اپنے فن کے حوالے سے چمکا بہت اور دمکا بہت
نام جس کا وہیں
اُس کی اپنی جبیں کے کہیں وسط میں درج ہے۔
ہے زمیں سر بہ سر، کہکشاں، کہکشاں
اور تاروں بھری، اس گذرگاہ پر
کتنے ہی نام ہیں
جو کہ محفوظ تھے حافظے میں مرے
جن سے کھلنے لگیں یاد کی کھڑکیاں!

میں بہت دیر تک اُس جگہ پر کھڑا
دیکھتا ہی رہا
اُن کے ناموں پہ قدموں کو رکھتے ہوئے
چل رہے تھے سبھی
کوئی پڑھتا ہوا، کوئی دیکھے بِنا
میں نے سوچا بہت اور میں الجھا بہت
کیا عجب سین ہے!
یُوں بچھانا ستاروں کو قدموں تلے
اُن کی تعظیم ہے یا کہ توہین ہے۔

☆

☆امریکہ کی ریاست کیلی فورنیا کے مشہورِ زمانہ شہر ہالی وڈ کی ایک سڑک کا فٹ پاتھ، جس پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک کنکریٹ کے بلاکس میں ایک خاص ترتیب سے ستارے بنا کر اُن کے درمیان میں بڑے بڑے فن کاروں کے نام درج کر دیئے گئے ہیں اور اس پر چلنے کو Star Walk کہتے ہیں۔

○

عکسِ معکوس

یہ جو برسوں سے ملتے ہیں ہر چوک میں
لوگ دیکھے ہوئے! ہاتھ پھیلے ہوئے!
آنکھ روتی ہوئی! بات ٹوٹی ہوئی!
سب کے ہونٹوں پہ ہے ایک ہی التجا
ایک ایسی دعا
جس کا مطلب ہے الفاظ سے ماورا
میں انہیں دیکھ کر بھی نہیں دیکھتا۔

جس طرح زور و زر رکھنے والوں
کی دنیا کے بازار میں
حالتِ زار میں
ہر گذرتی ہوئی کار کے بند شیشوں
پہ دیتے ہیں ہم دستکیں
اور ہماری طرف
کوئی پلکیں اُٹھا کر نہیں دیکھتا!

☆

رباعیات

مامون ایمن (نیویارک)

سایہ

ہم راہ زمانے کے جدھر جاتا ہے — ہر سانس پہ احساس بپھر جاتا ہے
بے پَر ہو جہاں دھوپ کے ہاتھوں سایہ — خُرمن کے مقدّر سے شرر جاتا ہے

تجرید سے ماحول سُدھر جاتا ہے — قدموں سے جُدا ہو کے سفر جاتا ہے
ٹھہرے ہے جہاں دھوپ کا چہرہ سایہ — آئینہ صبا بن کے بکھر جاتا ہے

دریا تو سمندر میں اُتر جاتا ہے — جھونکا بھی ہر اِک رہ سے گذر جاتا ہے
سورج کو اگر گھیر لے کوئی سایہ — ماحول حقیقت سے مُکر جاتا ہے

کشکول تمنّاؤں کا بھر جاتا ہے — گُم راہی کا پیمان سنور جاتا ہے
اے کاش! رُکے رُوح نہ اُس جا' سایہ — ہستی کے لیے جسم سے ڈر جاتا ہے

تعمیر کا ہر سانس ہی مَر جاتا ہے — تخریب کا آزار نکھر جاتا ہے
دیوار کو جب ڈھاتا ہے ہنس کر سایہ — اِلزام کسی اور کے سَر جاتا ہے

تدبیر کی دنیا سے مَفَر جاتا ہے — صحرا میں بھی ہم راہ شجر جاتا ہے
جب سینہ کسی دھوپ کا چیرے سایہ — رستے سے کٹا راہی بھی گھر جاتا ہے

انکار سے اِقرار بنا جاتا ہے — تنویر سے سرسار بنا جاتا ہے
یوں کہیے کہ تسلیم کے رُخ سے' سایہ — دُنیا میں کِرن زار بنا جاتا ہے

حیرت نُما کِردار بنا جاتا ہے — وہ جیت کبھی ہار بنا جاتا ہے
خوشیوں سے کٹا' غم کا سراپا' سایہ — تحسین سے شہہ کار بنا جاتا ہے

تقصیر کا بازار بنا جاتا ہے — تعزیر کا بازار بنا جاتا ہے
خاموشی سے آ بیٹھا ہے دل میں' سایہ — زنجیر کا بازار بنا جاتا ہے

کِرنوں سے طرح دار بنا جاتا ہے — قسمت سے ضِیا کار بنا جاتا ہے
لمحوں کی کھلی باہوں میں چھپ کر' سایہ — تقدیر کا معیار بنا جاتا ہے

برفاب زدہ نار بنا جاتا ہے — گُل زار میں بھی خار بنا جاتا ہے
کِرنوں کے لیے دہر میں' ایمن! سایہ — پلکوں پہ نیا بار بنا جاتا ہے

○

تاج محل کی فریاد

حفیظ النجم کریم نگری
(کریم نگر، بھارت)

دنیا کا میں شہکار ہوں نغمہ ہوں غزل ہوں
میں حسنِ غزل جانِ غزل تاج محل ہوں

میں ہند کی عظمت ہوں محبت کی نشانی
شفّاف مرا حسن ہے بے داغ جوانی

مرمر سے تراشا ہے گیا میرا یہ پیکر
لگتا ہے کہ جنّت ہے اُتر آئی زمیں پر

جمنا کے کنارے پہ میں صدیوں سے کھڑا ہوں
آوارہ گھٹاؤں سے میں ہنس بول رہا ہوں

چاندی کا بدن ہے مرا، میں صبحِ درخشاں
دھرتی پہ کھڑا آج بھی ہوں سب میں نمایاں

نہلانے مجھے چاندنی آتی ہے سنور کر
میں چاندنی میں اور بھی ہو جاتا ہوں دلبر

کہتے ہیں مجھے لوگ محبت کا پیمبر
جیتا ہوں اکیلا ہی کئی خوابوں کو لیکر

شاعر کے تخیل کے طرح حسن ہے مرا
سُن شاہ جہاں کا ہے یہاں یار ہے سویا

فلمیں بھی بنائیں ہیں گئیں نام پہ میرے!!!
شعرا نے بھی نغموں میں مرے رنگ بکھیرے

دُنیا کے ہر اِک گوشے سے آجاتے ہیں سیاح
ہر رنگ کے ہر نسل کے ہیں میرے یہ مدّاح

مضبوط ارادوں سے کھڑا اب بھی اٹل ہوں
ممتاز محل ہوں میں حسیں تاج محل ہوں

دُنیا کے عجوبوں میں ہوں، میں ایک عجوبہ
تھا حسن یقیناً یہ مرا دودھ کا دھویا

مسموم ہواؤں سے پریشان بہت ہوں
چہرے سے ہوا ہوتی ہوئی ایک دھنک ہوں

اپنوں سے پریشاں ہوں مجھے بس یہی غم ہے
کس جُرم کی پاداش سے یہ کیسا سِتم ہے

اس غم کو مرے کوئی سمجھتا ہی نہیں ہے
اس درد کو میرے کوئی سنتا ہی نہیں ہے

اب اتنا ہی کہنا ہے مجھے آپ سے لوگو!
پونچی ہوں دھروہر کی مجھے آکے بچالو!!

○

بیادڈاکٹروزیرآغا

ڈاکٹراحمدعلی برقیؔ اعظمی

تھے وزیر آغا ادیب و شاعرِ عالی نشاں
ذات تھی جن کی ہمیشہ مرجعِ دانشوراں

اُن کے جانے سے نہ کیوں ہوں اہلِ دانش سوگوار
سب کے دل پر نقش ہے اُنکی محبت کا نشاں

گلشنِ اردو میں جس کی ذات تھی مثلِ بہار
اُس کے جانے سے یکا یک آ گئی فصلِ خزاں

جملہ اربابِ نظر ہیں رنج و غم سے مُضمحل
ہو نہیں سکتا کبھی پورا ادب کا یہ زیاں

شخصیت تھی اُن کی اپنے آپ میں اک انجمن
یاد ہیں سب کو ابھی تک ان کی بزم آرائیاں

جس کا طرزِ فکر تھا آئینۂ نقد و نظر
جس کا اندازِ بیاں بیحد شگفتہ اور رواں

جس کو نظم و نثر پر حاصل تھی یکساں دسترس
جس کی تحریروں سے ہے سرمست ہر پیر و جواں

جس کے علم و فضل کے ہیں معترف اہلِ نظر
صفحۂ تاریخ پر ہے ثبت جس کی داستاں

تھے وہ برقیؔ اس صدی کے ایک فخرِ روزگار
مٹ نہیں سکتے کبھی اُن کے نقوشِ جاوداں

باجی فرخندہ لودھی کی یاد میں

یونس صابر

(پشاور)

ف فرخندہؔ پنجاب کی تھی فاضل بیٹی
جو دُنیائے فانی سے منہ موڑ گئی

ر روشن لفظ ہوئے تو من کے دیپ جلے
اک شہکار کہانی کی تخلیق ہوئی

خ خُوب رہی کردار میں اُس کی ہیروئن
ہجر کے ہاتھوں دردر ماری پارہتیؔ

ن ناول اور فکشن پہ جیتی مرتی وہ
اس میدان میں بولتا تھا اُس کا طوطی

د دیا گیا حقدار کو ہی ایوارڈ کہ وہ
پاکستانی ادب کے معماروں میں تھی

ہ ہم میں فرخندہ لودھی موجود نہیں
اُسے ہمیشہ یاد رکھے گی نئی صدی

○

کلی کی موت

مسکین احمد منصور
(حیدرآباد، سندھ)

باغیچے میں ایک کلی تھی
نرم و نازک شرمائی سی
ابھی ابھی تو صبح ہوئی تھی
اسی لئے وہ بھیگ رہی تھی
میں نے بڑھکر چھونا چاہا
ایسے سکڑی، ایسے سمٹی
جیسے نئی نویلی دلہن
باغیچے سے میں لوٹ آیا
شام کو میں نے جا کر دیکھا
باغیچہ تو ہرا بھرا تھا
پھولوں کا بھی رنگ وہی تھا
لیکن ہر سو خاموشی تھی
پودا تھا، وہ کلی نہیں تھی!

○

افلاک زدہ

آصف رضا
(یو۔ایس۔اے)

سر اپنا اونچا کر کے
سبز دہانوں کو اپنے کھولے
آندھی پر اشجار گرجتے ہیں

کرتے نہیں کچھ اُن پہ اثر
بادوباراں
مضبوط تنے ہوتے ہیں اُن کے
ناجنباں

کچھ کا مگر
کمزور زمیں سے ہوتا ہے رشتہ
افراز کی سمت اٹھاتے ہیں
نرم و نحیف اپنی بانہیں
آہ مگر! گرتے ہیں اکھڑ کر
اپنی جڑوں سے بیچارے
افلاک زدہ

○

دستک

غالب عرفان

(کراچی)

رنگ اور خوشبو سے بارش کا منظر بھی
آوازوں کا پس منظر کہہ دیتا ہے
اک آواز ازل میں بھی گونجی تھی کہیں
جس کی لہریں محوِ سفر میں سمتِ ابد
لیکن یہ موسم جو دستک دیتا ہے
لیکن یہ آواز جو مجھ سے کہتی ہے
لیکن کچھ یہ رنگ جو مجھ کو بھاتے ہیں
ایک تقاضا بن کر مجھ سے مخاطب ہیں
کیا آواز بھی پیار کی صورت ہوتی ہے؟
کہاں کہاں تک دل کی لہریں جاتی ہیں؟
دل کا دریا کہاں کہاں سے بہتا ہے؟
ہوا کی لہروں میں پنہاں ہے کیا راز؟
کیا دیتی ہیں رنگ اور خوشبو کو پیغام؟؟

○

خلش

حسن عسکری کاظمی

(لاہور)

عجب سی بے کلی میں مبتلا رہنا بھی اچھا ہے
خلش سی دل میں رہتی ہے
بھلا میں کون ہوں اور کس جگہ کا رہنے والا ہوں
کہاں سے آب وگل کے اس جہاں میں آ گیا
اور چند سانسوں کے لیے ٹھہرا
مگر یہ بھی
عجب سا وسوسہ دل میں پریشانی کا باعث ہے
کہ جانا ہے تو کیا سچ مچ وہاں بھی
بے کلی میں مبتلا رہنا مقدر ہے
مجھے رہنا پڑے گا عرصۂ بے نام میں کب تک
کہ میں سب بھول جاؤں گا
جہاں آب وگل میں کتنے دکھ جھیلے
عذاب جاں کنی کا ذائقہ چکھا
خلش سی دل میں رہتی ہے
بھلا میں کون ہوں
اور کس جگہ کا رہنا والا ہوں
کہاں سے آب وگل کے اس جہاں میں آ گیا
اور چند سانسوں کے لئے ٹھہرا

○

قطعات

(حالیہ سیلاب کی تباہ کاریوں کے پس منظر میں)

شگفتہ نازلی (لاہور)

حدِ نگہ بڑھتا ہوا صرف پانی ہے
سرکش روانیوں کے سوا' کچھ نہیں رہا'
دُھندلائے سے دکھائی دیں منظر جو جا بجا
آنکھوں میں پانیوں کے سوا' کچھ نہیں رہا!

زخموں پہ رکھ کے پیار کے مرہم
سارے دُکھ درد تو بھلانے ہیں'
اُن کے خیموں کے آس پاس ہمیں
سب دیئے آس کے جلانے ہیں!

درس گاہیں بھی منتظر اُن کی
پہلے اُمید تو دلانی ہے
سارے معصوم ذہنوں کو پھر سے
علم کی روشنی دکھانی ہے!

اثاثے بہہ گئے پر عزم پُختہ
گھروں کو لوٹ جانا چاہتے ہیں'
جنہیں پانی بہا کر لے گیا ہے
اُنہیں پھر سے بسانا چاہتے ہیں!

تہہ و بالا کر کے رکھ دیا سارے نظام کو
بپھرے ہوئے سیلاب کی ہر موج موج نے'
مقدور بھر وہ پہنچے ہیں ہر ہر مقام پر
اِمداد ہر طرح سے کی ہے پاک فوج نے!

○

بھری دوپہر

فیصل عظیم (کینیڈا)

آئینے میں دیکھ رہا تھا
اس کے بالوں میں کچھ بوڑھے لٹکے ہوئے تھے
اور کچھ بچے جھول رہے تھے
ایک سفید سا دھبہ تھا جو گھر تھا اس کا
خشکی جھاڑی تب یہ جانا
قبر کی مٹی چپکی ہوئی تھی
اور بالوں میں گرد مسافت کی تھی شاید
جو بوڑھوں' بچوں اور گھر کے بیچ جمی تھی
اور چاندی کے تار
کسی موسیقی کے آلے سے ٹوٹ کے بکھرے ہوئے تھے
ہر منظر کے پہلو میں لیکن وہ خود بھی اٹکا ہوا تھا
سوچ رہا تھا۔۔۔۔
کالے بالوں میں چاندی کے تار ابھی تو نو وارد ہیں
آئینے سے نظر چرا کر
اپنے سر کو جھاڑ کے' اپنے بال بنا کر باہر لپکا
اور باہر کی گرد میں اٹ کر پھر مٹی کے سنگ ہوا ہے
سر میں چاندی پھیل رہی ہے
مٹی اوڑھ کے لیکن وہ بے رنگ ہوا ہے

○

نقالی

ڈاکٹر علی کمیل قزلباش
(کوئٹہ)

نمازیں، مسجدیں، وعظ اور دعائیں
جماعت در جماعت، جوق در جوق
صفوں میں ہیں سبھی محمود و ایّاز
ہر اک لمحہ ہر اک صورت یہاں پر
بظاہر کاربند آئین دیں کا-
نظر آتا ہے لیکن پھر بھی ہر سمت-
فضا، اک نابرابر دیکھتا ہوں
ستم منطق کی بولی بے تکلف
ہر اک کوچے، گلی میں بولتا ہے
شہر سارا دکانِ جنس ہے اور
کسی بھی جنس کا فقدان نہیں کچھ
مگر معیار کی حد گر رہی ہے
اگر باقی ہے تو بس نا م ہی ہے
وہ باقی نام بھی بدنام ہی ہے

○

دانشور

جہانگیر اشرف
(برمنگھم، یو۔کے)

راہِ علم کے مسافر
عقل و خرد کی شمع لیکر
قدم بقدم چلتے
زینہ زینہ چڑھتے
علم و حکمت کے موتی چنتے
فکر و دانش کے ہمالیہ تک پہنچے

یہ اہلِ بصیرت
فکر انگیز حکمت سے بھرپُور باتیں کریں
نئے فلسفوں نئے رجحانوں پہ بحثیں کریں

رفتہ رفتہ علم و حکمت کے نشے میں چُور ہونے لگے
پہن کر دستارِ فضیلت مغرور ہونے لگے
ہولے ہولے اپنے ہی لوگوں سے دُور ہونے لگے

اب فکر و دانش کے ہمالیہ سے
انکو اپنے سوا کچھ دکھائی نہ دے
علم کے قارون بن بیٹھے
انکو آوازِ خلق سنائی نہ دے

○

''جبینِ دوعالم''

احمد ظہور (اسلام آباد)

جبینِ دوعالم پہ لکھا گیا آپ کا پاک نام
حضور آپ پر ہوں دُرود وسلام
حضور
آپ کے قلبِ اقدس پہ نازل ہوئی
وہ جو پہلی وحی
وہ وحی علم کا ایسا سورج بنی۔
جس کی کرنوں سے ہر سُو ہوئی روشنی
جس کی حدت سے کشت ہائے علم وہنر خُوب پھلنے لگی
رحمتیں آسماں سے اُترنے لگیں
اور زمیں
اپنی پوشیدہ دولت اُگلنے لگی
حضُور
آپ کے نام کی برکتوں نے
بنی نوع انساں کو جینا سکھایا
بنی نوع انساں کو
وہم وگماں کے بھنور سے نکالا
یقیں اور ایماں کی دولت عطا کی
دئے توڑ بت سارے وہم وگماں کے
دکھائے اسے راستے آسماں کے
نوع انسان کی کشتِ ویران میں
پھر بہار آ گئی
کھُلے راستے دانش وآگہی
بس اُسی کے طفیل
حضور آپ کے قلبِ اقدس پہ نازل ہوئی
وہ جو پہلی وحی

راولپنڈی

آنند بخشی

سانحہ یہ میری زندگی سہہ گئی
مَیں یہاں آ گیا وہ وہاں رہ گئی

کچھ نہ مَیں کر سکا دیکھتا رہ گیا
کچھ نہ وہ کر سکی دیکھتی رہ گئی

لوگ کہتے ہیں تقسیم سب ہو گیا
جو نہیں بٹ سکی چیز وہ رہ گئی

راستوں میں کھڑی ہوگئی سرحدیں
سرحدوں پہ کھڑی بے بسی رہ گئی

یاد پنڈی کی آتی ہے اب کس لئے
میری مٹی تھی جہلم میں وہ بہہ گئی

ان زمینوں نے کتنا لہو پی لیا
یہ خبر آسمانوں تلک رہ گئی

دے گئی گھر گلی شہر میرا کسے
کیا پتہ کس سے بخشی وہ کیا کہہ گئی

○

پھولوں کا پیغام

A Sermon of Flowers!

ایم۔ایل شرما ناز
(چندی گڑھ، بھارت)

بوستانوں میں ہزاروں پھُول کھلتے ہیں
طرح طرح کی نکہتوں سے بھرپُور
دیتے ہیں پیغامِ محبت وخلوص
دِل سے نِکال کر کدورتوں کو
ایسے چمکو جیسے درخشاں چاند تارے
امن وسکُون دِلوں میں ہو
آنکھوں میں نورِ شفقت کا!
شمع پر نثار پروانے نے کہا:
ارے تم تو آپس میں گتھم گتھا ہو
میں تو نثار ہوتا ہوں حبیب پر
ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے ہوئے
ارے لوگو بھُولے ہو تُم کہ تُم ایک ہی
دھرتی ماں کی گود میں پلے ہو
جو اپنے ہمنشین آفتاب کے اِردگرد
گھومتی ہے اس طرح
جیسے کوئی رقاصہ اپنے حبیب کی خاطر
ناچتی ہے انکسار ومحبت سے بھرپور
خاک سیکھو گے تم مقدس کتابوں سے
اگر تم سیکھ نہ پائے بہتے جھرنوں سے
جو ہنسی خوشی بڑھے جاتے ہیں آگے
حسد وبغض سے پاک؟
شجروں کی جھرمٹ سے
کوئل نے آواز دی
ارے لوگو! یہ بھی کوئی جینا ہے
نہ دِل میں خوشی ہے
نہ جذبات میں کوئی ولولہ
تم تو ایک تکرار کی زبان
اپنے دہن میں لئے ہوئے ہو؟
ایک گُل نے دوسرے گل کے کان میں کہا:
مُحبت ایکتا اور اِدراک
انسان کی
عظمت کے مینار ہیں

گلنار

(تاج محل مکمل ہوجانے پر اس کے معماروں کے ہاتھ قلم کردیے جانے کے مفروضہ کے پس منظر میں)

کوثر صدیقی (بھوپال، بھارت)

کردار

☆شہنشاہ ہند شاہجہاں (محمد شہاب الدین)

☆ممتاز بیگم، ملکہ ہند (ارجمند بانو بیگم)

☆میر منشی۔شہنشاہ کے احکام لکھنے اور جاری کرنے والا حاکم

☆وزراء

☆مہابت خان۔ماہر سنگ تراش اور پچی کار

☆دلاور خان۔ماہر سنگ تراش اور پچی کار

☆گلنار۔کارگاہ میں کام کرنے والوں کو پانی پلانے پر مامور بلوچی لڑکی

☆لشکری خان۔نگرانِ کار داروغہ، افغان پٹھان، لمبا چوڑا کرخت آواز والا، رعب دار شخصیت

☆اطبّا، دائیاں، کنیزیں، بزرگ لوگ، محافظ

پہلا منظر

ذی قعدہ (۸/۱۰۴۰ھ مطابق ۱۶۳۰عیسوی)

(برہان پور مدھیہ پردیش میں شاہی محل کا ایک بڑا ایوان۔ملکہ ہند ممتاز محل شاہجہاں کے چودھویں بچے کی زچگی کے وقت سیلانِ خون ہوجانے کی وجہ سے نیم غنودگی اور اضطراب کے عالم میں ایوان کے وسط میں رکھے ایک زرنگار تخت پر ہاتھ پیر پٹک رہی ہے۔ملکہ کی دائیں جانب شاہجہاں تکیے کے سہارے ملول وافسردہ انداز میں ممتاز کا سر سہلا رہا ہے۔تخت کی دائیں جانب کچھ اطباء اور ان کے معاونین صلاح ومشورہ کر رہے ہیں۔کچھ برگزیدہ دینی بزرگ قبلہ رو ہاتھ اٹھا کر ممتاز کی صحت یابی کی دعا کر رہے ہیں۔ایک کنیز ممتاز محل کو کوئی خمیرہ اپنی انگلی سے چٹا رہی ہے۔بائیں جانب تخت کے ایک جالی دار کپڑے کا پردہ ہے جس کے پیچھے خواتین طبیبائیں اور دایہ وغیرہ مایوسی کے عالم میں کھڑی دھیرے دھیرے کچھ بات کر رہی ہیں۔دو کنیزیں ملکہ کے پیر دبا رہی ہیں اور تلوے سہلا رہی ہیں۔ایوان میں مضمحل خاموشی طاری ہے۔فضا غمگین ہے۔سب کے چہروں پر فکر کے گہرے تاثرات ہیں۔

شاہجہاں ممتاز محل کا سیدھا ہاتھ پکڑ کر دھیرے دھیرے اسے آواز دے رہا ہے)

شاہجہاں: ممتاز! میری ممتاز، آنکھیں کھولو، میری طرف دیکھو۔

(ممتاز کی آنکھوں میں حرکت ہوتی ہے اور وہ نیم وا انداز میں شاہجہاں کو دیکھتی ہے)

شاہجہاں: (ممتاز کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) اللہ تعالیٰ آپ کو شفا عطا فرمائے گا وہ آپ کو مجھ سے جدا نہیں ہونے دے گا۔اطمینان رکھیے آپ اچھی ہو جائیں گی۔

ممتاز: (شاہجہاں کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اور رک رک کر دھیرے دھیرے بولتے ہوئے) میرے سرتاج! مجھے اب اپنے بچنے کی امید نہیں ہے۔میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔میری آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔کوئی مجھے بلا رہا ہے۔میں جا رہی ہوں۔''

شاہجہاں: ایسا نہ کہو ممتاز۔ایسا نہ کہو۔میں تمہارے بغیر کیسے جیوں گا؟

ممتاز: میں اس عظیم ملک کو تمہیں اور تم کو خدا کے سپرد کرتی ہوں، سلامت رہو میرے سرتاج۔

شاہجہاں: نہیں نہیں۔تقدیر مجھ پر اتنا ظلم نہیں کر یگی کہ تمہیں مجھ سے چھین لے۔

ممتاز: میرے سرتاج! تم مجھ سے محبت کرتے ہو نا۔بولو ہاں۔تو میری خواہش ہے کہ تم محبت کی ایک ایسی یاد بنانا جس کی مثال نہ ماضی میں ہو نہ آئندہ کوئی بنا سکے۔(کہتے کہتے حالت بگڑ جاتی ہے)

شاہجہاں: میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہاری یادگار بے نظیر ہوگی۔تمہاری محبت کی یادگار تمہارے خوابوں سے بھی زیادہ حسین ہوگی۔

ممتاز: آ۔۔۔خری۔۔۔س۔۔۔لام۔محبّ بت ق بول کرو۔ مے۔۔۔رے۔۔۔سرتاج۔۔۔لاالٰہ الا۔۔۔(پڑھتے پڑھتے ایک جھٹکے کے ساتھ آواز رک جاتی ہے)

شاہجہاں: (گھبراہٹ کے عالم میں) حکیم صاحب! خدا کے لیے کچھ کیجیے۔

(ایک حکیم جلدی جلدی نبض ٹٹولتا ہے۔دوسرا کچھ خمیرہ معجون وغیرہ چٹانے کی کوشش کرتا ہے۔کنیزیں اور دائیاں ہاتھ پاؤں سہلانے لگتی ہیں۔ یکا یک شاہجہاں کے ہاتھ میں ممتاز کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔چہرہ ایک طرف ڈھلک جاتا ہے۔)

حکیم صاحب: اناللہ وانا الیہ راجعون

(سب لوگ اناللہ۔۔۔پڑھتے ہیں۔شاہجہاں قریب کے ایک تخت پر بچھے مصلے پر سجدے میں گر کے زار وقطار رونے لگتا ہے۔ایک طبیبہ ممتاز کے چہرے کو چادر سے ڈھک دیتی ہے۔)

دوسرا منظر

(ربیع الاول ۱۰۴۱ ہجری مطابق ۱۶۳۱عیسوی)

(لال قلعہ آگرہ کے دیواں خاص میں شاہی دربار منعقد ہے۔شہ نشین خالی ہے مگر دونوں جانب دو مور چھل بردار الرٹ کھڑے ہوئے ہیں۔شہ نشین کے نیچے تخت پر میر منشی بیٹھے ہیں۔ان کے سامنے آبنوس کی لکڑی کا ایک منقش پیش تختہ رکھا ہے جس پر قلمدان اور کچھ کاغذات رکھے ہیں۔دائیں جانب قطار میں وزیر خزانہ، وزیر تعمیرات اور دوسرے وزراء ادب سے خاموش کھڑے

ہیں۔ بائیں جانب ماہرین تعمیرات اور کچھ اعلیٰ عہدیدار کھڑے ہیں۔ بادشاہ سلامت کی آمد کا انتظار ہے۔ خموشی کو توڑتی ہوئی چوبداروں کی آواز کچھ دور سے آتی ہے جو دھیرے دھیرے قریب آتی جاتی ہے۔

''با ادب، باملاحظہ، ہوشیار۔ سلطان السلاطین، سلطنت تیموریہ کے جانشین، ظل الٰہی، صاحب قران، شہنشاہِ ہندوستان جلوہ افروز ہوتے ہیں۔''

چند لمحوں میں شاہجہاں تخت نشین ہو جاتے ہیں۔ حاضرین دربار سر جھکا کر فرشی سلام کرتے ہیں۔ سلام ختم ہوتے ہی ایک چوبدار جو ایوان خاص کے آخر میں کھڑا ہے بہ آوازِ بلند کہتا ہے۔

''شہنشاہ ہندوستان، صاحب قران، سلطان السلاطین، ظل الٰہی حضرت محمد شہاب الدین شاہجہاں کا اقبال۔۔۔۔''

سب حاضرین دربار بیک آواز بلند بولتے ہیں۔

''اقبال پائندہ باد، فرخندہ باد، عمر دراز باد''

شاہجہاں تخت پر بیٹھ کر ایک طائرانہ نظر حاضرین دربار پر ڈال کر میر منشی کو حکم صادر فرماتے ہیں۔)

شاہجہاں: کارروائی شروع کی جائے۔

میر منشی: (وزیر تعمیرات سے مخاطب ہوتے ہوئے) عالم پناہ نے دربار کے پچھلے اجلاس میں خلد نشین ملکہ ہندوستان کے بے نظیر مقبرے کی تعمیر کا حکم صادر فرمایا تھا۔ اس کی تفصیلات اور کی گئی کارروائی بحکم عالم پناہ پیش کی جائے۔

وزیر تعمیرات: بحکم عالی پناہ خلد نشیں ملکہ عالیہ کے مقبرے کی تعمیر کے لیے برہانپور میں دریائے تاپتی کے ساحل پر ایک جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا مگر ماہرین موسمیات نے وہاں کی آب و ہوا اور کالی مٹی کو عظیم مقبرے کے تعمیر کے لیے ناموزوں قرار دے دیا تھا۔ اس لیے بعد میں بحکم عالی پناہ آگرہ میں جمنا کے ساحل پر جگہ کا انتخاب کیا جا چکا ہے ہر لحاظ سے موزوں ہے۔ ماہر تعمیرات استاد محمد عیسٰی آفندی نے پورے ملک کے خاص خاص مقبروں کا جائزہ لینے کے بعد یہ نقشہ تیار کیا ہے (نقشہ بتاتے ہوئے) اور ان کا دعویٰ ہے کہ تیار ہونے پر اپنی طرز کا اتنا عظیم مقبرہ ہندوستان سے ایران تک اور ایران سے توران تک کہیں نہیں ہوگا۔ نہ اس کی کوئی نقل کر سکے گا۔

شاہجہاں: آفرین۔ صد آفرین۔ ہم یہی چاہتے ہیں۔

وزیر تعمیرات: (عیسٰی آفندی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) عالم پناہ! محمد عیسٰی آفندی کی طرف سے کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ ماہر اعظم آفندی کے تیار کردہ نقشے، قرائن اور تخمینوں کے مطابق مقبرے کی تعمیر میں دس سے پندرہ سال کا وقت لگ سکتا ہے۔ ماہرین فن، نقاش، سنگ تراش، نقشہ نویس، کمان ساز اور دوسرے کاریگر ہندوستان کے علاوہ ایران اور چین سے بلوانا پڑ سکتے ہیں۔ ان کے قیام اور کارگاہ کا بھی مناسب انتظام کرنا ہوگا۔ اعلیٰ قسم کا سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ ایران اور اطالیہ سے منگوانا ہوگا۔ مرصع کاری اور مینا کاری کے لیے عقیق، فیروزہ، مونگا، لاجورد، پکھراج وغیرہ کافی مقدار میں درکار ہوگا۔ چونکہ یہ دنیا کا عظیم الشان مقبرہ ہوگا اس لیے لاگت بھی بہت آئیگی۔ لاگت کے بارے میں میں وزیر خزانہ سے اپنی کیفیت بیان کرنے کی درخواست کرتا ہوں۔

وزیر خزانہ: عالم پناہ سلامت! ماہرین تعمیرات اور ماہر اعلیٰ محمد عیسٰی آفندی سے گفتگو اور صلاح مشورہ کے مطابق مقبرے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں پندرہ کروڑ روپیے کے مصارف کا تخمینہ ہے۔ ہر سال قریب ایک کروڑ روپیے درکار ہونگے۔

شاہجہاں: (میر منشی کو حکم دیتے ہوئے) لکھیے میر منشی! مابدولت کا حکم ہے کہ وزیر تعمیرات جلد تعمیر شروع کرادیں۔ ماہر معماروں، نقاشوں، سنگ تراشوں وغیرہ کی تلاش ملک و بیرون ملک کی جائے۔ جہاں تک ممکن ہو ہندوستان جنت نشان کے فنکاروں کو فوقیت دی جائے۔ تعمیرات سے متعلق تمام ضروری اسباب و اشیاء جہاں سے دستیاب ہوں، منگوانے کے لیے وفادار اور ایمان دار لوگ فوراً روانہ کیے جائیں۔ مقبرے کی جائے وقوع ہموار، مرتفع اور آراستہ کر کے ملکہ ہند کے جسد خاکی کو بہمہ احترام و آداب شرعی و سرکاری برہانپور سے لاکر دفن کیا جائے۔ وزیر تعمیر کے لیے جس وقت جتنی رقم درکار ہو، بلاحیل وحجت فراہم کی جائے۔ مقبرے کی تعمیر کے لیے ہماری رعایا پر کسی قسم کا کوئی بارِ محصول نہ ڈالا جائے۔ مقبرے کی تعمیر ہمارے صرف خاص سے کی جائے حکم کی تعمیل ہو۔

(وزیر خزانہ، وزیر تعمیرات اور حاضرین سر جھکا کر آداب بجالاتے ہیں)

وزیر تعمیرات اور وزیر خزانہ: (بلند آواز میں) عالم پناہ کا حکم سر آنکھوں پر، عالم پناہ زندہ باد، عالم پناہ زندہ باد (دوسرے درباری بھی عالم پناہ زندہ باد کی آواز لگاتے ہیں)

شاہجہاں: (میر منشی سے) ایک حکم اور لکھا جائے۔ کام میں کسی کے ذریعہ کسی سطح پر کسی قسم کی کوتاہی مابدولت برداشت نہیں کرینگے۔ کام میں رکاوٹ ڈالنے والوں اور تعمیری کام کو کسی قسم کا بھی نقصان پہنچانے والوں کو مابدولت معاف نہیں کرینگے (دربار برخواست۔ باہر نوبت بجنے کی آواز گونجتی ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ دربار برخواست ہو گیا)

تیسرا منظر

(ممتاز محل کے جسد خاکی کو برہانپور سے لاکر ساحل جمنا پر منتخب مقام پر دفن کیا جا چکا ہے۔ قبر کچی ہے۔ اس پر زربفت اطلس وکمخواب کا چوگوشہ لمبا شامیانہ لگا کر قناتوں سے محصور کیا ہے۔ شامیانے کے چاروں گوشوں چار محافظ ننگی تلوار اٹھائے ہوئے اٹینشن کی حالت میں کھڑے ہیں)

(تاج محل کی تعمیر کا کام تیزی سے چل رہا ہے۔ خلد نشین ملکہ کی کچی قبر سے کچھ فاصلے پر، بہت بڑے میدان میں نقاش، سنگ تراش، مرصع کار اور کاریگر وغیرہ کام کر رہے ہیں۔ کام کرنیوالوں کو پانی پلانے اور خیموں میں کاریگروں کی

صراحی بھرنے پر ایک نوخیز بلوچی لڑکی گلنار مامور ہے۔ گلنار چنچل، شوخ اور حاضر جواب لڑکی ہے جس کی وجہ سے وہ سب کی مرکوزِ نظر ہے۔ اس کی شوخی اور اٹھتی جوانی اکثر کام کرنے والوں کو متوجہ کرتی رہتی ہے۔ کارگاہ میں ایک سنگ تراش مہابت خاں اور ایک سنگ تراش دلاور خان گلنار سے محبت کرتے ہیں۔ دونوں اس کی اداؤں پر فریفتہ ہیں لیکن گلنار صرف مہابت خان سے محبت کرتی ہے۔ وہ مہابت خان کو بڑے دلفریب انداز میں پانی پلاتی ہے اور اکثر بہت دیر تک اس کے خیمے میں بیٹھ کر ہنسی مذاق کرتی رہتی ہے۔ دلاور خان کا خیمہ مہابت خان کے خیمے سے متصل ہے۔ دلاور خان دونوں کی بڑھتی ہوئی نزدیکیاں دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتا رہتا ہے۔ دلاور خان جب بھی باتیں کرنا چاہتا ہے وہ جھڑک دیتی ہے۔ گلنار کی بے رخی سے دلاور خان کے دل میں رشک و رقابت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

جمعہ کو کارگاہ میں چھٹی رہتی ہے۔ مہابت خان اور گلنار ساون کے میلے میں گھومنے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ کارگاہ سے تھوڑے فاصلے پر امرائی میں کرشن جی کے مندر میں میلہ لگا ہوا ہے۔ مہابت خان اور گلنار میلے میں گھومتے ہوئے ایک آم کے پیڑ کے نیچے بنے دائرہ نما چبوترے پر بیٹھ جاتے ہیں۔ موسم بہت خوشگوار ہے۔ بادل چھائے ہوئے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ کوئل کوک رہی ہے۔ مندر سے بھجن کی من موہنی آواز آ رہی ہے۔ دونوں خاموش موسم کا لطف لے رہے ہیں۔ گلنار خاموشی کو توڑتی ہے۔)

گلنار: کچھ تو بول چپ کیوں ہے مہابی؟ (پیار سے مہابت خان کو کہتی ہے۔)

مہابت خان: کیا بولوں؟

گلنار: جو تیرا دل بول رہا ہو۔

مہابت خان: میرا دل کچھ نہیں بول رہا ہے۔ بس دھڑک رہا ہے۔

گلنار: لا بتا کدھر دھڑک رہا ہے؟

مہابت خان: (گلنار کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دل پر رکھتے ہوئے) یہ دیکھ کیسا دھڑک رہا ہے۔

گلنار: (بھولے پن سے) دل کیوں دھڑکتا ہے؟

مہابت خان: پیار کے انجام کے اندیشے سے۔

گلنار: ابھی تو ابتداء ہی ہے، انجام کیسا؟

مہابت خان: ابتدا ہی تو انجام کا آغاز ہوتی ہے۔

گلنار: اچھا ایک بات بتا۔ میں مر جاؤں گی تو کیا تو بھی میری یادگار میں تاج محل بنائے گا؟

مہابت خان: (مذاق میں ہنستے ہوئے) کیوں نہیں، ضرور بناؤں گا اس سے بھی اچھا تو تو میری ممتاز ہے۔

گلنار: تو میں ابھی جمنا میں چھلانگ لگاتی ہوں۔

مہابت خان: اری پگلی میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تاج محل تو اینٹ چونے پتھر کے پہاڑ کا نام ہے۔ اس کے نیچے تو ہماری روح بھی گھٹ جائے گی۔ ایسا تاج محل اپنے کس کام کا؟

گلنار: تو ٹھیک کہتا ہے مگر دنیا تو محل اور محل والوں کو ہی سلام کرتی ہے۔ ڈیروں کا مقدر ہوا آندھی میں اُڑ جانا یا جل کر رہنے والوں کو بھی خاک کر دینا ہے۔

مہابت خان: مگر ہم اینٹ پتھر کا تاج محل تو بنا نہیں سکتے۔ ہم محنت کش ہیں، ان ڈیروں سے نکلیں گے تو کہیں جھونپڑوں میں پہنچیں گے۔ دونوں کا مقدر ایک ہے۔

گلنار: میں آندھی سے ڈرتی ہوں نہ آگ سے۔ مہابی تو مجھے اپنا بنا لے بس۔

مہابت خان: تجھے میرے ساتھ رہنے میں ڈر نہیں لگے گا؟

گلنار: کیسا ڈر؟ کاہے کا ڈر؟

مہابت خان: میں پردیسی ہوں، چھوڑ کر چلا جاؤں تو؟

گلنار: ایک بات بتاؤں۔ بول ہاں۔

مہابت خان: بول۔

گلنار: تو دودھ بن جا میں شکر بن جاتی ہوں۔ ہم دونوں محبت کے پیالے میں گھل جاتے ہیں۔ پھر دیکھ کون الگ کر سکتا ہے۔

مہابت خان: مجھے اس داروغہ لشکری خان کی مونچھوں سے ڈر لگتا ہے۔ اس نے دیکھ لیا تو اپنے اس دودھ کے پیالے کو ہی اٹھا کر پھینک دے گا۔

گلنار: تو کیا ہوا ہم مٹی میں مل کر بھی الگ تھوڑی ہو جائیں گے۔ اچھا چھوڑ یہ باتیں، دیکھ کوئل اب اس آم پر کوک رہی ہے ادھر چلتے ہیں۔ (دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چل پڑتے ہیں۔)

گلنار: (ایک جوہری کی دکان پر رکتے ہوئے) مہابی یہ پازیب کتنی اچھی ہے۔

مہابت خان: پسند ہے تو لے لے۔

(مہابت خان دکاندار کو پیسے دے کر گلنار کے چاندی جیسے چمکتے ہوئے پیروں کو بڑے شوق سے پہنا دیتا ہے۔)

گلنار: (پازیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ پازیب نہیں میرے پیروں میں تو نے اپنے پیار کی بیڑیاں ڈال دی ہیں۔

مہابت خان: پیار کی بیڑی ایسی بیڑی ہے جو دکھائی نہیں دیتی۔ کوئی اسے توڑ بھی نہیں سکتا۔ تو بھی نہیں توڑ سکتی۔

گلنار: (پازیب کو جھٹکاتے ہوئے) دیکھ اس پازیب میں تو تیرے پیار کے رباب کے ساتوں سُر بول رہے ہیں۔

گلنار: (چلتے ہوئے ایک حلوائی کی دکان پر رکتے ہوئے) مہابی مجھے جلیبی کھلا۔

مہابت خان: چل اپن دونوں کھاتے ہیں۔

(دونوں دو تپائی پر بیٹھ کر جلیبی کھاتے ہیں اور ہنڈولوں کی طرف روانہ ہوتے ہیں)

مہابت خان: (ایک ہنڈولے والے سے) ہم دونوں کو ایک ہالکی میں بٹھا کر جھلا۔

(دونوں خوب جھولا جھولتے ہیں۔ دن ڈھلنے کو ہے۔ عصر کی اذان ہورہی ہے۔ دونوں میلے کے باہر نکل کر اپنے ڈیروں کی طرف روانہ ہوتے ہیں تبھی ایک پیڑ کی آڑ سے اچانک نکل کر دلاور خان سامنے آتا ہے اور بڑے طنزیہ انداز میں کہتا ہے ''السلام علیکم'' اور دوسری طرف تیز قدموں سے نکل جاتا ہے۔ مہابت خان اور گلنار خوف اور گھبراہٹ کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔)

گلنار: ہائے اللہ اب کیا ہوگا؟

مہابت خان: (تسلی دیتے ہوئے) ڈرومت وہی ہوگا جو منظور خدا ہوگا۔

چوتھا منظر

(کارگاہ میں دوپہر ہوچکی ہے۔ سب لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ گلنار مشک اور آبخورہ لیے کام کرینوالوں کو پانی پلانے میں مصروف ہے۔ آج مہابت خان چٹھی پر ہے۔ گذشتہ دن کے میلے کے واقعے کی وجہ سے گلنار دلاور خان کے خیمے کا رُخ نہیں کررہی ہے۔ دلاور خان آواز لگا کر گلنار کو بلاتا ہے۔)

دلاور خان: (زور سے آواز دیتے ہوئے) گلنار، اے سقہ لڑکی ادھر آ۔

گلنار: آتی ہوں۔ (دور ہی سے جواب دیتے ہوئے)

گلنار مشک اور آبخورہ لیے ہوئے دلاور خان کے خیمے میں داخل ہوتی ہے۔)

گلنار: یہ لے۔ (سیدھے ہاتھ سے آبخورہ پیش کرتے ہوئے۔)

دلاور خان: کیا بات ہے آج پیاسوں کا خیال نہیں آیا تجھے؟ (دلاور خان مسکراتے ہوئے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے۔)

گلنار: نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ لے۔ (نظریں جھکائے ہوئے سہمے ہوئے انداز میں پھر آبخورہ پیش کرتی ہے۔)

دلاور خان: پانی تو بعد میں پیوں گا۔ پہلے یہ بتا مجھ سے غیروں جیسا برتاؤ کیوں کرتی ہے؟ مجھ سے روٹھی روٹھی کیوں رہتی ہے؟ (گلنار کو اپنے جال میں پھانسنے کے انداز میں۔)

گلنار: میں کون ہوتی ہوں تیری جو روٹھوں؟ (سہمے ہوئے انداز میں)

دلاور خان: تو پھر ناراض ہے؟

گلنار: میں نہ ناراض ہوں نہ ناخوش۔

دلاور خان: تو پھر مجھ سے راضی ہے نا تو۔

گلنار: یہ کیسی باتیں کررہا ہے تو دلاور؟

دلاور خان: گلنار! بس ایک بار کہہ دے کہ تجھے مجھ سے محبت ہے۔ مجھے کچھ اور نہیں چاہیے، اپنی آنکھوں سے امرت پلا کے مجھے امر کردے میں تجھے بہت چاہتا ہوں۔ (اپنے انگ انگ سے اظہار محبت کرتے ہوئے)

گلنار: پانی نہیں پینا تو میں جاتی ہوں۔

دلاور خان: (پازیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ چاندی کی پازیب تو بازارو ہے۔ میں تجھے سونے کی مرصع پازیب بنوا کر دوں گا۔ ان سونے ہاتھوں میں سونے کے کنگن پہناؤں گا۔ تیرے سر پر اپنی محبت کا تاج رکھ کر تجھے ملکۂ عالیہ بناؤں گا۔ مہابت خان تو پشاور سے آیا ہے کیا پتہ کب طوطے کی طرح اڑ جائے تجھے خبر بھی نہ ہو۔ میں تو آگرہ کا ہوں اور تو بھی آگرہ کی۔ ہم جمنا کنارے گھر بنائیں گے۔ چاندی رات میں تاج محل کے کنارے دریا میں سیر کرینگے۔

گلنار: (غصہ کے انداز میں آبخورہ تپائی پر رکھتے ہوئے) یہ لے میں چلتی ہوں۔

دلاور خان: میری پوری بات تو سن لے (کہتے ہوئے اس کا آنچل پکڑ لیتا ہے)

گلنار: (آنچل چھڑاتے ہوئے) چھوڑو! نہیں تو چلا دوں گی۔

دلاور خان: تو چلائی تو میں بھی تیرے پیار کا بھانڈا پھوڑ دوں گا۔

(گلنار آنچل چھڑا کر سہمے ہوئے انداز میں نگاہیں جھکائے ہوئے تیزی سے باہر نکل جاتی ہے۔)

پانچواں منظر

(دوپہر کا وقت۔ کارگاہ کا منظر۔ سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ ظہر کی اذان ہونے والی ہے۔ اذان ہوتے ہی نماز اور کھانے کی چھٹی ہوجائے گی۔ گلنار مشک اور آبخورہ لیے مہابت خان کے خیمے میں کھڑی ہے)

مہابت: ہاں تو کیا کہتا ہے دلاور خان؟ (گلنار سے سنجیدگی سے سوال کرتے ہوئے)

گلنار: کہتا ہے سونے کی پازیب اور سونے کے کنگن پہنائے گا۔ اپنی ملکہ بنائے گا۔ چاندنی رات میں کشتی میں بٹھا کر جمنا میں گھمائے گا۔

مہابت خان: تو نے چپ چاپ اس کی بات سن لی، ڈانٹ کیوں نہیں لگائی؟

گلنار: ڈانٹ کیسے لگاتی۔ کہتا ہے وہ میرے پیار کا بھانڈا چوراہے پر پھوڑ دے گا۔

(روہانسی آواز میں کہتی ہے)

مہابت خان: اچھا تو اس کے یہ حوصلے۔ گلنار، ڈرنا مت، میں پیشاوری پٹھان ہوں اس کے پیار کا بھوت ایک پل میں اتار دوں گا۔ (غصہ میں آنکھیں سرخ کرتا ہوا کہتا ہے۔)

(ظہر کی اذان ہوتی ہے۔ سب لوگ (کاریگر وغیرہ) اپنے اپنے خیموں سے نکل پڑتے ہیں۔ مہابت خان گلنار سے کارگاہ کے باہر جامن کے درخت کے نیچے ملنے کی تاکید کرکے روانہ ہوتا ہے تاکہ تفصیل سے بات چیت ہو سکے۔ دونوں الگ الگ روانہ ہوتے ہیں۔

ایک گھنٹہ بعد۔ وقفہ

نماز اور کھانے کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ سب کاریگر اپنے اپنے خیموں میں کام پر لوٹ آئے ہیں لیکن مہابت خان کا خیمہ خالی ہے۔ موقع کا فائدہ اٹھا کر دلاور خان لپک کر نگرانِ کار داروغہ لشکری خان کو بلا لاتا ہے۔ مہابت خان کو کام سے غائب پا کر لشکری خان چیخنے لگتا ہے۔ اسی دوران مہابت خان اور گلنار آتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لشکری خان کو دیکھ کر گلنار دور ہی سے سہم کر رک جاتی ہے اور مشک لینے کے لیے حوض کی طرف دوڑتی ہے۔ مہابت خان اپنے خیمے پر آ جاتا ہے۔)

لشکری خان: کام سے بلا اجازت کیسے غائب ہوا؟ (غصہ میں پوچھتا ہے)

مہابت خان: (عاجزی اور انکساری سے) داروغہ صاحب! آج صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا بھوک زیادہ لگ رہی تھی۔ کچھ کھانے کے لیے باہر چلا گیا تھا۔ لوٹنے میں کچھ دیر ہو گئی۔

لشکری خان: تم یوم کا بچہ ہم کو بے وقوف بناتا ہے۔ (غصہ میں)

مہابت خان: معافی چاہتا ہوں داروغہ صاحب (انکساری سے سر جھکا کر کہتا ہے)

لشکری خان: ہوں! معافی کیسا معافی، تم جھوٹ بولتا ہے۔ تمہارے ساتھ وہ لڑکی بھی گیا تھا۔ (سقہ لڑکی گلنار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)

مہابت خان: کون سی لڑکی؟ (انجان بن کر پوچھتا ہے)

لشکری خان: بھولا بن کے ہم کو گھماتا ہے۔ وہ سقہ لڑکی کو تم نہیں جانتا؟

مہابت خان: جانتا کیوں نہیں؟ پانی پلاتی ہے سب کو۔ سب جانتے ہیں اسے۔ لیکن وہ الگ تھی میں الگ گیا تھا۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں مجھے بھوک لگ رہی تھی اور میں کچھ کھانے گیا تھا۔ (صفائی پیش کرتے ہوئے)

دلاور خان: داروغہ صاحب! اس سقہ لڑکی سے مہابت خان کا عشق چل رہا ہے۔ دونوں میلے میں گھومتے ہیں۔ (دلاور خان نے آگ پر گھی ڈالتے ہوئے کہا) وہ دن بھر مہابت خان کو ہی پانی پلاتی رہتی ہے۔

لشکری خان: دوسروں کو یہ لڑکی پانی نہیں پلاتا۔ (غصے میں پوچھتا ہے)

دلاور خان: نہیں نہیں داروغہ صاحب! دوسروں کو بھی پلاتی ہے مگر مہابت خان کو آنکھوں سے بھی پلاتی ہے۔ (دلاور خان نے طیش دلاتے ہوئے کہا)

لشکری خان: بلاؤ اس خبیث کا بچی کو۔ (چند لمحوں میں گلنار سہمی سہمی سی نظریں جھکائے ہوئے آتی ہے۔ خاموش ہے کچھ بولتی نہیں)

لشکری خان: (گلنار سے مخاطب ہوتے ہوئے) تم مہابت خان کو آنکھوں سے پلاتا ہے۔ (بھیڑ میں کھڑے کاریگر دھیرے سے ہنسنے لگتے ہیں)

دلاور خان: یہ لڑکی ادھر مکتب عشق چلاتی ہے۔ ابھی مہابت خان کو عشق کے جال میں پھانسا ہے کل کسی اور کو پھانسے گی۔ مکڑی ہے یہ لڑکی۔

مہابت خان: (غصے میں) دلاور خان! بہتان تراشی سے پہلے سوچ لے۔ خدا کے یہاں تجھے جواب دینا ہوگا۔

دلاور خان: داروغہ صاحب یہ لڑکی ناگن ہے اس سے پہلے کہ یہ دوسروں کو ڈسے اس کا سر کچل دیجیے۔

لشکری خان: سقہ لڑکی گلنار کو ہم اس وقت برخواست کرتا ہے اور (مہابت خان کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے) تم پر تین ہزار روپیہ جرمانہ کرتا ہے۔

(لشکری خان حکم سنا کر چلا جاتا ہے۔ گلنار آنسو پونچھتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ اس کے پیچھے دلاور خان بھی اپنے خیمے میں لوٹ جاتا ہے۔ بھیڑ کے تمام کاریگر مزدور اپنے اپنے کام پر لوٹ جاتے ہیں۔)

چھٹواں منظر

(گلنار کی برخواستگی اور خود پر جرمانے کی وجہ سے مہابت خان بہت غصے میں ہے۔ وہ سب کے سامنے اپنی توہین برداشت نہیں کر رہا ہے۔ غصے میں اسے سمجھ نہیں آ رہا ہے کہ کیا کرے۔ وہ تیزی سے نکل کر دلاور خان کے خیمے میں جا کر اس سے جھگڑا شروع کر دیتا ہے۔)

مہابت خان: (انتہائی غصے کے عالم میں) تم نے اس بے قصور لڑکی کی شکایت کر کے نوکری سے نکلوا دیا۔ مجھ پر جرمانہ کروا دیا، کیا ملا تجھے؟ (دلاور خان سے پوچھتا ہے)

دلاور خان: مجھ جو کرنا تھا میں نے کیا تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے؟

مہابت خان: اس لیے پوچھتا ہوں کہ گلنار بے قصور ہے۔ اگر وہ مجھ سے محبت کرتی ہے تو تمہیں کیا تکلیف ہے۔

دلاور خان: مجھے یہ تکلیف ہے کہ وہ لڑکی پہلے مجھ سے پیار کرتی تھی مگر تم نے اسے اپنے جال میں پھنسا کر میرے خلاف ورغلایا۔

مہابت خان: محبت میں کوئی کسی کو نہیں ورغلاتا۔ محبت تو خود ہو جاتی ہے، کسی کے ورغلانے یا بہلانے پھسلانے سے نہیں ہوتی۔

دلاور خان: ٹھیک ہے مگر گلنار کو سبز باغ دکھا کر، میلے میں گھما کر، پازیب پہنا کر، چکنی چپڑی باتیں کر کے کیا تم نے اسے اپنے جال میں نہیں پھنسایا؟

مہابت خان: مگر تم نے اسے نوکری سے نکلوا کے اچھا کام نہیں کیا۔ اب تم اس بے قصور کی آہ سے نہیں بچ سکتے۔

دلاور خان: گلنار آوارہ لڑکی ہے۔ خانہ بدوش۔ پہلے مجھ سے محبت کی پھر تم سے، اسکے بعد اور نہ جانے کس کس کو پھانستی۔ اچھا ہوا یہاں سے اس کی چھٹی ہو گئی۔

مہابت خان: دلاور خان! زبان سنبھال۔ نہیں تو ابھی گدی سے کھینچ لوں گا۔ گلنار کو تو آوارہ کہہ رہا ہے۔ وہ شاخ پر مہکے اس تازہ گلاب کی طرح ہے جسے نہ کسی نے چھوا ہے نہ سونگھا ہے نہ ہاتھ لگایا ہے۔

دلاور خان: جھوٹ مت بول مہابت خان۔ کیا تو نے گلنار کو نہیں چھوا۔ اس کی خوشبو کو نہیں سونگھا؟ بول بھنورے کی طرح کیا اس کا رس نہیں چوسا۔ میلے میں آم کے نیچے چبوترے پر ایک طرف کیا کر رہے تھے تم دونوں؟ بول!!

مہابت خان: الزام اتنا بڑا الزام۔ (غصے میں بے قابو ہو جاتا ہے اور وہاں رکھے ایک گھن کی طرف تیزی سے لپکتا ہے۔ دلاور خان یہ سوچ کر کہ مہابت خان اس پر حملے کی غرض سے گھن کی طرف بڑھا ہے، بجلی کی طرح باہر نکل جاتا ہے۔

مہابت خان غصے میں دلاور کی تراشیدہ اور پچی کاری کردہ محراب کی سل گھن مار مار کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ یہ دیکھ کر دلاور خان جو باہر کھڑا تھا، غصے میں مہابت خان کے خیمے میں لپک کر اس کی تراشیدہ محراب کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ آس پاس کے سب کاریگر مزدور جمع ہوتے ہیں۔ داروغہ لشکری خان بھی آ جاتا ہے۔ محافظ اور پہرے دار بھی آ جاتے ہیں۔)

لشکری خان: (پہرہ داروں کو دونوں کی گرفتاری کا حکم دیتے ہوئے) ان دونوں خبیثان کو گرفتار کر لو۔ الگ الگ زندان میں ڈال دو۔ دونوں اپنے کیفر کردار کو پہنچے گا۔

(مہابت خان اور دلاور خان دونوں کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دی جاتی ہے)

ساتواں منظر

(لال قلعہ آگرہ میں شہنشاہ کا دربار۔ شاہجہاں شہہ نشین پر رونق افروز ہیں۔ شہ نشین کے نیچے میر منشی اپنی مسند پر بیٹھے ہیں۔ مہابت خان اور دلاور خان زنجیروں سے بندھے ایک طرف کھڑے ہیں۔ وزراء اور داروغہ تعمیرات وغیرہ سب اپنے اپنے مقام پر باادب واحترام کھڑے ہیں)

شہنشاہ: مقدمے کی کارروائی شروع کی جائے۔

میر منشی: (داروغہ لشکری خان سے مخاطب ہوتے ہوئے) استغاثہ پیش کیا جائے۔

لشکری خان: عالم پناہ! بندہ جان کی امان چاہنے کے بعد عرض گزار ہے کہ مہابت خان اور دلاور خان دونوں درجہ ایک کا معمار ہے۔ یہ دونوں ایک بلوچی سقہ لڑکی گلنار سے محبت کرتا ہے۔ کل مہابت خان سقہ لڑکی کو لے کر نماز کی چھٹی میں کارگاہ سے باہر کہیں چلا گیا اور چھٹی ختم ہونے پر وقت پر نہیں لوٹا۔ دلاور خان نے ہم کو مطلع کیا۔ ہم نے مہابت خان کے خیمے کا معائنہ کیا اسے غیر حاضر پایا۔ اسی وقت مہابت خان اور سقہ لڑکی ہم کو کارگاہ میں آتا دکھائی دیا۔ مہابت خان ہم کو دیکھ کر اپنے خیمے میں آ گیا۔ عالم پناہ کارگاہ محبت گاہ نہیں ہے۔ سقہ لڑکی کو ہم نے برخواست کر دیا اور مہابت خان پر تین ہزار جرمانہ۔ ہمارے وہاں سے جانے کے بعد مہابت خان نے دلاور خان کے خیمے میں جا کر جھگڑا فساد کیا اور غصے میں مہابت خان نے دلاور خان کی تراشیدہ اور مرصع ایک محراب کا سِل گھن مار کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ انتقام میں دلاور خان نے مہابت خان کے خیمے میں جا کر اس کی تراشیدہ محراب کے پتھر کو توڑ دیا۔ ان پتھروں کی تیاری میں قریب تین مہینے لگے تھے اور قریب پانچ ہزار خرچ ہوا تھا۔ اس سے شاہی خزانے کو نقصان تو پہنچا ہی مقبرے کی تکمیل میں بھی تین ماہ کا توقف ہو گیا۔ ملزمان حاضر ہیں عالم پناہ انصاف فرمائیں

میر منشی: (ملزموں سے مخاطب ہوتے ہوئے) تمہیں اپنے بچاؤ میں بیان کا موقع دیا جاتا ہے۔

مہابت خان اور دلاور خان: (سر جھکائے ندامت کے انداز میں چپ چاپ کھڑے ہیں کچھ بول نہیں پا رہے ہیں)

میر منشی: تم دونوں کی خاموشی تمہارا اقبال جرم ہے۔

مہابت خان اور دلاور خان: (دونوں بیک وقت رحم طلب کرنے کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر) عالم پناہ! عدل پناہ۔ ہم جان کی امان پاتے ہیں۔ ہم حضور اور سلطنت مغلیہ کے وفاداروں اور جاں نثاروں میں ہیں۔ خطا سرزد ہوئی لیکن طیش میں ہوش وحواس کھو دینے کی وجہ سے۔ عالم پناہ کا اقبال بلند رہے۔ معافی کی درخواست کرتے ہیں۔

(مقدمہ کی سماعت کے دوران کچھ شور سنائی دیتا ہے۔ ایک محافظ حاضر دربار ہو کر کورنش بجا کر عرض کرتا ہے کہ ایک سقہ لڑکی گلنار جہاں پناہ کے انصاف کی دہائی دے کر حاضر دربار ہو کر کچھ روداد بیان کرنے پر بضد ہے)

شاہجہاں: سقہ لڑکی کو حاضر کیا جائے۔

(گلنار دربار میں داخل ہوتی ہے۔ کورنش اور عرض واجبات کے بعد)

گلنار: عالم پناہ! عدل پناہ! میں بے قصور ہوں۔ مہابت خان اور دلاور خان بھی بے قصور ہیں۔ انھوں نے جو نقصان پہنچایا ہے وہ قابل تلافی ہے لیکن ان کی جان کا نقصان ناقابل تلافی ہے۔ عالم پناہ کی جان کے صدقے میں ان کی جان بخشی کی جائے۔ بے ادبی اور گستاخی کیلئے جان کی امان چاہتی ہوں۔ عالم پناہ! تمام کارگاہِ محبت گاہ ہے۔ محبت کیلئے زمان ومکاں کی کوئی قید نہیں۔ اماں حوا نے بھی بابا آدم سے محبت کی تھی۔ محبت کی یہ پاکیزہ وراثت آج نسل بہ نسل چلی آ رہی ہے اور اسی پر ساری دنیا قائم ہے۔ گستاخی معاف! عالم پناہ نے بھی محبت کی ہے۔۔۔۔

(وزیر تعمیرات غصے میں گلنار کو بولنے سے روکتے ہوئے)

وزیر تعمیرات: گستاخ لڑکی! خاموش۔ تیری باتیں لائق سرزنش ہیں۔

شاہجہاں: (وزیر تعمیرات کو روکتے ہوئے) اسے پوری بات کہنے دی جائے۔

گلنار: عالم پناہ کی محبت ہی تاج محل کی شکل میں چودھویں کے چاند کی شکل میں سلطنت مغلیہ کے افق پر طلوع ہو کر ساری دنیا کو تلقین محبت کر رہی ہے۔ عالم پناہ کنیز کو سخت سے سخت سزا دی جائے لیکن مہابت خان کو معاف کر دیا جائے۔

(رونے لگتی ہے)

شاہجہاں: (کچھ دیر غور وخوض کرنے کے بعد) گلنار! تیرا بیان اگرچہ بے باک ہے لیکن گستاخی کے مترادف ہو کر گرفت کے لائق ہے۔ تیرا اندازِ بیان آدابِ شاہی کے خلاف ہے لیکن اس میں حقیقت کی جھلک ہے۔ ہم تیرے جذبۂ محبت کو نگاہِ تحسین سے دیکھتے ہیں۔۔۔۔۔ مابدولت کا حکم ہے گلنار کو معاف کیا جائے لیکن مہابت خان اور دلاور خان کا جرم قابل معافی نہیں ہے۔ دونوں کے دونوں ہاتھ پہنچوں سے کاٹ دیئے جائیں۔

(ساتویں منظر کے ساتھ ڈرامہ ختم)

ایک صدی کا قصّہ

دیپک کنول

(ممبئی، بھارت)

گلزار جاوید صاحب میرے عزیز بھائی ہیں۔ اُنکی فرمائش تھی کہ میں بالی وڈ کے سو سال پورے ہونے سے پہلے ایک سیریز شروع کروں جو اُن فلم سازوں، ہدایتکاروں اور اداکاروں کے لئے ایک خراج تحسین ہوگا جن کی بدولت بالی وڈ کا جنم ہوا اور جنہوں نے اس کارواں کو آگے بڑھایا۔ کام اتنا آسان نہ تھا۔ راہِ فرار ممکن نہ تھا۔ بھائی کا فرمان کسی بھی حالت میں پورا کرنا تھا۔ میں نے کئی لوگوں سے رابطہ کیا۔ اُن سے مدد کی درخواست کی مگر کسی نے بھی اس کام میں میری مدد کرنے کے لئے ہاتھ نہ بڑھایا۔ میں پاگلوں کی طرح فلم کے اس سمندر کو کھنگالنے کی احمقانہ سی کوشش کرنے لگا۔ احمقانہ اس لئے کہ اتنے وشال سمندر سے موتی چننا اتنا آسان نہ تھا۔ بڑے بڑے غوطہ خور خچہ کھا سکتے ہیں۔ میری کیا بساط۔ بہرحال میں نے ہمت قائم رکھی اور ایک کونے سے دوسرے کونے تک مواد کی تلاش میں بھٹکتا رہا۔

خدا کا شکر ہے کہ کچھ مواد میرے ہاتھ لگا ہے جسے میں اپنے ڈھنگ سے پیش کرنے کی سعی کر رہا ہوں۔ بالی وڈ نے آج تک ہزاروں فلم سازوں اور ہدایتکاروں کو اپنایا۔ اُنہیں عزت اور شہرت بخشی مگر اُن میں سے بہت کم ایسے فلم ساز یا ہدایت کار ہیں جو اپنے کام کی وجہ سے جاوداں ہو گئے۔ بالی وڈ میں ایسے بھی فلم کارگزرے ہیں جنہون نے درجنوں کامیاب فلمیں بنائیں مگر ان فلموں میں ایسی کوئی شہکار فلم نہ تھی جس پر کچھ لکھا جائے۔ جب بھی بالی وڈ کے اتہاس کی بات چلتی ہے تو کچھ چنیدہ نام ہی یاد آتے ہیں جنہوں نے بالی وڈ کی تقدیر لکھ دی۔ اپنی اس سیریز میں، میں اُن ہی چنندہ فلم سازوں، ہدایت کاروں اور اداکاروں کا ذکر کروں گا جنہوں نے نہ صرف بالی وڈ کی زلفیں سنواریں بلکہ اپنے کام سے جگ میں نام پیدا کر دیا۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میری نگاہ میں اُن لوگوں کے کام کے بارے میں لکھنا جنہوں نے صرف اور صرف کمرشل مفاد کو ملحوظ رکھ کر فلمیں بنائیں، بے سود ہے۔ میں اُن لوگوں کے کام کا کھلے دل سے احاطہ کروں گا جن کی فلموں نے ہندوستانی سماج کو ایک نئی سمت عطا کی۔ کون بھول سکتا ہے ''مدر انڈیا'' کو یا دو بیگھہ زمین کو؟ کوئی دادا صاحب پھالکے، وی۔ شانتا رام، غنن بوس، ستین بوس، بمل رائے، محبوب خان، امیہ چکرورتی، کے۔ آصف، گورودت، راجکپور، رمیش سہگل، بی۔ آر۔ چوپڑہ۔ یش چوپڑہ، سبودھ مکھرجی، وجے آنند، رمیش پی، رشی کیش مکرجی، سبھاش گھئی، جیسے ہدایت کاروں کو کیسے بھول سکتا ہے جنہوں نے ایسی فلمیں بنائیں جن پر وقت کی گرد ٹھہر ہی نہ پائی۔ جو آج بھی موضوعاتی اعتبار سے تروتازہ لگتی ہیں۔ میں ہر اشاعت میں کسی نہ کسی فلمی ہستی کی زندگی کے اوراق آپ کے سامنے پلٹنے کی کوشش کروں گا۔ شروعات دادا صاحب پھالکے سے کروں گا۔ اُمید کرتا ہوں کہ آپ کو یہ سلسلہ پسند آئے گا اور آپ مدیر ''چہارسو'' کو اپنی زریں رائے سے ضرور نوازتے رہیں گے.....دیپک کنول

دادا صاحب پھالکے

دادا صاحب پھالکے کو بالی وڈ کا بابا آدم کہا جاتا ہے۔ دادا صاحب پھالکے کا اصلی نام دھوندیراج گوند پھالکے تھا۔ وہ 30 اپریل 1870 کو مہاراشٹر کے ضلع ناسک سے تیس کلو میٹر دور ایک چھوٹے سے گاؤں ٹمبکیشور میں پیدا ہوئے۔ اُنکے والد بِاسک ضلع کے ایک جانے مانے سنسکرت کے عالم تھے۔ دادا صاحب پھالکے نے پندرہ سال کی عمر میں اپنے گھر کو خیر باد کہا اور وہ اپنی پڑھائی پوری کرنے ناسک سے بمبئی چلا آئے۔ 1885 میں اُنہوں نے بمبئی کے سرجے جے آرٹس کالج سے انجینئرنگ، ڈرائینگ، پینٹنگ اور فوٹو گرافی کی تعلیم حاصل کی۔ بچپن سے ہی اُنکا رجحان مصوری اور فوٹو گرافی کی طرف تھا۔ بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ اُنکا شوق نمو پاتا گیا۔ ایک دن ایسا بھی آیا جب اُنکا شوق جنون کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ کالج سے ڈپلوما حاصل کر کے اُنہوں نے اپنے فن کو جلا بخشنے کا فیصلہ کیا۔ اُنہوں نے بڑودہ کے مشہور آرٹ سنٹر ''کلا بھون'' میں داخلہ لے کر فوٹو گرافی اور پرنٹنگ کی مزید تعلیم حاصل کی۔ وہ فوٹو گرافی کو ہی اپنا پیشہ بنانا چاہتے تھے سو اُنہوں نے بڑودہ میں ہی فوٹو گرافی کی ایک دوکان کھول لی۔ قسمت سے دوکان چل پڑی۔ اسی بیچ سرسوتی بھائی نام کی ایک عورت سے اُنکی شادی ہوئی جس سے ایک بیٹا بھی ہوا۔ سرسوتی کا ساتھ اُنہیں زیادہ دنوں تک نصیب نہ ہوا۔ ایک بار بڑودہ شہر میں وبا پھیل گئی جس نے ہزاروں لوگوں کی جان لی۔ دادا کی بیوی اور بیٹا بھی اس وبا کی ذد میں آ گئے۔

1900 میں اُنکا اکلوتا بیٹا اور بیوی اس ناگہانی وبا کی بھینٹ چڑھ گئے۔ دادا کی چھوٹی سی دنیا دیکھتے ہی دیکھتے اُجڑ گئی۔ اس دوہرے غم نے اُنہیں ذہنی اور جسمانی طور پر توڑ کے رکھ دیا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید اس دلخراش سانحے کے اثر سے نکل ہی نہیں پاتا پر دادا بڑے سخت جان تھے۔ اُنہوں نے اس غم کو بھلانے کے لئے کام کی تلاش شروع کی۔ وہ اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے نوکری کا سہارا لینا چاہتے تھے تاکہ وہ درد وغم کے اس بھنور سے باہر نکل سکیں۔

قسمت سے اُنہیں گورنمنٹ آف انڈیا کے آرکیالوجیکل سروے میں ڈرافٹس مین کی نوکری مل گئی پر اپنی لاأبالی پن کی وجہ سے وہ زیادہ دنوں تک اس نوکری پر ٹکے نہ رہے۔ بہت جلد اُنہوں نے اس نوکری کو خیرباد کہہ دیا۔ اصل میں دادا نے سیمیابی طبعیت پائی تھی۔ وہ ایک جگہہ ٹھہر ہی نہیں پا رہے تھے۔ اُنہوں نے لیتھوگرافی اور اولیو گرافی میں سدھار لانے کی کوشش کی۔ اُنہوں نے راجہ روی ورما پھالکے کے ساتھ پینٹر کا کام کیا۔ بعد میں اپنا چھاپہ خانہ کھولا۔ اُنکی کامیابی کو دیکھ کر کئی لوگ اُنکے بزنس میں حصہ دار بن کر شامل ہو گئے۔ چھپائی کے روایتی طور طریقوں میں بدلاؤ آنا شروع ہو گیا تھا۔ دادا اس بدلاؤ کے حق میں تھے۔ وہ بھی اس بدلاؤ سے مستفید ہونا چاہتے تھے۔ پہلی بار اُنہوں نے اپنے پارٹنروں کو راضی کر کے جرمنی جانے کا فیصلہ کیا۔ جرمنی جانے کا مقصد سیر وتفریح نہیں تھا۔ وہ تو نئی ٹیکنالوجی کی جانکاری حاصل کرنے کی غرض سے وہاں جانا چاہتے تھے اور ساتھ ہی جرمن کی چھپائی مشینوں کا بذات خود جائزہ لینا چاہتے تھے۔ جرمنی سے واپسی کے بعد اُن کے بزنس پارٹنروں کے بیچ چھپائی کے ڈھنگ کو لے کر کچھ ایسے شدید اختلافات پیدا ہو گئے جن کے سبب اُنہیں پرنٹنگ کے اس دھندے سے الگ ہونا پڑا ۔

یہ وہ زمانہ تھا جب عام لوگوں کی تفریح کا واحد زریعہ تھیٹر تھا۔ اُن دنوں ناٹکوں کی بڑی دھوم ہوا کرتی تھی۔ ستم یہ تھا کہ عورتیں ان ناٹکوں میں حصہ نہیں لیتی تھیں اور مردوں کو ہی بھیس بدل کر عورتوں کے کردار نبھانے پڑتے تھے ۔ وہ زمانہ بڑا قدامت پرست تھا۔ عورتیں گھر کی چار دیواری کی بندی ہوا کرتی تھیں۔ اُن دنوں امیروں کی تفریح کے لئے کئی تھیٹر تھے جہاں پر lumire Brothers کی فلمیں دکھائی جاتی تھیں۔

1910 میں دادا ایک حادثے سے دوچار ہوئے۔ اُنکی آنکھوں کی بینائی عارضی طور پر چلی گئی۔ اس حادثے نے اُنکی زندگی کو بدل کے رکھ دیا۔ جب اُن کی بینائی لوٹ کر آ گئی تو پہلی بار اُنہوں نے ایک خاموش انگریزی فلم دیکھی تھی جسکا نام "The life of Christ" تھا۔ اس فلم نے اُن کے اندر ایک ہلچل پیدا کی اور وہ بھی اس طرح کی فلم بنانے کے خواب دیکھنے لگے۔ وہ بھی ہندو دیوی دیوتاؤں کو اسی طرح متحرک کر کے پردے پر پیش کرنا چاہتے تھے۔ لوگ اُنکے اس جنون کو دیوانے کی بڑ سمجھ کر اُنکا مذاق اُڑاتے رہے۔ دادا نابغہ روزگار تھے۔ اُنہوں نے من میں ٹھان لی تھی کہ وہ اس کام کو پورا کر کے ہی دم لیں گے پر مسئلہ سرمایے کا تھا۔ وہ مالی طور پر اتنے مستحکم نہ تھے کہ اس طرح کے پروجیکٹ کو اپنے دم پر پورا کر پاتے۔ اُنکا شوق جنون کی شکل اختیار کر چکا تھا اسلئے وہ اس کاوش میں تن من سے جٹ گئے۔ اُنہیں اپنے اس مشن کو پورا کرنے کے لئے کیا کیا نہ پاپڑ بیلے۔ اُنہوں نے ہر وہ دروازہ کھٹکھٹایا جہاں اُنکی آس بندھی۔ اُنکی دیوانگی کا یہ عالم تھا کہ وہ بے خوار وخواب اپنے اس شوق کی تکمیل میں لگے رہے۔ آخر ایک دن اُنکی یہ دیوانگی رنگ لائی ۔ اُنہیں فلم بنانے کے ہنر میں مہارت حاصل ہوئی۔ اب وہ ایک فلم کے نگیٹو پر تصویریں اُتار کر انہیں متحرک کر سکتے تھے۔ اپنی اس کامیابی کو پردہ سیمیں تک لانے کیلئے اُنہیں پھر سے پیسوں کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ اُن دنوں ملک میں فلم کے تعلق سے کوئی بھی سامان میسر نہ تھا۔ سب کچھ باہر کے ملکوں سے درآمد کر کے ہی وہ اپنے اس شوق کو پورا کر سکتے تھے۔ وہ کہتے ہیں ناہمت مرداں مدد خدا۔ دادا اپنی ضد کے پکے تھے۔ وہ ہار ماننے والوں میں سے نہیں تھے۔ اُنہوں نے پھالکے فلم کمپنی کے نام سے اپنی کمپنی کی داغ بیل ڈال دی۔ سرمایہ جٹانے کے لئے ایک بار پھر اُنہیں کافی جدوجہد کرنا پڑی۔ اس بار بھی دادا نے ہمت نہیں ہاری۔ اُنہوں نے پائی پائی جوڑ کر سرمایہ کھڑا کیا اور 1912 میں پہلی ہندوستانی خاموش فلم ''راجہ ہریش چندر'' بنا کر یہ ثابت کر دیا کہ جن میں سچی لگن ہوتی ہے، جو اپنے فن کی تئیں ایماندار ہوتے ہیں وہ کبھی ناکام نہیں ہوتے ہیں۔ کامیابی ایک نہ ایک دن اُنکے قدم چومتی ہے۔ 3 مئی 1913 کا دن بالی وڈ کی فلمی تاریخ کا وہ سنہرا دن ہے جس دن ہندوستان میں بننے والی پہلی فلم تھیٹر کی زینت بنی۔ پہلی بار اس فلم کو بمبئی کے ایک مشہور تھیٹر Coronation Cinema میں نمائش کے لئے پیش کیا گیا۔ جس کے اداکار: ڈی۔ ڈی دبکے' پی۔ جی سین' بھالا چند پھالکے اور جی۔ وی سین تھے اس فلم کی نمائش کے ساتھ ہی بالی وڈ کی نیو پڑ گئی۔ حالانکہ اس سے ایک سال قبل راچند رگوپال نے جو بعد میں دادا صاحب دوم کے نام سے جانا جاتا تھا اپنے ایک سٹیج ڈرامے کو فلم پر اُتار کر اسی تھیٹر میں پیش کیا تھا مگر تب کسی نے اُسکی اس کاوش کی قدر نہ جانی اور فلم آئی گئی ہو گئی مگر دادا کی فلم ''ہریش چندر'' نے تو فلم کی تاریخ لکھ ڈالی۔ اس فلمی سفر کی ابتدا اور کامیابی و کامرانی کا سہرا دادا صاحب پھالکے کے سر ہی بندھا۔

''راجہ ہریش چندر'' ایک سبق آموز فلم ہے جس میں فلم کے مرکزی کردار کا مہارشی وشوامتر سے ایفائے عہد پورا کرنے کے گرد گھومتی ہے جس میں راجہ ہریش چندر اپنی سلطنت' بیوی اور بچے قربان کر کے اپنا عہد نبھاتا ہے۔

فلم کی ریلیز کے بعد دادا صاحب کی توقع کے برعکس فلم کو اس قدر پذیرائی ملی کہ دیگر شہروں میں نمائش کی غرض سے فلم کی مزید ریلیں تیار کرنا پڑیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ ''راجہ ہریش چندر'' کل چار ریلوں پر مشتمل فلم تھی مگر افسوس انڈین آرکائیوز کے پاس صرف دو یعنی پہلی اور آخری ریل دستیاب ہے۔

اُنکا یہ تجربہ بیحد کامیاب رہا۔ عام لوگوں کے لئے یہ ایک معجزے

سے کم نہ تھا۔فلم کے پردے پر چلتی پھرتی تصویریں دیکھ کرلوگ دانتوں تلے اُنگلی دبا کررہ گئے۔وہ اسے ایک کرشمے سے تعبیر کرنے لگے۔ہرطرف فلم نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ہر طرف دادا کا طوطی بولنے لگا۔’’ہریش چندر‘‘ کی کامیابی کے بعد دادا صاحب نے پیچھے مڑ کرنہیں دیکھا۔اُنہوں نے یکے بعد دیگرے کئی ساری فلمیں بنائیں۔جیسے 1914 میں’’موہنی بسماسر‘‘ ’’ساوتری ستیوان‘‘1915 میں’’سلوگنا راسا‘‘17-1916 میں اُنہوں نے’’راجہ ہریش چندر‘‘ کو ایک نئے روپ میں پیش کیا۔1918 میں’’کرشنا جنما‘‘ ’’کالیا مردان‘‘ 1923 میں’’ستی مہا نندہ‘‘ 1932 میں’’ستیو بندھن‘‘ 1937 میں’’گنگا وترن‘‘ جیسی خاموش فلمیں بنا کر اُنہوں نے ایک اتہاس رچ لیا۔اُنہوں نے فیچر فلموں پر ہی اکتفا نہ کیا۔اُنہوں نے شارٹ فلمیں ڈاکومینٹری فلمیں،کارٹون فلمیں،کامیڈی فلمیں بھی اسی جوش اور لگن سے بنائیں۔لوگوں کی دلچسپی فلموں میں بڑھنے لگی اور بہت سارے کاروباری لوگ فلموں میں پیسہ لگانے کے لئے تیار ہو گئے۔دادا نے ہندوستان فلمز کے نام سے ایک فلم کمپنی کھولی جسمیں بمبئی کے پانچ حصہ دار تھے۔ان سب نے اس کمپنی میں پیسہ لگا یا تھا۔اُنہوں نے سوچا تھا کہ وہ تخلیقی کاموں پر زیادہ وقت صرف کر پائیں گے اور کاروباری امور حصہ دار سنبھالیں گے۔ بہت جلد وہ اپنے پارٹنروں کے طور طریقوں سے اوبنے لگے۔کاروباری ذہنیت رکھنے والے ان پارٹنروں سے وہ اس حد تک دکھی ہوئے کہ 1920 میں اُنہوں نے اس کمپنی سے استعفا دیکر اپنے آپ کو کمپنی سے الگ کر دیا۔وہ اس حد تک دل برداشتہ ہو چکے تھے کہ کمپنی سے الگ ہوتے ہی اُنہوں نے فلموں سے سنیاس لینے کا فیصلہ کیا۔

فلموں سے الگ ہونے کے بعد اُنہوں نے’’رنگ بھومی‘‘ نام کا ایک ناٹک لکھا جسنے ہندوستان کے کئی شہروں میں کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔اس دوران’’ہندوستان فلمز‘‘ کمپنی دادا کے الگ ہونے کے بعد کافی خسارے میں آگئی تھی۔ پانچوں حصہ دار فلم کی باریکیوں سے نابلد تھے اس لئے اُنہیں بہت ٹوٹا اُٹھانا پڑا تھا۔وہ سمجھ چکے تھے کہ وہ دادا کے بنا پتوار بنا کشتی کی طرح تھے۔اُنہیں اس بھنور سے دادا ہی نکال سکتے تھے۔اُنہیں دادا کی منت سماجت کر کے کمپنی میں واپس بلانا پڑا۔دادا نے اس کمپنی کے لئے چند فلمیں ڈائرکٹ تو کیں مگر وہ دل سے اس کمپنی کے ساتھ جڑ نہ پائے۔وہ ایک گھٹن سی محسوس کرتے رہے۔چند سالوں کے بعد اُنہوں نے’’ہندوستان فلمز کو ایک بار پھر خیر باد کہہ دیا۔

فلمیں اپنے ارتقائی دور میں داخل ہو چکی تھیں۔یورپی ممالک نت نئے تجربے کر رہے تھے۔ دادا کو لگا کہ وہ اس میدان میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔یہ بات اُنھیں اندر ہی اندر کھانے لگی۔فلمیں اب خاموش نہیں رہ گئی تھیں بلکہ اب تو تصویریں بولنے لگیں تھیں۔دادا نے اپنے اُنیس سالہ فلمی کیریر میں 95 فلمیں اور 26 شارٹ فلمیں بنائیں۔اُنکا فلمی سفر خاموشی سے ہی گزر گیا۔وہ اپنے اس خواب کو شرمندہ تعبیر نہ کر پائے کہ اُنکی فلمیں بھی یورپی فلموں کی طرح بولنے لگیں۔بولتی ہوئی فلموں کے آنے کے ساتھ ہی دادا کے کیریر کا خاتمہ ہوا۔اُنہوں نے 1932 میں اپنی آخری خاموش فلم’’ستیو بندھن‘‘ بنائی جسے بعد میں ڈب کر کے پیش کیا گیا۔اُنہوں نے 1937 میں اپنی آخری اور پہلی بولنے والی فلم’’گنگاوترن‘‘ بنائی جو بزنس کے اعتبار سے بری طرح ناکام رہی۔وہ اس صدمے سے بڑے دلگیر ہو گئے اور اُسکے بعد وہ فلموں سے دستبردار ہو کے ناسک چلے گئے جہاں 16 فروری 1944 کو اُنہوں نے ہمیشہ کے لئے اپنی آنکھیں موندلیں۔

1969ء میں حکومت ہند کی جانب سے دادا صاحب پھالکے کے نام پر ایوارڈ کا اجراء کیا گیا۔اب تک اکتالیس فلمی شخصیات کو لائف ٹائم خدمات برائے انڈین سینما ایوارڈ دیے جا چکے ہیں جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

سال	نام	شعبہ	مقام
1969	دیویکا رانی	اداکارہ	آندھرا پردیش
1970	بی۔این سرکار	فلم ساز	مغربی بنگال
1971	پرتھوی راج کپور	اداکار	پنجاب
1972	پنکھج ملک	موسیقار	مغربی بنگال
1973	روبی مائرز (سلوچنا)	اداکارہ	مہاراشٹر
1974	بومی ریڈی نرسیمھا ریڈی	ہدایتکار	آندھرا پردیش
1975	دھریندر ناتھ گنگولی	اداکار،ہدایتکار	مغربی بنگال
1976	کانن دیوی	اداکارہ	مغربی بنگال
1977	نتن بوس	مصنف،ہدایتکار	مغربی بنگال
1978	رائے چندر بورال	موسیقار،ہدایتکار	مغربی بنگال
1979	سہراب مودی	فلم ساز،ہدایتکار	مہاراشٹر
1980	پیدی جے راج	اداکار،ہدایتکار	آندھرا پردیش
1981	نوشاد علی	موسیقار	اُتر پردیش
1982	ایل۔وی پرساد	فلمساز،ہدایتکار	آندھرا پردیش
1983	دُرگا کھوٹے	ادکارہ	مہاراشٹر
1984	ستہ جیت رے	مصنف،ہدایتکار	مغربی بنگال
1985	وی شانترام	فلمساز،ہدایتکار	مہاراشٹر
1986	بی۔ناگی ریڈی	فلمساز	آندھرا پردیش
1987	راج کپور	ادکار،ہدایتکار	مہاراشٹر
1988	آشوک کمار	اداکار	بہار
1989	لتا منگیشکر	گلوکارہ	مہاراشٹر
1990	اکّی نینی نگیسور راؤ	اداکارہ	آندھرا پردیش
1991	بھالجی پندھارکر	فلمساز،ہدایتکار	مہاراشٹر

1992	بھوپن ہزاریکا	موسیقار	آسام	2001	لیش چوپڑا	فلمساز،ہدایتکار	پنجاب
1993	مجروح سلطان پوری	شاعر	اُترپردیش	2002	دیوآنند	اداکار،ہدایتکار	پنجاب
1994	دلیپ کمار	اداکار	مہاراشٹر	2003	مرینل سین	ہدایتکار	مغربی بنگال
1995	راج کمار	اداکار	کرناٹکا	2004	اڈور گوپال کرشنن	ہدایتکار	کیرالہ
1996	شیواجی گنیش	اداکار	تامل ناڈو	2005	شیام بینگل	ہدایتکار	آندھراپردیش
1997	پردیپ	شاعر	مدھیہ پردیش	2006	تپن سینہا	ہدایتکار	مغربی بنگال
1998	بی۔آر۔چوپڑا	فلمساز،ہدایتکار	پنجاب	2007	منّاڈے	گلوکار	مغربی بنگال
1999	ہری شی کیش مکھرجی	ہدایتکار	مغربی بنگال	2008	وی۔کے۔مورتھی	فوٹوگرافر	کرناٹکا
2000	آشا بھونسلے	گلوکارہ	مہاراشٹر	2009	ڈی۔رامانائیڈو	فلمساز	آندھراپردیش

''دامانِ اضطراب''

ہمارے عصر کے سینئر اور ثقہ شاعر محمود الحسن (ج۔ر) کی ایک دلرُبا غزل

دل کیا ہے، ایک کلبۂ احزانِ اضطراب
جاں ہے تو وہ بھی سوختہ سامانِ اضطراب

قلب ونظر کو غمّضِ بصر کا پیام دے
قلب ونظر ہیں سلسلہ جنبانِ اضطراب

آئی ہے میرے کنجِ سیہ میں تو رات بھر
اب جھلملائے شمعِ شبستانِ اضطراب

دیکھا کیا وہ بحر کی موجوں کو روز وشب
ساحل سمجھ سکا نہ مگر شانِ اضطراب

دو روزہ انبساط کی خاطر نہ جانے کیوں
اہلِ خرد ہیں درپئے درمانِ اضطراب

مانا مسرّتوں کی بھی چھب دلفریب ہے
ہے شانِ اضطراب مگر شانِ اضطراب

وہ اور ہوں گے جن کو غرض ہے نشاط سے
ہم اہلِ دل ہیں ہم ہیں ثناخوانِ اضطراب

تسکیں کا نام موت کو بخشا گیا ہے کیوں
کیوں زندگی کو دے دیا عنوانِ اضطراب

میں کیا کہوں کہ کیسا سکون ہے جو مل گیا
مجھ کو ترے وصال سے اے جانِ اضطراب

حسرت بھی ہے، امید بھی ہے، آرزو بھی ہے
کیا کیا ہے دل کے واسطے سامانِ اضطراب

رُک سی گئی ہے سانس تری اے مریضِ غم
وا ہو گیا ہے یا درِ زندانِ اضطراب

یہ زندگی بہشت سے کمتر نہیں، اگر
حاصل دل ونظر کو ہو عرفانِ اضطراب

مانا کہ دلفریب ہے آرائشِ جمال
لیکن کہاں وہ زلفِ پریشانِ اضطراب

محمودؔ راہِ منزلِ جاناں پہ آج بھی
چلتے ہیں قافلے تہِ دامانِ اضطراب

☆

''درّۂ خیبر''

حفیظ جالندھری (●)

○

نہ اس میں گھاس اُگتی ہے نہ اس میں پھول کھلتے ہیں
مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں
کڑکتی بجلیوں کی اس جگہ چھاتی دہلتی ہے
گھٹا بچ کر نکلتی ہے' ہوا تھرّا کے چلتی ہے
یہ ناہموار چٹیل سلسلے کالی چٹانوں کے
امانت دار ہیں گویا پرانی داستانوں کے
یہی پگڈنڈیاں نیرنگِ ہستی کی نظیریں ہیں
یہی تو قسمتِ اقوام کی خونی لکیریں ہیں
یہ ذرّے رہرووں کی ہمّتوں پر مسکراتے ہیں
زبانِ حال سے ماضی کے افسانے سُناتے ہیں
یہ پتھر قافلے والوں کے ٹھکرائے ہوئے سے ہیں
کسی آتش قدم کی راہ میں آئے ہوئے سے ہیں
لئے بیٹھی ہیں یہ ویرانیاں محشر کے ہنگامے
ہیں ان سنسانیوں میں دفن دُنیا بھر کے ہنگامے
یہ بے آباد، دہشت ناک وحشت خیز ویرانہ
ہے لاتعداد شور انگیز تہذیبوں کا افسانہ
انہی دشواریوں سے آریوں کا کارواں گزرا
زمینِ ہند پر جاتا ہُوا اک آسماں گزرا
اسی رستے سے ہو کر ہنز اور اہلِ تتار آئے
کئی خانہ خراب آئے، کئی آباد کار آئے
یہ مٹّی شانِ اسکندر کی ہے آئینہ دار اب تک
اُسی آندھی کا باقی ہے یہاں گردوغبار اب تک
اسی تابش میں چمکی تھیں مسلمانوں کی شمشیریں
انہی فولاد کے دیووں سے ٹکرائی تھیں تکبیریں
فلک نے اس زمیں پر بارہا محمود کو دیکھا
بہادر غوریوں کے طالع مسعود کو دیکھا
اُڑی یہ خاک برسوں تک غبارِ کارواں ہو کر
فلک پر چھا گئی دلدوز آہوں کا دُھواں ہو کر
اسے تیمور نے روندا، اسے بابر نے ٹھکرایا
مگر اس خاک کی عالی وقاری میں نہ فرق آیا
یہاں سے بارہا گزرے اٹالے بارگاہوں کے
قدم چُومے ہیں اس مٹّی نے اکثر بادشاہوں کے
کہاں اب وہ شکوہ نادری، اقبالِ ابدالی
لیا کرتے تھے جن سے سخت پتھر درسِ پامالی
یہ ہے وہ خارزار، اس میں ہزاروں آبلے پھوٹے
نہیں ٹوٹے مگر یہ سنگدل کانٹے نہیں ٹوٹے
ہوائے درّۂ خیبر ہے محوِ انتظار اب بھی
کہ آجائے کوئی رہوارِ وحشت پر سوار اب بھی

☆

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وقار جاوید (راولپنڈی)

برادرِ گرامی قدر گلزار صاحب، سلام و رحمت۔

چہارسو کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ آنکھیں ایک لمحہ کو چکا چوند ہوئیں۔ جب نظر ٹھہری تو سرورق پر اپنا چہرہ اور اپنی تصویر دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور پھر بقول غالب: اسد خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ گلزار بھائی آپ نے مجھ جیسے کم آمیز اور کم نوا کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ ہر مرتبہ کی طرح سرورق سے لیکر آخری صفحہ تک انتہائی نفاست اور خوبصورتی سے سجایا ہوا گلدستہ ملا جس میں احساسِ رنگ و بُو افسانے، نقشہ نیا دیوار پر، شمع عرفان، سفرنامہ، ڈرامہ، داستان حیات، آئینہ فن اور رس رابطے سمیت کیا کچھ نہیں ہے۔ اور یہ سب آپ یعنی گلزار جاوید، دوستوں، مداحوں اور قلم کاروں کو حیاتِ جاوید عطا کرنے میں خلوص اور خوش دلی سے لگے ہوئے ہیں نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا کے خوب۔

میں آپ کا بہت ہی ممنون ہوں کہ مجھ ناچیز کے لئے آپ نے بہت ہی خوبصورت سرورق تیار کرایا۔ نظم و نثر کے ساتھ رسالے کے اندر نایاب اشیاء فراہم کیں۔ مثلاً میرا اشارٹ انٹرویو (براہِ راست) خوبصورت اور متنوع عنوانات کے تحت انتخاب، میرے اساتذہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری، پروفیسر سحر انصاری، ڈاکٹر بشیر بدر، فاری شا، عطیہ سکندر علی، عرفان عابدی، فیصل عظیم اور شعرو نیہ رضوی نے مزین کیا۔ اگر آپ اجازت دے تو میں ''متاع چہارسو'' کو اپنے دامن میں سمیٹتے ہوئے اپنی شاعری کا انتخاب کرنے والے محترم اقبال بھٹی، عزیزہ نازش فردوس، آنسہ عینی عقیل، اور جناب صغیر بلگرامی کا شکریہ ادا کروں۔ میری خواہش ہے بیٹی بینا جاوید اور عزیزم انعام الحق صاحب کو بھی خراجِ تحسین پیش کروں۔ اس موقع پر میں چہار سو کے بانی مدیر اعلیٰ سید ضمیر جعفری مرحوم و مغفور کو بھی فراموش نہیں کر سکتا۔ کس قدر خوبصورت ادبی پودا بشکل چہارسو لگایا اور اس کی نگہداشت و پرداخت کے لیے گلزار جاوید جیسا جفاکش مدیر عطا کر گئے۔ یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ''گلزار'' سے اس ناچیز کو خصوصی نسبت ہے۔ آپ جس دلجمعی، خلوص اور لگن سے اپنا کام کر رہے ہیں اس کے لیے میں آپ کی صحت و سلامتی اور بڑھتی ہوئی صلاحیتوں کے لیے دعا گو ہوں اور یہ شعر خاص طور پر آپ کی نذر کرتا ہوں۔

وہ تو بند سرابوں میں ہیں اُن کو کیا معلوم
اصل میں کام ہوا کے رُخ پر دیا جلانا ہے

نقاش کاظمی (کراچی)

محبِّ گرامی گلزار جاوید، سلام۔

مدیرانِ ادبی جرائد میں آپ کی انفرادیت یہ ہے کہ جہاں آپ نے ''چہارسو'' کو چند ایک اہم روایات کا پابند کیا ہے وہاں جگہ جگہ اپنی جدّت طرازی سے بھی چمکاتے اور چونکاتے رہتے ہیں۔ قدرت نے آپ کو سرپرائز دینے کی زبردست صلاحیّت ودیعت کی ہے۔ اور کچھ نہیں تو مختلف شعبہ ہائے ادب کے عنوانات کو ہی دیکھ لیں۔ ''صبح نو کے اجالے۔ خواہشوں کا انبار۔ ماتم صد آرزو۔ نشانِ راہ۔ رس رابطے۔۔۔۔ اسی طرح نقشِ لاثانی۔ متاعِ غنچہ و گل۔ رشتے راشن کارڈ نہیں۔۔۔ میری غزلیہ شاعری پر مامون ایمن کی تحریر کو آپ نے 'خطائے عاشقی' کا عنوان دے کر حیران ہی کر دیا۔ تازہ پرچے میں آپ نے میری نظم '' بدصورتی کے درمیان'' کو شعبۂ نظم کے عنوان میں بدلا۔ ''احساسِ رنگ و بو۔ نقشہ نیا دیوار پر۔ پرچے میں یہ جدّت طرازیاں بہرطور پرچے کی پوری فضا کو تغیر و تحیر کا رنگ دے دیتی ہیں۔ انور سدید کے مکتوب، اور شہناز خانم کی زبانی آپ کے ذاتی اور جانکاہ صدمے کا علم ہوا۔ اس طرح بھی آپ نے اپنی انفرادیت بنائے رکھی۔۔ ہائے مگر ایسی خاموشی کہ جو اس سے آگاہ ہو اس کا کلیجہ شق ہو جائے۔ بھائی گلزار ایک دن یہ ہونا ہی تھا۔ جدائی لکھی ہوئی تھی سو آپ بھری دنیا میں تنہا ہو گئے۔۔ اپنے آنسوؤں میں میرے آنسو بھی شامل کر لیں۔

عبداللہ جاوید (کینیڈا)

برادرِ عزیز و مکرم گلزار جاوید! سلام مسنون۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ ملا۔ پڑھا۔ حسبِ معمول آپ کی محنت شاقہ کا غماز ہے۔ آپ کے انٹرویو کا طریقۂ واردات بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ چونکہ میں وکالت کر چکا ہوں، اس لیے زیادہ محظوظ ہوتا ہوں۔ آپ کا مخاطب کچھ چھپانا چاہے بھی تو نہیں چھپا سکتا۔ بہت خوب! امید کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

امین راحت چغتائی (راولپنڈی)

بھائی گلزار جاوید صاحب! اسلام علیکم۔

چار روز قبل ''چہارسو'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا جس کے لیے شکر گزار ہوں۔ نقاش کاظمی کا ''قرطاسِ اعزاز'' پسند آیا۔ بے شک، شاعر اعزاز نہ صرف ہمارے شہر کے بلکہ اردو دنیا کی مشہور و مقبول ادبی شخصیت ہیں اور جیسا کہ زیرِ نظر جریدے میں اُن کی تخلیقی جہتیں اجاگر کی گئی ہیں شاعری اور نثر میں بالعموم اور تقریروں میں بالخصوص اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں ورنہ کراچی کے نامور، باکمال شعراء اور ادباء کے ہجوم میں گلشنِ اقبال کی شائستہ سوسائٹی میں اُن کے نام پر سڑک کیوں موسوم ہوتی۔ مجھے ذاتی طور پر خوشی ہوئی کہ میرے ایک دوست کو آپ نے بھی یہ اعزاز بخشا ان پر لکھے گئے مضامین میں یوں تو ایک سے بڑھ کر ایک تحریر ''اوراقِ چہارسُو'' کی رونق بنی ہے مگر مجھے ذاتی طور پر محمود شام کی ''سفید رنگ کی تلوار'' زیادہ چمکتی نظر آئی۔ خصوصاً اُسکی یہ کاٹ جو آخری سے قبل کی عبارت میں موجود ہے:

''.....لیکن حقیقت یہ ہے کہ واقعات، مشاہدات اور محسوسات کو غزل کے پیکر میں ڈھلنے کے لیے طویل آنچ کی ضرورت ہوتی ہے۔ نظم میں

شعری تجربہ نیم پختہ بھی رنگ جمالیتا ہے۔غزل کا شعر بننے کے لیے ہر تجربے کو کئی آنچوں سے گزرنا پڑتا ہے''۔

مجھے توقع ہے کہ بھائی نقاش کاظمی میرے تبصرہ (محمود شام) پر تبصرے کا بُرا نہ منائیں گے اور غزل کہتے وقت اس کی باریکی کا خیال رکھیں گے۔ بلاشبہ وہ نظم کے بہت اچھے شاعر ہیں۔افسانوں میں کوئی بھی افسانہ دل کو نہیں لگا سوائے نجیب عمر کے ''افعیِ جاں گداز'' کے۔ہاں ڈرامہ ''آدھی گھر والی'' (گلزار جاوید) کی بات اور ہے جس میں موجود اونچی سوسائٹی کے روز وشب کے حوالے سے ہلکے پھلکے انداز میں ایک تلخ حقیقت پیش کی گئی ہے۔مجھے پسند آیا۔

غالب عرفان (کراچی)

''چہارسو'' گلزار جاوید صاحب' السلام علیکم۔

''چہارسو'' کی خوشیاں میسّر آئیں۔یہ ہر بار نئے انداز کے گلزار کی تازگی اور شگفتگی جاوید لے کر آتا ہے۔دلِ مضطرب اور نگاہِ مشفقانہ کے ساتھ حاضر ہوں۔نقاش کاظمی کے خصوصی قرطاسِ اعزاز نگاہِ شفیقانہ کی عکاسی کرتا ہے۔نقاش کاظمی نے رسالہ عکاس جاری کیا تھا (شاید ابھی تک جاری ہو) ایک پرچہ انھوں نے مجھے بھی بھیجا تھا۔جو ''نقش نقوش'' کے اعتبار سے مظہرِ فنِ نقاش تھا۔میں نے شکر گزاری کا عریضہ بھیجا تھا۔نقاش کاظمی ٹھہرے ''سرتاپا'' معروف انسان' پھر گوشۂ چشمے ادھر نہ کیا تھا۔کاظمی صاحب کی شاعری متاثر کرتی ہے۔

اے ماں کبھی تجھ پر جو کوئی وقت پڑا ہے
میداں میں تری گود کے پالے نکل آئے

حالیہ تباہ کن سیلاب کے تناظر میں یہ شعر از حد پُر اثر ہے۔مدیر نقوش سے عزیز احمد کی سودے بازی' خاصا حیرت انگیز ہے۔میرے خیال میں وہ سودے بازی نہیں جسے ایسا قرار دیا گیا ہے۔عزیز کا مطالبہ اگرچہ تعجیلاً تھا مگر غیر مناسب نہ تھا۔اردو ادب میں عزیز احمد بڑا انام ہے۔عزیز احمد نے ایسی بلندی ایسی پستی اور گریز کے سے ناول اردو ادب کو دیے ہیں۔ان کا مقام اس درجے کا ہے کہ نام نہاد سودے بازی کے ذیل میں آنے والے خطوط کی اشاعت سے حیرت ہوتی ہے۔افسوس یہ ہے کہ ان دنوں ''باقیات'' کے عنوان سے مقبول و معروف شاعروں کا متروک کیا ہوا کلام بھی سامنے لایا جارہا ہے۔آپ ہی کہیے اس تخفیف سے ادب کی کیا خدمت ہوسکتی ہے۔''رس رابطے'' رسالے کا ''معتبر مقام'' حصہ ہے اس سے بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔کبیر داس نے کیا خوب کہا ہے

کاگا سب تن کھائیو' چن چن کھائیو ماس
دونیناں مت کھائیو' پیا ملن کی آس

نظر آتا ہے میری طرح لغت سے رابطہ بھی کم ہوتا جارہا ہے۔

آصف ثاقب (ایبٹ آباد)

گلزار جاوید صاحب' تسلیمات۔

واہ گلزار بھائی بہت خوب' حق ادا کردیا آپ نے' کبھی مایوس نہیں کرتے۔رسالہ بہت معیاری اور اعلیٰ طرز نگارش کا آئینہ دار ہے۔آپ کا انٹرویو ایک بار پھر بازی لے گیا۔انٹرویو میں ''لہجے کو مرمر کے پالنا پڑتا ہے'' میر سے منسوب ہے۔جب کہ کشفی صاحب کے مضمون میں ''آواز کو مرمر کے پالنا پڑتا ہے'' فراق کے حوالے سے ہے؟ حمایت علی شاعر' سحر انصاری اور فرمان صاحب کے مضامین بہت معلوماتی تھے۔فرمان صاحب سے پہلی دفعہ نیویارک میں دو ماہ پہلے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی تھی۔افسانوں میں سلطانہ مہر نے ایک بہت مشکل مضمون کو بہت چابکدستی سے نبٹایا ہے۔ایسے مضامین کو باندھنے میں جس سلیقے کی ضرورت ہوتی ہے انھوں نے بہت خوبی سے نبھایا۔احمد ذین الدین صاحب کا افسانہ اپنے بیانیہ کی وجہ سے بہت عمدہ ہے' زبان پہ گرفت اور مواد کی پختگی سے یہ ایک اچھا افسانہ بن گیا ہے۔غزلیں اور نظمیں سب اچھی تھیں۔حالات کے حساب سے انور سدید کا یہ شعر بہت خوب تھا:

بہ گئیں سیلاب میں ساری کتابیں شہر کی
بچ گیا ہے وہ جو تھا لکھا گیا دیوار پر

مامون ایمن منجھے ہوئے شاعر ہیں۔ان کا یہ شعر پسند آیا

تسلسل آگاہی کا روک گیا ہے
نظر سے اک ذرا پردہ اٹھا ہے

آپ کا ڈرامہ بہت اچھا تھا' ایک بیباک قلم سے ایک گھناؤنے سیٹ اپ سے پردہ اٹھایا ہے۔خوب تسلسل قائم رکھا ہے اور قاری کی دلچسپی بھی قائم رہی' اتنا اچھا شمارہ نکالنے پر مبارک باد۔

سید سعید نقوی (نیویارک)

برادرِ مکرّم گلزار جاوید صاحب! آداب و نیاز۔

تازہ چہارسو میں نقاش کاظمی پر قرطاسِ اعزاز اور ان سے متعلق مضامین اور نظمیات بہت خوبصورت بھی اور بے حد معلوماتی بھی ہیں لیکن خدا معلوم کیوں اب کی بار ''براہِ راست'' کے کالم میں وہ بات مجھے نظر نہیں آئی جو ہمیشہ مسحور کردیتی رہی ہے۔اُمید ہے میری اس گُستاخانہ جرأت کے لیے آپ مجھے معاف فرمادیں گے لیکن میں نے جو محسوس کیا اُسے تحریر کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔نقاش صاحب کا کلام بہت پختہ اور معنی خیز ہے۔''سپاہِ آزادی کا انقلابی مجاہد'' کے تحت حسرت موہانی پر اُن کا مضمون ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اور بہت جامع ہے۔افسانوں میں سلطانہ مہر' عظمیٰ صدیقی اور خاص طور پر عزیزہ ڈاکٹر رینو بہل کی کہانیاں بہت خوب ہیں۔حمیدہ معین رضوی کا سفرنامہ ''خوف اور اجنبیت کے درمیاں'' بھارت اور پاکستان کے حالات کے کئی پہلوؤں کی کامیاب نشان دہی کرتا ہے۔مجتبیٰ حسین پر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مقالہ موصوف کی شخصیت اور فن کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔ہاں عزیز احمد (مرحوم) سے متعلق رؤف خیر کا مضمون خاصا معلوماتی تو ہے لیکن کسی معروف ادیب کی موت کے بعد اس کی ذات کے کسی منفی پہلو کو یوں اجاگر کرنا کچھ معیوب سا لگتا ہے۔آپ کے

تحریر کردہ ڈرامہ ''آدھی گھر والی'' پر ایک سحر پرور تاثر آپ کو میل کے ذریعہ لکھ چکا ہوں اور سچ جانیے تو آپ کی اس تحریر کا سُرور ابھی تک ذہن و دل پر قائم ہے۔ مبارک ہو۔

حصہ نظم میں انور سدید، شباب للت، عرش صہبائی، مشکور حسین یاد، نقشبند قمر نقوی، سرور انبالوی، مامون ایمن، صابر عظیم آبادی، غالب عرفان، ندیم ہاشمی، مراق مرزا، ملک زادہ جاوید اور بھگوان داس اعجاز کے کلام نے خوش گوار تاثر دیا۔ ہاں اس بار کمپوزنگ کی کئی اغلاط در آئی ہیں۔ یہ فروگزاشتیں نظم میں خاص طور پر کھٹکتی ہیں اور یہ امر آپ کی بھرپور توجہ کا محتاج ہے۔ میں سرور انبالوی صاحب کا ممنون ہوں کہ انھوں نے میرے سلام اور اظہار تشکر کو شرفِ قبولیت بخشا۔ برادرم نارنگ ساقی صاحب کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے ناچیز کے کلام کو پسند فرمایا۔

مہندر پرتاپ چاند (انبالہ، بھارت)

برادرِ محترم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

رات پروفیسر مسکین احمد منصور ملنے آئے تو اُن سے چہارسو کا ستمبر اکتوبر ۲۰۱۰ء کا شمارہ ملا۔ آپ کا بھی شکریہ اور ان کا بھی۔ اس میں مجھ سے متعلق بہت سی باتیں ہیں جن کو پڑھتے ہوئے میں سوچ رہا تھا یہ کہ کس حسن منظر کا ذکر ہے۔ میرا نہیں کسی اور کا ہو سکتا ہے۔ بہرحال ان سب کا شکریہ ادا کرنا مجھ پر فرض ہے جنہوں نے رس رابطے میں حصّہ لیا۔ سوائے اُن صاحب کے جن کا خط سب سے اوپر دھرنا دیئے بیٹھا ہے۔ خدا آپ کو سلامت رکھے۔ آمین

حسن منظر (کراچی)

محترم گلزار جاوید صاحب، تسلیمات!

چہارسو سے میرا تعلق حسن منظر نمبر سے جڑا ہے۔ ڈاکٹر صاحب میرے بہت عزیز، قریبی اور بے تکلف دوست ہیں لیکن چہارسو کے مطالعہ کے بعد اِن کی شخصیت کے کچھ نئے اور دلکش پہلو سامنے آئے ہیں۔ بار بار پڑھ کر جی نہیں بھرتا ہر بار ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا کوئی نیا گوشہ سامنے آجاتا ہے۔ ہر بار ان کا مفہوم بدل جاتا ہے، نئے رنگ اور خوشبو کے ساتھ یہ جدّت طرازی قابلِ دید بھی اور قابل داد بھی۔ تازہ شمارہ آج ہی دستیاب ہوا ہے۔ صفحہ نمبرا پر چھپی ہوئی دعائیہ نظم ''مشکل کشا'' نے دل میں درد جگا کر آنکھیں نم کر دیں۔ بڑی پر اثر نظم ہے۔ گرچہ چاروں طرف سے ہم اپنی بداعمالیوں کے باعث، طرح طرح کے طوفانوں میں گھرے ہوئے، لیکن آخری حصے میں یہ نظم آس و امید کا دیا روشن کرتی ہے۔ اس شمارے میں نقاش کاظمی صاحب کی ادبی خدمات بڑی تفصیل کے ساتھ نظروں کے سامنے آئی ہیں۔ اردو ادب میں ان کے مقام کا پتہ چلتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس طرح کے لوگ ہمارے درمیان میں تھے اور ہیں۔ ''براہِ راست'' پڑھ کر دل خوش ہو گیا۔ کم لفظ زیادہ مفہوم۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، حمایت علی شاعر، ڈاکٹر بشیر بدر، محمود شام اور سحر انصاری کے مختصر مضامین نقاش کاظمی کی شخصیت کو خوب اجاگر کرتے ہیں۔ ایک واضح تصویر تخیل کی آنکھ کے سامنے آجاتی ہے۔ نقاش کاظمی کا مضمون ''سپاہ آزادی کا انقلابی مجاہد'' اقبال کے الفاظ میں ''مجاہد کی اذان'' ہے (ملا کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور) ''چکی کی مشقت'' کے ساتھ ساتھ ''مشقِ سخن'' کرنے والے ایک درویش صفت، سچے اور کھرے انسان کی یاد تازہ کرتا ہے۔ دکھ کی بات ہے کہ پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ہم آزادی کے اس متوالے کی قدر نہ کر سکے۔ نقاش کاظمی کی نظموں، غزلوں اور ہائیکوز کا انتخاب قابل تعریف ہے۔ ان کی تحریروں میں سادگی و پرکاری، بے ساختگی و تازگی ہے۔ دو تین اشعار لکھنے کو دل چاہتا ہے۔

غیروں کی طرح آنا، غیروں کی طرح جانا
یہ بھی کوئی آنا ہے، یہ بھی کوئی جانا ہے

روز جس سمت سے ہنستے ہوئے پھول آتے تھے
آج آنگن میں اسی سمت سے پتھر آیا

اور یہ ہائیکو

سکھ کا سپنا بھی
کتنا مشکل ہے یارو
گھر میں رہنا بھی

محمد طفیل، مدیر نقوش کے ساتھ عزیز احمد کی خط و کتابت دلچسپ بھی ہے اور حیران کن بھی۔ عزیز احمد کے ایک ناول کا نام ذہن میں آتا ہے ''ایسی بلندی، ایسی پستی''۔ چہارسو کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں پاکستانی ادیبوں کے ساتھ ساتھ بھارت، امریکہ، کینیڈا اور برطانیہ میں بسنے والوں کی تحریریں بھی پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔ تمام نظمیں، غزلیں اور افسانے قابل مطالعہ ہیں۔ ''آدھی گھر والی'' پر لطف ڈرامہ ہے۔ سالی کی خواہش تو بہت سے دلوں میں ہوتی ہے لیکن اگر بیوی کی کوئی بہن ہی نہ ہو تو کوئی کیا کرے۔

پروفیسر مسکین احمد منصور (حیدرآباد)

برادرِ عزیز گلزار جاوید صاحب، سلام مسنونہ!

بھئی کمال کرتے ہیں آپ! چہارسُو میں نور و نکہت سے چشم بصیرت میں روشنی اور مشام جاں میں معطر اوراق پر پھیلے حروف خوشبو کا بدن اوڑھ لیتے ہیں، سبحان اللہ! اس مرتبہ برادرم نقاش کاظمی کے نام قرطاس اعزاز کا اہتمام ہوا، ان سے میری کراچی میں مختصر ملاقات ہوئی، جی بھر کر بات نہ ہوئی، ان کی کشادہ پیشانی اور روشن آنکھیں، باتوں میں رس سبھی کچھ یاد ہے۔ عرفان عابدی نے ''اندازِ دلبری'' میں کیا خوب کہا:

ادب، شعور، فراست کا خوب رونقاش
ہر ایک نقش، نئے زاویئے، نیا اسلوب

حقیقت یہ ہے کہ آپ نے قرطاسِ اعزاز کے ذیل میں ہمعصر قلمکاروں کی ایک کہکشاں ترتیب دی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی،

حمایت علی شاعر، محمود شام، بشیر بدر، سحر انصاری اور دوسرے بہت سے ناقدین کی تحریروں کو خوبصورت عنوانات کے ساتھ یکجا کر دیا۔ میں اس خیر عمل پر آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور ''چہارسو'' کی بوئے مشکبار پھیلانے کی سعی دلنواز پر آفرین صد آفرین کہہ کر اور نقاش کاظمی کی قامت فکر کو خراج تحسین پیش کرنے پر آپ کیلئے درازیٔ عمر کی دعا کرتا ہوں۔

حسن عسکری کاظمی (لاہور)

میرے گلزار!

چہارسو بابت ماہ ستمبر اکتوبر باصرہ نواز ہوا۔ جس کی کمپیوٹر کاپی تو بہت دن پہلے ہی موصول ہوگئی تھی مگر مکمل طور سے پڑھنے سے قاصر رہا۔ کیونکہ زیادہ دیر تک میں اس مشین پر نہیں بیٹھ سکتا۔ نقاش کاظمی پر براہِ راست خوب ہے اُن کا یہ شعر اچھا لگا۔

خود اپنے دل کو جلاؤ تو کوئی بات بنے
پرائے گھر کو جلانا کوئی بات نہیں

نقاش کاظمی کے دیگر اشعار بھی پسند آئے۔

جو دُور تک تیرے ہونے کا کچھ پتہ نہ چلا
نگاہ لوٹ گئی آہِ بے اثر کی طرح

خورشید انور رضوی کی حمد ایک ایک شعر خوب ہے۔ سلطانہ مہر کا افسانہ زندگی دھوپ ہے۔ دیپک بدکی کا جزیرے پیار کے۔ عظمیٰ صدیقی کا یادوں کا ورثہ طویل ہونے کے باوجود اچھا لگا۔ اور رینو بہل پت جھڑ کے بعد پسند آیا۔ حمیدہ معین رضوی کا سفرنامہ اور ہوا کے دوش پر فیروز عالم صاحب خوب ہیں۔ گوپی چند نارنگ کا مجتبیٰ حسین کا جاپان چلو عمدہ ہے۔ اور آدھی گھر والی اچھا خاصا دلچسپ ہے۔ پڑھتے پڑھتے ہنسی بھی آتی رہی اور عجیب سی خوشی ملتی رہی۔ آپ کے فن کی داد دینا ہی پڑتی ہے، خیال آفاقی کی غزل اچھی لگی۔ شگفتہ نازلی کی غزل بی۔ ایس۔ جین جوہر کی غزل اور مامون ایمن کی غزل بھی خوب ہے۔ اور مہندر پرتاپ چاند کی غزل بھی ندرت و تازگی کا آئینہ دار ہے۔

یوگیندر رہبل تشنہ (دہلی، بھارت)

برادرم گلزار جاوید صاحب، سلام مسنون۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ مل گیا ہے۔ ممنون ہوں کہ آپ اس گوشہ نشین کشمیری کو یاد رکھتے ہیں اور اپنے قیمتی مجلّہ کے درشن کرواتے ہیں۔ میرے دوست جناب نقاش کاظمی پر آپ نے ''قرطاسِ اعزاز'' مرتب کر کے اردو ادب پر احسان کیا ہے۔ آپ نے مختلف عنوانات کے تحت جس طرح مجلّہ کو خوبصورت اور خوب سیرت بنایا ہے وہ آپ کے حسن سلیقہ پر گواہ عادل ہے۔ میں آج کل بیمار ہوں یعنی میرے گھٹنوں میں درد رہتا ہے تاہم اردو کلام کا ساتواں مجموعہ کمپوز کروالیا ہے اور اپنے نام مشاہیر ادب کے خطوط کا انتخاب بھی زیر ترتیب ہے۔ مظفر آباد کی تاریخ پر میری کتاب شائع ہوگئی ہے اور ''سفرنامہ کشمیر'' سرینگر میں چھپا ہے۔ آپ دعا کریں کچھ نہ کچھ لکھتا رہوں۔ خدا کا فضل ہے کہ مختلف عنوانات کے تحت میری ستر کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

صابر آفاقی (مظفر آباد)

گلزار جاوید صاحب! خلوص! آداب!

چہارسو کا تازہ شمارہ براہِ راست راولپنڈی سے موصول ہوا یہ آپ کی بندہ نوازی ہے بہت شکریہ! نقاش کاظمی پر گوشہ پسندیدہ ہے! آپ کے سوالات پُر مغز ہیں! ترقی پسندانہ اور روایتی لہجے کی آمیزش کے باوجود نقاش کاظمی کے شعری اسلوب کا جائزہ معتبر نقادوں نے اپنے اپنے طرز نگارش میں اچھا پیش کیا۔ فنکاروں پر چہارسو کے گوشے فنکار کی فنی حیثیت کو خوب اجاگر کرتے ہیں!! آئینہ فن میں ممتاز نقاد گوپی چند نارنگ نے اپنے سدا بہار شش جہاتی تنقیدی تجزیے کے ذریعے ''چلو جاپان'' کا گلو گلزار محاسبہ پیش کیا ہے! گلزار جاوید کا ڈراما ''آدھی گھر والی'' ڈرامائی بنت کاری۔ فکر انگیز مکالماتی پھلجھڑیاں اور مردانہ ہوسانہ نفسیاتی کمزوریوں کا زمینی قہقہہ زار ہے۔ رس رابطے میں آصف ثاقب صاحب کا مراسلہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی کہ وہ میرے نواحی پہاڑی علاقے ''رھلو'' سے متعلق ہیں ساتھ ہی بے شمار دکھ بھی ہوا کہ بٹوارے نے انہیں نے بے وطنی کے زخم دیئے یہ المیہ لاکھوں نے جسم و روح پر بھوگا ہے خدا ہمارے آصف ثاقب صاحب کو انکے تمام متعلقین کو باصحت۔ باحیات و بابرکات رکھے!! آمین۔ شاعری ہر بار کی طرح اس بار بھی بہت بھرپور ہے مگر انور سدید، غالب عرفان کراچی کے کہنہ مشق شاعر ہیں افسوس انکی موجودہ غزل کے مندرجہ ذیل شعر خط کشیدہ الفاظ کے غلط تلفظ کے استعمال سے بے بحر ہو گئے۔

اب اُس کے ہاتھ میں کیا ہے پتہ نہیں جس نے
مری پیشانی پہ چھوڑا نشان پتھر کا
عجیب بات ہے کہ اُس کے شہر میں اب بھی
ہیں لوگ کانچ کے اور حکمران پتھر کا

نشانِ راہ میں سودے بازی کے تحت رؤف خیر نے معلوماتی اور تاریخی نثر پیش نذرِ قارئین کیا ہے!!

پروین کمار اشک (پٹھان کوٹ، بھارت)

جناب گلزار جاوید صاحب، اسلام علیکم۔

چہارسو کا نقاش کاظمی نمبر مل گیا تھا خاصا پڑھ بھی لیا ہے۔ علیل ہوں زیر علاج ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرے خطوط آپ کو ملتے ہیں کہ نہیں۔ چہارسو میں کئی سلسلے ہیں جو زیادہ ہی دلچسپ ہیں۔ براہِ راست قطعی منفرد ہے۔ شخصیت کے متعلق ہر بات تنقیدی اور معلوماتی انداز میں سامنے آجاتی ہے۔ اس سلسلے میں کئی دفعہ قدرے تفصیل سے لکھنے کو دل چاہا لیکن بیماری کی شدت کی وجہ سے نہیں لکھ پاتا۔ ایک تنقید کی کتاب ''کھرے سکے'' آپ کی خدمت اقدس میں پیش کی تھی اس میں گلزار جاوید کے افسانوں پر اظہار خیال کیا تھا۔ رسید نہیں ملی۔ معلوم

نہیں آپ کی نظر سے گزری ہے یا نہیں۔

حسرت کاسگنجوی (حیدرآباد، سندھ)

مدیرِ محترم، سلام ورحمت۔

عید کی تعطیلات کے بعد دیگر رسائل کے ساتھ ''چہارسو'' بھی نظر نواز ہوا۔ قبل ازیں سافٹ کاپی سے بھی آگہی پائی۔ بہت شکریہ! ''اندازِ دلبری'' سے نقاش کاظمی صاحب کی شخصیت کے شعری پہلو وفکری محاسن بہت خوبصورتی سے اُجاگر ہوئے، قطرۂ شبنم سے اُن کی تخلیقات سے متعلق معاصرین کی خوش آئند وخوش فکر آراء کا علم ہوا، حسنِ انتخاب بھی خوب سے خوب تر ہیں! ''قرطاسِ اعزاز'' کا سارا دروبست، ترتیب وتزئین کمال سلیقگی وخوبی سے کی گئی ہے، جس سے حرف حرف جگمگاتا اور سطر سطر جھلملاتی محسوس ہوتی ہے، جملہ مضامین کا وصفِ خاص جامع اختصار کے ساتھ کاظمی صاحب کی شاعرانہ جہات، موضوعات اور رجحانات کا عمیق جائزہ مخلصانہ اسلوب سے کیا گیا ہے۔ سفرنامہ ''جاپان چلو'' میں مزاح کی تخلیق کے لئے جملہ عناصر کے تذکرے کے ساتھ امثال و اقتباسات نہایت عمدگی سے تجزیہ وتحسین کئے گئے ہیں اور یوں بھی شگفتہ تحریروں کے بغیر دنیائے ادب رُوکھی پھیکی لگنے لگتی ہے۔ گھر بدر۔ جزیرے پیار کے۔ کالے گورے لوگ۔ افعی جاں گداز بھی کہانیاں چھوٹے بڑے غموں خوشیوں سے گُندھی، معصوم خواہشوں سے سجی، محرومی و ناآسودگی سے لپٹی، زندگی کی راہداریوں سے شناسا کرتی ہیں۔ ڈرامہ ''آدھی گھر والی'' عہدرواں کے سماجی و معاشرتی روّیوں کا کامیاب اظہاریہ ہے اور وائنڈاپ دلچسپ انکشاف سے مملو اور کرداروں کے بے ساختہ تحیّر کے باعث بھرپور تاثر لئے ہوئے ہے۔۔۔۔ چہارسو کے کامیاب ''قرطاسِ اعزاز'' پر بہت سی مبارکباد۔

شگفتہ نازلی (لاہور)

گلزار جاوید صاحب، اسلام علیکم۔

مزاجِ گرامی بخیر! گزشتہ دنوں ''چہارسو'' کا نقاش کاظمی نمبر موصول ہوا دلی خوشی ہوئی کہ ہمارے عہد کے نامور شاعر وادیب اور ہمہ جہت شخصیت کے مالک جناب نقاش کاظمی سے موسوم خصوصی نمبر شائع کر کے ''چہارسو'' نے حق ادا کر دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ جناب نقاش کاظمی کی پوری زندگی محنت، دیانت اور ایمانداری سے عبارت ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپکو، نقاش صاحب کو تادیر شعروادب کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے (آمین)

ندیم ہاشمی (کراچی)

گلزار بھائی، آداب۔

چہارسو کا نقاش کاظمی نمبر دیکھ کر جی خوش ہوگیا۔ کیا خوبصورت وخوب سیرت شمارہ نکالا ہے آپ نے۔ یہ جان کر اور بھی خوشی ہوئی کہ احباب کو میرا افسانہ سب سے زیادہ پسند آیا۔ مگر میں اس لئے متفق نہیں کہ میری رائے میں مجھے سب سے پیچھے ہونا چاہیے۔ بہرحال میں کوشش کرتی رہوں گی کہ آپ اور قاری کی توقعات پر پوری اترتی رہوں۔ براہِ راست اس بار بھی دلچسپ لگا مگر آپ نے اس بار سوالات کم دریافت کئے۔ بہت سے سوالات تو براہِ راست حملے کے زمرے میں آتے ہیں۔ حمیدہ معین کا ''خوف اور اجنبیت کے درمیان'' دہلی آگرہ کا سفرنامہ بھی اپنی جگہ خوب ہے۔ حمیدہ معین رضوی نے بالکل درست کہا کہ انڈیا اور پاکستان کے لوگ ایک ہی ماں کے دو بچے ہیں لہٰذا اُن کی شکل اور عادات بلکہ سوچ میں بھی مماثلت ہونا فطری بات ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم کا زندگی نامہ ''ہوا کے دوش پر'' پہلی قسط بھی دلچسپ تھی اور دوسری قسط بھی مزیدار ہے۔ رہا آپ کا ڈرامہ تو میں اُس کی تعریف کے بجائے آپ کو مبارک باد دینا پسند کروں گی۔

رینو بہل (چنڈی گڑھ، بھارت)

محترم گلزار جاوید صاحب! تسلیمات

''چہارسو'' دستیاب ہوا۔ یہ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔ اتنا خوبصورت رسالہ ادب کے مختلف اصناف سے سجا ہوا جس کے پیچھے آپ کی محنتِ شاقہ نظر آتی ہے۔ نقاش کاظمی پر مشاہیر کے مضامین نے ان کا ایک خوبصورت تعارف کروایا۔ اگرچہ ہمارا کبھی ایک ہی محکمے سے تعلق تھا۔ میں چونکہ ۲۷ سال ملک سے باہر رہا اس لیے ان سے زیادہ واقفیت نہیں تھی لیکن ان کے نام آپ کے قرطاسِ اعزاز نے صورت حال یکسر بدل دی ہے۔ افسانوں کا انتخاب خوب ہے خصوصاً احمد زین الدین کا ''بھوگ'' اور عظمیٰ صدیقی کا ''یادوں کا ورثہ'' نے متاثر کیا۔ آپ اتفاق کریں گے کہ افسانے کے موضوعات میں اتنا تنوع ہے کہ شاید ادب کے کسی اور صنف میں ایسا نہیں۔ دنیا کے کسی بھی موضوع پر افسانہ لکھا جاسکتا ہے اور لکھا جارہا ہے۔ اس تنوع نے افسانے میں جاذبیت اور گہرائی پیدا کر دی ہے۔ آپ کے ڈرامے ''آدھی گھر والی'' کا ذکر نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ اس کا حسن اس کے سسپنس میں ہے۔ موجودہ معاشرے کے قبیح چہروں کو آپ نے کس خوبصورتی سے پینٹ کیا ہے۔

نجیب عمر (کراچی)

میرے محسن جناب گلزار جاوید صاحب، اسلام علیکم۔

ستمبر اکتوبر کا شمارہ بہت دن پہلے موصول ہوگیا تھا جسے قطرہ قطرہ، گھونٹ گھونٹ کے مصداق لطف لے کر پڑھ رہا ہوں۔ لیکن آپ کی مہربانیوں کا شکریہ ادا کرنے میں بقول منیر نیازی ہمیشہ دیر ہوجاتی ہے۔ اس دفعہ تو ایک اور افتاد آن پڑی:

ایک بیماری نئی لے کر بڑھاپا آگیا
جس سے چھٹکارا نہ شائد مل سکے گا اب کبھی

مرض بھی بدذوق ایسا ہے کہ ڈاکٹر نے کہا
سیرِ گلشن کو نہ جانا فصلِ گُل میں اب کبھی

احمد ظہور (اسلام آباد)

☆

۔ ماہنامہ سیپ ۔

ماہنامہ سیپ کراچی؛ جناب نسیم درّانی کی ادارت میں اپنی عمر کے چالیس سال مکمل کرنے کے قریب ہے۔ان چالیس سالوں میں جناب نسیم درّانی نے ''سیپ'' کے ذریعہ ادب اور ادیب کی بے پناہ اور بے لوث خدمت کے نہایت شاندار ریکارڈ قائم کئے ہیں۔گذشتہ کچھ عرصہ سے جناب نسیم درّانی علالت کے باعث اپنے دور کے نہایت اہم جریدے ''سیپ'' کی اشاعت کو باقاعدگی کے ساتھ برقرار نہ رکھ سکے مگر ''سیپ'' کی اشاعت کا سلسلہ وقفہ وقفہ سے ہنوز جاری ہے اور آئندہ کے لئے بھی بہتر توقعات قائم کی جاسکتی ہیں۔''سیپ'' کا تازہ شمارہ اشاعت کے اعتبار سے اٹھترواں شمارہ ہے جس میں اپنے دور کے بلند قامت اہل قلم کے ایک درجن سے زائد افسانے' تین درجن سے زائد نمائندہ اور معتبر شعراء کا کلامِ انتخاب کے علاوہ اور بھی بہت کچھ قاری کی دلچسپی کا سامان دستیاب ہے۔قریب تین صد صفحات کے اس خاص شمارے کی قیمت 120 روپے اور دستیابی کا پتہ 18/8' فیڈرل بی ایریا' کراچی۔75950 ہے۔

○

۔ سہہ ماہی تجدیدِ نو ۔

جس معاشرے میں اپنے نوجوانوں اور ذمہ دار افراد کے لئے مصروفیت و روزگار کے مناسب مواقع دستیاب نہ ہوں اُس معاشرے میں اگر ماں بیٹی خواتین دو دہائیوں سے زیادہ عرصہ تک باقاعدگی کے ساتھ ادبی جریدہ جاری رکھیں تو یہ امر کسی طرح بھی معجزہ سے کم نہیں۔ سہہ ماہی ''تجدیدِ نو'' گذشتہ اکیس برس سے باقاعدگی سے جاری وساری ہے اور ادب کی آبیاری میں اُسی طرح سرگرم اور بارآور ہے جس طرح دیگر نامور اور اعتبار کے حامل جرائد سرگرم اور فعّال ہیں۔''تجدیدِ نو'' کا تازہ شمارہ قریب تین صد صفحات پر محیط ہے جس میں ادب کے تمام مستند و معتبر حلقوں کی نمائندگی اور سبھی اصنافِ ادب کو سلیقے' قرینے سے پیش کیا گیا ہے۔''تجدیدِ نو'' صرف ایک سو پچاس روپے کے عوض F-695' جوہر ٹاؤن' لاہور سے دستیاب ہے۔

○

۔ سہ ماہی زرنگار ۔

جہاں بجتی ہیں شہنایاں وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

مذکورہ بالا فلمی مصرعہ ہمیں موجودہ ادبی صورت حال کے حوالے سے یاد آرہا ہے۔جس تیزی سے قدیم روایات کے حامل جرائد اپنے انجام کو پہنچ رہے ہیں اُسی برق رفتاری سے نئے جرائد کا اجراء بھی ہو رہا ہے۔علامہ ضیا حسین ضیا خوش فکر' بلند نگاہ اور صاحبِ علم تخلیق کار ہیں۔علامہ صاحب ادب کی تمام اصناف پر قدرت و دسترس رکھنے کے ساتھ ترتیب و تدوین میں خاص طرح کا ملکہ اور حسنِ ذوق کے مالک ایسے مدیر ہیں جو نہ صرف اپنے قاری کے ذوقِ مطالعہ کو بامِ عروج پر پہنچانے کے لیے ہر دم سرگرم رہا کرتے ہیں ساتھ ہی ساتھ علامہ صاحب کو اپنے قاری کے ذوقِ نظر کا بھی بہت خیال رکھا کرتے ہیں۔''زرنگار'' کا ایک ایک صفحہ بلکہ ایک ایک سطر ہماری رائے کو تقویت بخشنے کے ساتھ چیخ چیخ کر گواہی دے رہی ہے۔ ہے کوئی بازار مصر میں یوسف کا خریدار

''زرنگار'' کا تازہ شمارہ چار سو سولہ صفحات اور دیدہ زیب سرِ ورق کے ہمراہ فقط دو صد پچاس روپے کے عوض P-148/149' عمران روڈ' خیابان کالونی' فیصل آباد پر دستیاب ہے۔

○

شہریار نے احساس کا ایجاز و اختصار اپنایا ہے۔ وہ بظاہر چھوٹے مگر انتہائی مرکزی اور شدید تاثر پر پوری توجہ صرف کرتے ہیں۔ شہریار کا آرٹ اشاریت کا آرٹ ہے جسے وہ الفاظ کے ذریعہ ادا نہیں کرتے بلکہ ان کی طرف صرف بلیغ اشارے کرتے ہیں۔ زیر نظر کتاب "شہریار" کو پروفیسر سرور الہدیٰ نے بڑی جاں فشانی اور جگر داری کے بعد مرتب کیا ہے۔ جس میں ہمارے عصر کے نہایت معتبر و ممتاز شاعر شہریار کے فن و شخصیت کی مناسبت سے لکھے گئے تمام مقالے اور مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ اسی طرح سرور الہدیٰ صاحب نے موجودہ زمانے کے ساتھ آنے والے وقتوں کی ضرورت کا سامان بھی مہیا کر دیا ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن (دہلی بھارت)

دستیابی: قریب نو صد صفحات کی مجلد با تصویر کتاب مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔ انجمن ترقی اردو دہلی، مکتبہ جامعہ علی گڑھ، بک امپوریم پٹنہ بھارت سے چھ صد ہندوستانی روپے کے عوض دستیاب ہے۔

امریکہ کے شہر نیویارک سے متصل قصبے (منرو) میں مقیم نامور پاکستانی سائنسدان، ادیب، شاعر اور مفکر جناب صفوت علی صفوت ستاروں پر کمند ڈالنے اور کہکشاؤں کو تسخیر کرنے کے جذبات کے حامل ایسے تخلیق کار ہیں جو انسان اور کائنات کو ہر زاویے سے جانچ پرکھ کر اپنی تحقیقات کا خمیر تیار کرتے اور انھیں کی روشنی میں انسانی مسائل کا حل دریافت کرتے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے صفوت علی صفوت کی ذات و فن سے منسوب مشاہیر فن کے مقالات، تنقید، تبصرے، تذکرے اور عالمانہ گفتگو کو ایک جلد میں منتقل کر کے صفوت علی صفوت سے مکمل اور بھرپور تعارف کا وسیلہ مہیا کر دیا ہے۔

پروفیسر مامون ایمن (نیویارک)

دستیابی: ایک سو چوراسی صفحات کی مجلد یہ ضخیم کتاب مبلغ دو صد پچاس روپے میں ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، گولا مارکیٹ دریا گنج دہلی، ماہنامہ چہار سو، ٹرسٹ پلازہ راولپنڈی اور 14, WOODS ROW MONROE C.T. 06468. U.S.A پر دستیاب ہے۔

"نامہ بر" میں شامل افسانوں کو پڑھنے کے بعد یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکٹر سید سعید نقوی نے مختلف علوم کی کتابیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ مختلف النوع مذاہب، رنگ، ذات، نسل اور جدا جدا کردار کے حامل انسانوں کا بھی بہ غور مطالعہ کیا ہے۔ کیونکہ ان کے اکثر افسانوں میں زندگی کے نشیب و فراز، قول و فعل میں تضاد، چہرے پر چہرے کا بہروپ، غربت و امارت کا فرق اور ہر آن بدلتے ہوئے چہروں کے تاثرات کے مشاہدات اور قدم قدم پر آنے والے تلخ و شیریں تجربات بیان ہوئے ہیں۔ ایک اچھا، سنجیدہ اور سچا فن کار وہی ہوتا ہے جو اپنے فن سے محبت کرتا ہو اور تخلیقی عمل کو ایک فریضہ جان کر ادا کرتا ہو۔ ڈاکٹر سید سعید نقوی بھی ایک ایسے ہی سچے، مخلص اور سنجیدہ افسانہ نگار ہیں۔ جو انسان کے ہر روپ کو اپنی نظر کے مختلف زاویوں سے دیکھتے ہیں اور کسی مصور کی طرح قرطاس پر الفاظ کے برش اور محسوسات کے رنگوں سے پینٹ کر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر اختر ہاشمی (کراچی)

دستیابی: ایک سو اٹھائیس صفحات مجلد "نامہ بر" تین سو روپے، بیرون ملک دس ڈالر یا پانچ پونڈ ویلکم بک پورٹ مین اردو بازار کراچی۔